

اسلام میں عدل و اجتماع

سیّد قطب



LIBRARY
JAMIA HAMDARD



U43467

مترجم: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

مرکزی مکتبہ اسلامی - دہلی

مطبوعات اشاعت اسلام ٹرسٹ۔ ۲۸

اسلام میں عدل اجتماعی

مصنف

سید قطب شہید

مترجمہ

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔۵

© اشاعت اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) دہلی۔

بارِ اول _____ اگست ۱۹۷۲ء ۲۰۰۰

بارِ دوم (آفٹ) اپریل ۱۹۸۱ء ۲۰۰۰

43467

43 467

۲۳/- قیمت



30. 18. 30

29. 1977
9151

مطبوعہ

شیروانی آفٹ پرنٹرز، دہلی

فہرست مضامین

۷	عرض ناشر
۹	مقدمہ طبع ثانی
۳۵	تعارف طبع اول
۴۳	باب اول۔ مذہب اور سماج
۴۵	اسلامی اور مسیحی نقطہ نظر کا موازنہ
۶۷	باب دوم۔ اسلام میں عدل اجتماعی کا مزاج
۸۷	باب سوم۔ اسلام میں اجتماعی عدل کی بنیادیں
۹۱	آزادی ضمیر
۱۱۷	انسانی مساوات
۱۳۴	اجتماعی کفالت باہمی
۱۵۹	باب چہارم۔ اسلام میں عدل اجتماعی کے قیام کے ذرائع
۱۹۳	باب پنجم۔ اسلام میں نظام حکومت
۲۰۳	۱۔ حکام کی جانب سے عدل
۲۰۵	۲۔ محکوم کی طرف سے اطاعت
۲۰۷	۳۔ حکام اور محکومین کے مابین مشاورت

۲۱۵	باب ششم۔ اسلام کی اقتصادی پالیسی
۲۱۹	انفرادی ملکیت
۲۱۹	انفرادی ملکیت کا حق
۲۲۵	انفرادی ملکیت کا مزاج
۲۳۲	ذاتی ملکیت کے ذرائع
۲۳۳	اشتکار
۲۳۴	۲۔ جن افتادہ زمینوں کا کوئی مالک نہ ہو ان کو کسی طریقہ سے کار آمد بنالینا
۲۳۵	۳۔ زمین کے اندر جو کانیں درکار ہیں اُن کو نکالنا
۲۳۵	۴۔ خام مواد سے مصنوعات کی تیاری
۲۳۵	۵۔ تجارت
۲۳۵	۶۔ اجرت کے عوض کسی دوسرے کے لئے محنت کرنا۔
۲۳۸	۷۔ جنگ
۲۳۹	۸۔ لاوارث زمینوں میں سے سلطان کی طرف سے عطیہ
۲۳۹	۹۔ بقائے حیات کی خاطر مال کا محتاج ہونا
۲۴۰	۱۰۔ محنت کی مختلف نئی صورتیں
۲۴۳	ملکیت کو نمو بخشنے کے طریقے
۲۴۴	۱۔ اسلام کا رو بار میں بددیانتی کو حرام قرار دیتا ہے
۲۴۶	۲۔ اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی خلاف اسلام ہے
۲۴۷	۳۔ سودی کاروبار ناجائز ہے
۲۵۸	صرف کی ساجیں
۲۷۲	فرضہ زکوٰۃ
۲۷۶	فقراء

۲۷۶	مساکین
۲۷۶	عاطمین زکوٰۃ
۲۷۷	مؤلفۃ القلوب
۲۷۷	گردن چھڑانے میں
۲۷۷	قرض دار
۲۷۷	فی سبیل اللہ
۲۷۷	مسافر
۲۸۱	زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے محاصل
۲۸۲	مصالح مرسلہ
۲۸۶	ذرائع
۲۹۵	باب ہفتم۔ تاریخ اسلام سے چند مثالیں
۳۰۴	بیداری ضمیر کے نمونے
۳۱۷	مساوات کے نمونے
۳۲۲	آزادی ضمیر
۳۳۱	مفتوحہ ممالک کے ساتھ برتاؤ
۳۳۸	باہمی کفالت اور تعاون
۳۴۳	سیاسی نظام
۳۴۸	طریق حکمرانی کے نمونے
۳۵۴	حضرت عثمانؓ کا طرز حکمرانی
۳۵۹	حضرت عثمانؓ کے بعد
۳۶۴	حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ
۳۷۰	بادشاہت
۳۷۱	مالی نظام

۳۸۹	چند بنیادی اصول
۳۹۶	باب ششم۔ اسلام کا حال اور مستقبل
۴۰۵	اسلام اور مغرب
۴۱۱	عالم اسلام کی نشاۃ ثانیہ
۴۲۱	اسلامی فکر کا احیاء
۴۲۵	اسلامی ادب
۴۳۹	تاریخ
۴۴۱	اسلامی تاریخ کی تدوین جدید
۴۴۸	باب ہفتم دورِ اسے پر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

”الاخوان المسلمون“ کے مشہور رہنما اور بلند پایہ مصنف اُستاذ سید قطب شہید کی مشہور عالم تصنیف ”العدالة الاجتماعية في الاسلام“ نے یورپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ کے علمی حلقوں میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کے عربی اور انگریزی زبانوں میں متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور اُس نے ہر گوشہ سے زبردست خراج تحسین حاصل کیا۔ اُس کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا سہرا جناب ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب (شعبہ معاشیات) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے سر ہے۔ آپ نے ترجمہ اس خوبی اور عمدگی سے کیا ہے کہ اصل اور ترجمہ میں فرق کرنا دشوار ہے۔

ہم نے اس کا پہلا ایڈیشن ”اسلام کا نظام عدل“ کے نام سے پیش کیا تھا، اب ہم اُس کا تازہ ایڈیشن ”اسلام میں عدل اجتماعی“ کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔

ضروری نہیں کہ مصنف محترم کے خیالات سے کلی اتفاق کیا جائے تاہم ہمارے خیال ضرور ہے کہ یہ حقیقت مجموعی یہ کتاب اسلامی لٹریچر میں ایک گراں قدر اور مفید اضافہ ثابت ہوئی ہے۔ اور اسلامی نظام معیشت پر محققین کے لیے قیمتی مواد فراہم کرے گی۔

مینجر

مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۲

مئی ۱۹۷۲ء

مقدمہ طبع ثانی

آج سے چند سال پہلے جب یہ کتاب اردو میں پیش کی گئی تھی تو اس کا مصنف زندہ تھا۔ اگست ۱۹۶۶ء میں اسے اس کے پروردگار نے اپنے پاس بلالیا۔ اس عرصے میں تحریک اسلامی کا ایک پورا دور گزر گیا، وہ دور جس کا امتیازی نشان سید قطبؒ اور ان کے قریبی رفقاء کی شہادت ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ العدالة الاجتماعية فی الاسلام کے اردو ترجمہ کے طبع ثانی کے ساتھ تحریک اسلامی کی تاریخ کے اس باب کا اضافہ کر کے ان یادوں کو محفوظ کر لیا جائے جو آئندہ عرصہ دراز تک تحریک اسلامی اور مسلمانوں کے لیے اہمیت کی حامل رہیں گی۔ ساتھ ہی ہم نے بعض اُن اعتراضات کے سلسلہ میں بھی چند اصولی باتیں پیش کی ہیں جو ترجمہ کے طبع اول کے بعد کتاب کے بعض حصوں پر کیے گئے ہیں۔

شہادت اور اس کا پس منظر

دوشنبہ ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو صبح سویرے مصری حکومت نے سید قطب اور ان کے دو رفقاء محمد یوسف ہواش اور عبدالفتاح اسماعیل کو تختہ دار پر چڑھا دیا۔ ۱۲ سالہ قید و انانیت کے بعد ان کو زندہ رہنے دیا گیا۔

سید قطب کو ۱۹۵۳ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ قید میں ڈالتے ہی ان کو اذیت ناک سزائیں دی جانے لگیں جن کے نتیجے میں ان کی صحت گرتی چلی گئی اور ۳ مئی ۱۹۵۵ء کو انہیں فوجی اسپتال میں منتقل کرنا پڑا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۵۵ء کو جب ان کے مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا تو سید قطب کو علالت اور معذوری کے سبب پندرہ سال قید سخت کی سزا سننے کے لیے

عدالت میں حاضر کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ دس سال تک جیل میں تکلیفیں سہنے کے بعد اپریل ۱۹۶۲ء میں انہیں رہائی نصیب ہوئی۔ سابق صدر جمہوریہ عراق، عبدالسلام عارف مرحوم نے سید قطب کی علمی اور دینی تصانیف سے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے بار بار صدر ناصر سے ان کی رہائی کی سفارش کی۔ اس وقت مصر و عراق کے باہمی تعلقات ایسے تھے کہ صدر ناصر نے بالآخر یہ سفارش سن لی اور سید قطب کو رہا کر دیا۔ بعد میں تعلقات ایسے درست ہوئے اور سید قطب کو سزائے موت ملنے کے بعد جب عراق کے موجودہ صدر عبدالرحمان عارف نے اس سزا میں تخفیف کی سفارش کی تو اسے نہیں قبول کیا گیا۔

رہائی کے بعد سید قطب اپنے مکان پر رہنے لگے جو قاهرہ کے مسافرات میں حلوآن میں ہے۔ پولیس ان پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور آنے والوں کے بارے میں چھان بین کرتی رہتا تھا جس کے سبب بہت کم لوگ ملاقات کی ہمت کر سکتے تھے۔ سوڈان کے ایک اسلامی کارکن کا بیان ہے کہ اسی دوران ایک ملاقات میں سید قطب نے سوڈان کی تحریک اسلامی کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ موجودہ جمہوری دور میں بھی اس بات سے غافل نہ رہنا چاہیے کہ عوام آمریت، بالخصوص فوجی آمریت، کی مفرتوں سے پوری طرح باخبر رہیں تاکہ وہ کبھی بھی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ سید قطب کی رائے میں فوجی آمریت کا خطرہ دو مختلف راہوں

۱۔ موامرة ضد الاسلام فی مصر، ص ۹۶، ۱۱۲ صفحات کا یہ کتابچہ اخوان المسلمون نے شائع کیا ہے۔ مگر اس پر ناشر اور مطبع کا نام یا سن طبع درج نہیں ہے جس کی وجہ ظاہر ہے۔

۲۔ الشہید سید قطب، ص ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶ صفحات کی یہ کتاب جس کی قیمت ۵ لیرا درج ہے لبنان میں شائع ہوئی ہے۔ ناشر جماعتہ اصدقاء سید قطب، ہیں۔ کتاب متعدد مقالات پر مشتمل ہے جو مختلف اصحاب علم و فضل نے سید قطب کی شہادت کی خبر سن کر لکھی ہیں۔

مذکورہ بالا انکشافات عراق کی اخوان المسلمون نے اپنے اس بیان میں کیا ہے جو ۲۱ اگست ۱۹۶۶ء کو سید قطب کی شہادت کے بعد جاری کیا تھا۔ یہ بیان خرطوم سے شائع ہونے والے روزنامہ "المیشاق" میں ۲۱ ستمبر ۱۹۶۶ء کو شائع ہوا ہے۔

سے پیش آ سکتا ہے۔ اشتراکیت جو جمہوری طریقوں سے کبھی اقتدار نہیں حاصل کر سکتی، یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے گی، اور امریکہ اس بات کی کوشش کرے گا کہ قبل اس کے کہ اشتراکیوں کو کامیابی حاصل ہو ایک ایسا فوجی انقلاب آجائے جو اشتراکیت کو کچل سکے اور امریکہ کا حامی ہو۔ سید قطب نے اس کا بہن کو یہ مشورہ بھی دیا کہ سب سے زیادہ توجہ اسلامی جمہورتوں کے داخلی نظم و اسخ کا اور کارکنوں کو راہ حق کی آزمائشوں سے صبر کے ساتھ گزرنے کی تربیت دینے پر ہونی چاہیے۔ سید عارفی رہائی کے دنوں میں ان سے ملاقات کرنے والوں میں پیس کے استاذ محمود الرکابی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے بھی یہی لکھا ہے کہ پولیس ملاقات کرنے والوں پر کڑی نگرانی رکھنی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ سید قطب کو آنے والی شہادت ساف نظر آ رہی تھی۔

رہائی کے مختصر دور میں سید قطب کے انکار و آرام پر شاید مستقبل میں مزید روشنی ڈالی جاسکے۔ اگست ۱۹۶۵ء میں انھیں دوبارہ قتل کر دیا گیا۔ مہاجر کی بصیرت نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ دوبارہ گرفتاری حکومت کی جانب سے کسی تباہ اقدام کی تجدید ہے۔ چنانچہ اس گرفتاری کے موقع پر انھوں نے فرمایا تھا:-

” میں جاننا ہوں کہ اس بار حکومت میرا سہ چاہتی ہے۔ مجھے کوئی ندامت نہیں، نہ اپنی موت پر افسوس۔ یہی سعادت ہے کہ مجھے اپنی دعوت کی راہ میں موت نصیب ہونے والی ہے۔ اس بات کا فیصلہ مستقبل کا مؤثر کریگا کہ راہ راست پر کون تھا، اخوان یا حکومت وقت۔“

سید قطب کے ساتھ اخوان کے بھائی اردب - ایک بیان کے مطابق چالیس بھائی

۱۔ الشہید سید قطب، ص ۹۲۔ بحوالہ روزنامہ المیناق - حرطوم - ۱۹ ستمبر ۱۹۶۶ء

۲۔ ایضاً ص ۶۵

۳۔ خلیل حامدی، معراور اخوان - رسالہ ترجمان القرآن - لاہور - ستمبر ۱۹۶۶ء ص ۵۶۔

۴۔ حوالہ المسلمون کا بیان ہے۔ لندن ٹیلیگراف نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو یہ خبر شائع کی تھی مگر اس وقت تک میں ہر افراد گرفتار کیے جا چکے ہیں اور پورے ملک میں پکڑ دھکڑ جاری ہے۔ ملاحظہ ہو خلیل حامدی معراور اخوان - ص ۷۲۔

افراد کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان پر حکومت وقت سے بغاوت، عوام کو بغاوت پر ابھارنے، صدر نامہ کو قتل کرنے کی سازش اور تنخواہی اور دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے الزامات عائد کئے گئے۔ منتخب اذاد کے مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک خصوصی عدالت تشکیل دی گئی جس کے ارکان کا تقرر صدر جمہوریہ مصر نے کیا۔ یہ عدالت بجز اس کے کسی اور ضابطہ کی پابندی نہ تھی کہ اس کے فیصلوں کے نفاذ کے لیے صدر جمہوریہ مصر کی توثیق ضروری قرار دی گئی تھی۔ اپنی تشکیل اور ضابطہ کار دونوں کے اعتبار سے یہ ایک فوجی عدالت تھی۔

اس عدالت کے سامنے بھی سید قطب اور ان کے رفقاء کو اپنے دفاع میں بحث کے لیے وکیل مقرر کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ عدالت کی کارروائی کے دوران جب کبھی بھی ملزم اپنے خود اپنے دفاع میں کچھ کہنا چاہتا تو بالعموم سے ایسا نہیں کرنے دیا گیا۔ دفاع کے وکیلوں کا تقرر خود حکومت نے کیا اور ان وکیلوں نے بلا استثناء اسی شخص کو مجرم گردانا جس کے ذمے اس کی خدمات پیش کی گئی تھیں۔ عرب ممالک کے وکلاء کی ایک کانفرنس نے کچھ صد پہلے یہ ریزولوشن پاس کیا تھا کہ کسی عرب ملک کے سیاسی قیدیوں کے قانونی دفاع کا حق ہر عرب ملک کے وکلاء کو ملنا چاہیے۔ حکومت مصر نے بھی اس ریزولوشن کو منظور کر لیا تھا لیکن اس موقع پر جب مختلف عرب ممالک کے وکلاء نے اخوان کے زیر مقدمہ اذاد کے دفاع کی اجازت چاہی تو انکار کر دیا گیا۔ بلکہ سوڈان اور اردن کو دغیرہ سے جے وکیل قابو ہونے پر انہیں فوراً واپس چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ دانش رہے کہ مصری قانون کی رو سے سوڈان کے وکیلوں کو مصری عدالتوں میں خدمات کی پیروی کا عام حق حاصل ہے۔

سیاسی قیدیوں کے حقوق کی محافظت کرنے والے بین الاقوامی ادارہ — "انٹرنیشنل ایسٹبلشمنٹ" نے جب حکومت مصر سے درخواست کی کہ اس کے ایک نمائندہ کو مقدمہ میں شرکت کی اجازت دی جائے تو اس درخواست کو رد کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس ادارہ نے یہ چاہا

۱۔ مادہ اعدم سید قطب و اخوانہ - ص ۱۰، اور ص ۲۲-۲۳ صفحات کا یہ کتابچہ "الشباب المسلم" کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ مطبعہ دغیرہ کانامہ درج نہیں ہے۔

کہ اس کے ایک رکن کو صرف مشاہد کی حیثیت سے مکہ عدالت میں بیٹھنے کا موقع مل جائے مگر اس کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ ۲۵ اپریل ۱۹۶۶ء کو اس ادارہ نے پریس میں ایک بیان جاری کیا جس میں ان حقائق کے بیان کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ حکومت مصر نے پریس اور پبلک کو مکہ عدالت میں جانے سے روک دیا ہے اور عدالت کی کارروائی پر سنسر بٹھا دیا ہے۔ اسی بیان میں بتایا گیا ہے کہ زیر مقدمہ افراد نے عدالت سے بار بار کہا کہ ان کو اذیت ناک سزائیں دے کر ان سے اعتراف جرم کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سید قطب نے بھی یہی شکایت کی، مگر عدالت نے اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھانے سے انکار کر دیا۔

سید قطب کے ساتھ ان کے پورے خاندان پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ ان کے واحد حقیقی بھائی محمد قطب کو جیل میں اتنی اذیت دی گئی کہ ان کے انتقال کی افواہ مشہور ہو گئی۔ جن لوگوں نے انہیں دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ ان کا جسم زخموں سے داغ داغ تھا۔ یہ اواخر ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے۔ ان کی دو حقیقی بہنوں حمیدہ اور امینہ کو بھی جیل میں ڈال دیا گیا اور سخت اذیتیں دی گئیں۔ حمیدہ کو دس سال قید سخت کی سزا ملی ہے اور امینہ بھی نظر بند ہے۔ سید قطب کے بھائی ۲۵ سالہ رفعت بکرا شافعی کو، جسے انجینیئرنگ کالج سے فارغ ہوئے بمشکل دو سال گزرے تھے گرفتار کر کے سخت ترین سزائیں دی گئیں۔ تاکہ وہ اپنے ماموں کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ جوان بھی آخر ۱۹۶۵ء میں جیل ہی میں انتقال کر گیا۔

۱۔ لماذا اعدم سید قطب و اخوانہ۔ صفحات ۳۰ تا ۳۲۔

۲۔ تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ یہ خبر غلط ہے اور محمد قطب جیل میں ہیں اور زندہ ہیں۔ خدا کرے یہی تازہ اطلاع صحیح ہو۔ یہ خبر ڈاکٹر سعید رمضان کے حوالہ سے 'الندوہ'، مکہ مکرمہ ۱۶ مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ (بحوالہ ہفت روزہ آئین الہور۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۸ء)۔

۳۔ سید قطب کے خاندان پر ان مظالم کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: الشہید سید قطب صفحہ ۲۵ اور صفحہ ۱۳۱ حقائق حسن الحكم والحقا کلمات فی مصر، ص ۲۰۔ (۱۱۲ صفحات کا یہ کتابچہ بھی مطبع اور ناشر کے ذکر کے بغیر شائع ہوا ہے) اور مصر اور اخوان، ص ۷۳۔

اس کوشش میں طاقت کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے۔۔۔۔۔۔ اس الزام کو اور اس کے ثبوت کو خود عدالت سے سُنئے پہلے

صدر عدالت: ”سید قطب! تم نے موجودہ نظام حکومت کے بارے میں کچھ رائیں ظاہر کی ہیں۔ تم نے کہا ہے کہ موجودہ نظام حکومت جاہلی نظام حکومت ہے۔“
سید قطب: ”جاہلی کے معنی یہ ہیں کہ۔۔۔۔۔۔“

عدالت کے صدر نے سید قطب کو جملہ بھی پور نہیں کرنے دیا بلکہ ان کی بات کاٹ کر کہا: ”تنظیم کے ارکان کا بیان نہ کرنے انہیں یہ سمجھایا ہے کہ وہ ایک جاہلی معاشرہ میں رہنے والی مومن اُمت ہیں۔۔۔۔۔۔ ان کے اندر ریاست، سماج اور موجودہ نظام حکومت کے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ ریاست کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں۔۔۔۔۔۔ قتل و غارت اور تخریبی کارروائیوں میں کوئی حرج نہیں، نہ اس پر گناہ ہوگا بلکہ اس کے برعکس ثواب ملے گا۔۔۔۔۔۔“

سید قطب: ”میں جواب دوں؟“

صدر عدالت نے سید قطب کو جواب کا موقع دینے کے بجائے خود تقریر شروع کر دی جس میں اُن پر سلبِ بناوٹ کا الزام عائد کیا۔ سید قطب بولے کہ میں نے ایسی کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ مگر عدالت نے کچھ نہ سُننا اور اُن پر الزامات کے ساتھ گالیوں کا اضافہ کر دیا۔۔۔۔۔۔ جب صدر عدالت نے یہ کہا کہ:

”سید قطب کی بہن حمیدہ قطب نے اعتراف کیا ہے کہ تنظیم کا مقصد موجودہ نظام حکومت کو ختم کرنا ہے۔“

تو سید قطب نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر عدالت نے اس کا موقع نہ دیا اور اُن کے مقدمہ کی سماعت ختم کر کے محمد یوسف مہاش کا نام پکارا۔ سید قطب نے اس کے باوجود یہ کہا کہ ”ایک

منہ کا موقع دیا جاسے۔ مگر عدالت نے انہیں بولنے کا موقع نہ دیا۔

عدالت کی تشکیل اور اس کی کارروائی کے بارے میں مذکورہ بالا تفصیلات ہم نے اس لیے پیش کی ہیں کہ کسی منصف مزاج انسان کو اس بارے میں شبہ نہ رہ جسے کہ سید قطب کو انصاف سے محروم کر کے ظلماً قتل کیا گیا ہے۔ عدالت اور اس کی کارروائی محض ایک ڈھنگ تھی۔ عدالت کا جواب دینے کے اس ابتدائی اصول کو بھی پامال کر دیا گیا کہ ملزم کو اپنے اوپر عاید کیے جانے والے الزامات کا جواب دینے صفاً پیش کرنے اور اپنے دفاع میں ماہرین قانون کی مدد حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ عدالت پر بیٹھنے والوں نے مقدمہ کے دونوں فریقوں، حکومت اور سید قطب کے بیانات سن کر دلائل اور گواہیوں کی روشنی میں کسی نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کے بجائے پہلے سے طے شدہ نتیجہ کے حق میں تقریریں کیں درملزم کی زبان بندی کر کے اسے جوبی ظلمات کہنے سے بھی محروم کر دیا اور اس کارروائی کے بعد سید قطب کو وہ سخت ترین سزا دی گئی جو کسی انسان کو دی جاسکتی ہے۔

دس برس جیل میں رکھ کر رہا کرنے، بعد دو بارہ گرفتار کر کے پھانسی پڑھا دینے میرے ایک

کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس درمیانی عرصہ میں سید قطب سے وہ کون سا نیا جرم سرزد ہو گیا تھا جس کی بنا پر یہ اقدام کیا گیا؟ عدالت نے یہ باوجود کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ نیا جرم "معالم فی الطريق" میں مصری عوام کو حکومت وقت سے بغاوت کی تلقین کی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جو وہ اصولی طور پر پہلے نہ سیکے ہوں۔ جو رائیں پیش کی ہیں وہ بھی ایسی نہیں جو اس زمانہ میں یا ماضی میں دوسرے اسلامی مفکرین نے نہ ظاہر کی ہوں۔ جیسا کہ مصنف نے خود صراحت کر دی ہے۔ کتاب کے تیسرے ابواب میں سے چار ان کی تفسیر قرآن "فی ظلال القرآن" سے ماخوذ ہیں۔ یہ تفسیر ان کی ربائی سے کئی برس پہلے مکمل ہو کر بارہا شائع ہو چکی تھی۔ کتاب کا وہ باب جس میں جہاد کے اسلامی نظریہ پر بحث کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام طاقت کا استعمال کب اور کن مقاصد کے لیے کرتا ہے۔ اس تفسیر سے لیا گیا ہے۔

اس کتاب میں سید قطب نے یہ بتایا ہے کہ دنیا میں رائج طرز زندگی، ہدایت الہی سے انحراف اور انسانوں کے خود ساختہ نظاموں پر مبنی ہونے کی وجہ سے "جہاد" طرز زندگی ہے۔ آج اللہ کا نام لینے والے بھی، اللہ ہی کو حاکم تسلیم کر کے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم قرآن کریم اور

تعلیمات نبویؐ کے مطابق کرنے کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو کمربن بنائے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بانیہیت ہے جسے مٹانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشہیف لائے تھے۔ اس معاشرہ میں جو نا اچھی اسلامی زندگی گزارنے اور اللہ کی زمین پر اللہ کا دین قائم کرنے کے خواباں ہوں ان کو چاہیے کہ وہ موجودہ دوزخ زندگی کی جگہ اسلامی زندگی کی تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ یہ کوشش ہی ایتھ سے لے جاتی ہے جو ناقہ منہ علی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا یعنی انسانوں کو اللہ واحد کی بندگی اختیار کرنے اور غیر اللہ کی بندگی سے بچنے کی دعوت دینی یا بیٹے۔ اسلامی افکار و عقائد کو اپنا کر اپنی انفرادی سیرت و کردار کو اس کے مطابق بدلنے اور جماعتی زندگی کو ان قدروں، اداروں اور قوانین کی بنیادوں پر ازاد و منظم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جو قرآن و سنت نے ہمیں سطا کئے ہیں۔ نظام حکومت اور معیشت کو برائیت الہی کے مطابق ڈھالے بغیر زندگی کی ساری اصلاحات و تعمیر ممکن نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سوہمیں یہ بتانا ہے کہ جب یک مسلم مدشاہ بسا کمسنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ تمام انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرنے، ان کا حق خود ارادیت بحال کر کے ان کے سامنے حق کی دعوت پیش کرنے، اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت قائم کرنے کا دشن لے کر اٹھتا ہے۔ یہی اسلامی جہاد ہے۔ اسلام میں جہاد کا اصل مقصد ان مادی قوتوں کو راہ سے ہٹا دینا ہے جو اللہ کا خدا اور قبول حق کے درمیان حارث ہوں اور اللہ کی زمین پر خیر اند کی بندگی کا نظام قائم کرتی ہوں۔

بلاشبہ اس کتاب میں پتہ مسلموں کو اس بات پر بنارکھا ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کی اور ان کے وقت نظام کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن اس کوشش کا طریقہ بھی تجویز کیا گیا ہے، جمہوری اور چہرہ من طریقہ سے تبلیغ افکار اور اشاعت دعوت۔ پھر سیرت کی تعمیر اور اس کے بعد تہذیبی نظام۔ انھوں نے کسی شخصیت کو ایک کی دعوت نہیں دی ہے۔ تجویزی کارروائیوں، رٹوڑ پھوڑ پر نہیں اُبھارا ہے۔ نہ یہ نظر یہ پیش کیا ہے کہ نہ ان کو کسی اقتدار سے ہٹا کر جابلی نظام کی جگہ اسلامی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔ ان کے نزدیک اسلامی نظام کے یہ تعلیم و تہذیبیت کے ذریعہ ایک نئی نسل انسانی جو فکر و عقیدہ و سیرت و کردار کے لحاظ سے صحیح معنی میں مسلمان ہو اور اپنی اجتماعی زندگی کو اللہ اور اللہ کی مرضی کے مطابق منظم

نے کا فیصلہ کر چکی ہو۔

ایک سوال

اگر معافی نہ ملے تو جب تک سید قطب نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا تو پھر وہ کون سا جرم تھا جس کی سزائیں ان کی جان لی گئی؟ دس برس ہیں تیار رہنے اور ایک سال پولیس کی نگرانی میں رہنے اور پھر جیل کی حالت میں سید قطب کے یہ کتنی تعلیم کی قیادت یا خود حکومت کے خلاف سی جی آر۔ فاروہ کی یہ جتنی سزا کسی طرح نہیں دیں تھی۔ ان کا بارہ سو سال تھوڑے ٹرکوں کی دس سو تو وہ نہ صرف تعزیرات کا کام تھی۔ مگر وہ ساری سزا یہاں جو اس سزا میں لکھی تھی۔ سزا کی حکومت نے سزا سے سزا کر رہی تھی۔ خود معافی ملتی تھی۔ سزا سے سزا نہیں ہوسکتی۔ کیا وجہ ہے کہ حکومت نے ایک ایسے جیسے خدوہ مدین کو قتل کر دیا جس کی درجنوں قتل نیٹ متعدد تھیں۔ اس میں سزا جو کر رہی دیا یہاں پھیل چکی ہے جس کے قدرتسا سو سال شاہو مد سب سال ہیں۔ تیس سال سزا کے موت کے خلاف ساری دنیا کے مسلمانوں نے احتجاج کیا اور رور کی کی جہنم کے قادیانوں اور اساتذہ، اصحابِ قلم اور اربابِ قدرت سب سی پندرہ سالہ جانی تھے، ان کی سب سزا اور جہنم اور سزا۔ سزا کی موت کو نافذ کرنے کی درخواست کرنے میں تاخیر نہ کی گئی۔ کیا وجہ ہے کہ حکومت مصر نے ایک ایسے سزاہن جہاں دنیا اپنی تنظیمی کے ترقی مراحل میں داخل ہو چکا تھا اور بارہ سال قید و بند کے سزا دینے اس کے قوی و کور کر کے اسے متعدد ملک اداخل میں مبتلا کر دیا تھا اور قیاس یہی کہتا ہے کہ کچھ عرصہ میں وہ خود ہی داعی اجل کو لبیک کہتا۔

بظاہر یہ ایک معنی ہے۔ مگر اس سے معنی یہ کہ گزربانا بے بصیرتی اور غیبتی کا مظاہرہ ہو۔ یہاں کہ اس سواں پتہ کر کے بڑی بریت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اکثر سال کی عمر میں معذرت کی حالت میں یہی سزا چڑھانے کا مقصد موت یہ نہیں ہو سکتا کہ سید قطب کے جسم کو روت سے مار دیا جائے۔ اس مقصد کا سامان جانے کے لیے آخری نظر ڈرانے کی ضرورت ہے۔ بظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس انداز کے ذریعہ ان جوان المسلمون کو بالخصوص اور مصر میں تجدید و احیاء اسلام کے خواہاں افراد کو باہموم یہ جہاد یا جہاد کے ان کی راہیں مسدود کرنے، ان کی سرگرمیاں بند

کرنے اور انہیں اس مقصد میں ناکام بنادینے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھانا نہ رہنا چاہئے گا۔ سوائے
کو زندگی کے نئی دائرہ میں محدود رکھنے پر قناعت نہ کر اسے پوری زندگی میں نافذ کرنے کا ارادہ رکھنے
والوں کے لیے یہ ایک تنبیہ ہے کہ اگر وہ اقتدار و قوت کے قبہ و غضب سے محفوظ و مامون رہنا چاہتے
ہیں تو انہیں دعوتِ اسلامی سے باز آجانا ہوگا۔

اگر کسی کو اس توجیہ سے اختلاف ہو تو ہم دعوت دیتے ہیں کہ حقائق کی روشنی میں مندی
حکومت کے اقدام کی کوئی دوسری معقول اور اطمینان بخش توجیہ پیش کرے۔

یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ مغرب زدہ مسلمانوں کا ایک طبقہ موجودہ زمانہ میں اسلامی
طرز زندگی کے احیاء اور مدنی قوانین کے نفاذ کو یک ناقابلِ عمل تجویز سمجھتا ہو، اس بنا پر اس کائنات
سے مخالفت ہو۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ لوگوں کی نظر آخرت پر نہ ہو، اور جو اس دنیا کے مسائل پر غور کرتے
وقت بھی زیادہ گہرائی اور دور بینی سے کام نہ لے سکتے ہوں وہ نیک نیتی کے ساتھ اس نتیجہ تک پہنچ سکتے
ہیں کہ اگر کسی ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا تجربہ عمل کیا گیا تو اس ملک کے مادی مفادات بچوت
ہوں گے، موجودہ بین الاقوامی فضا میں وہ ملک ذاتِ ذات کی مندرجہ سے دوہرا ہوگا۔ آج
دنیا کے اکثر مسلمان ممالک میں ایسی جہت پرستہ، درلفظ متعینہ پریس ورکرز جو سب
اسی کے ہاتھوں میں ہے۔ اپنی مخصوص رائے کو بنا پر یہ طبقہ تحریکِ اسلامی و مائیدانِ رکھنے کے لیے
ہر ممکن کوشش کرنے کی طرف مائل ہو سکتا ہے جو اسے اپنے آگے

لیکن ہمیں یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ مسلمانوں نے اپنی قوموں، تاریخ سے تعلق ہوں گے بعد
یہ سبق حاصل کیا ہے کہ مذہبِ زمانہ کے قیام و ثبات کا اعصار قانون کی کوئی
پہ ہے۔ جنرل کے قانون اور جس کی شہریت کی بحیثیت

احول کی طرف، ایسی تہذیب کی فضا کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ منہ میں تو یہ اسلامی و زہوریت
کی اس پامالی کا جو پہلو ساری دنیا کے انسانوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص
کا باعث ہوتا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہاں ایک پرمین ہبوری تو ایک کو یہ مال کرنے کے لیے قانون اور
انسانیت دونوں کے دائرہ سے تجاوز کر کے ایسے طریقے اختیار کرے کہ جنہیں انسانی سمات کے لیے
خوش آمد نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ جو فوہ منہ دراز سے بلا شک و شبہ سے ملک کے سیاہ پیغمبر کا مالک ہو وہ اپنے اقتدار کو ہر آن فطرت میں محسوس کرنے لگے اور پارسوں طاعت شک کی کامیابی سے دلچسپی لگے۔ چونکہ فوجی آمریت جو بٹنے کے لیے بالعموم ہم کی بن لینا بھی ضروری سمجھتا رہا ہے اس لیے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ یہ فوہ اپنے اقتدار کے تنظیماتی بنی بن پانے کی رزمی شہادت سمجھنے لگے۔ ایسا فوہ جب جس گوشہ سے بھی اپنے اقتدار کے بے کوئی شہادہ محسوس ہوتے گا اس کے اذہار کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گا۔ اس فوہ کا اس معاملہ میں غیر معمولی طور پر نفسی مزاج بہ جان بھی قریب تھا کہ اس نے۔ انخوان کے دشمنوں نے مصر میں اس مخصوص مہارت سال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انخوان نے صدر عامر کے اس شبہ کو یقین سے بدل دیا کہ یہ ایک اور اس کے بعض رہنما ان کی ذات اور اقتدار کے لیے بڑا سخت شہادہ ہیں جس کو وہ دیکھنے کے لیے اب انتہائی اقدامات، گزیر ہیں۔ اس امر کی وضاحت میں جرنیل خلیفہ کی کر سکتے ہیں کہ اس فوہ میں جو بڑے شہادہ کو حقیقتی چھوٹے شہادہ جوڑا دیکھ کر کے انسان کو ترس رہا ہے کہ وہ بھی اپنے ہر جان میں پیدا ہو رہا ہے اور ہر کس طاعت اپنے اقتدار کو محفوظ رکھنے کے لیے عدل و انصاف، رستہ مائتہ، منہ دہشتی، اور ایسی ہی انتہائی قدروں، ہر چیز کو پامال کرتے ہوئے سخت سے سخت فدا مائتہ کر دیتے ہیں۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے۔ یہ قریب اور انخوان نے کر نرم روی اور مصالحت کا طریقہ اختیار کیا ہے تاکہ ان کے در اسلام کے تقابلیں بہت بہت ہو سکیں۔ یہ حضرات انخوان کی من بانوں کو نرم روی کے خلاف سمجھتے ہیں اور مصالحت سے ان کی کیا م ہے۔ انخوان نے بحیثیت جماعت اور یہ تعصب نے، حیثیت فوجی پر امن تبلیغ افکار اور جمہوری طریقوں سے راستے عامہ کو ہموار کرنے کا وہ وقت طے ہو کر دہشت پسندی اور سختی کا رزمیہ اختیار نہیں کیا۔ وہ ایسا کرنے کا وہی ارادہ کرتے ہیں۔ پھر ان سے کس چیز کا مطالبہ ہے؟ کیا مصالحت کا یہ مفہوم ہے کہ وہ دین کی موت تک کر کے عرب مشنڈریم و مسولڈریم کے نعروں کی تائید کرتے اور آنکھیں بند کر کے مہم کی دھند اور خارجہ پالیسیوں پر صاف کر دیتے۔ بلاشبہ انخوان اس کے لیے کبھی نہیں آتا ہو سکتے۔ یہو کہ ان کے نزدیک ایسا کرنا اسلام سے انحراف ہو گا۔ اسلام فوجی بندوبست کے احیاء، فحش و عریاں معاشرت، آمریت اور اشد اکیٹ پر مبنی اجتماعی زندگی کی اجازت نہیں دیتا

بدلتے رہتے ہیں مگر کم و بیش یہی ہذاستانِ مشرقِ مسلم ممالک میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ اور آٹھویں
یکے مسلمان ملک کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہاں یہ داستانِ زردی
جسے کی۔

اس کا سبب کیا ہے؟ اس سوال پر اسی بے بسی سے کو غور کرنا چاہیے اور تجزیہ و تحلیل
کے بعد کسی ایسے جواب تک پہنچنا چاہیے جو حقائق کی ٹھیک توجیہ کر سکے۔ یہاں اس کا موقع
نہیں۔ بین آپ اس سوال کے جس جواب تک پہنچیں۔ موجودہ حالات کا ایک عملی سبق بالکل واضح
ہے۔ سولہ کی ترقی، تحقیق و تجویز بہت افرائی، جمہوریت کے عروج اور روشن خیالی کے ڈنگوں کے باوجود
آٹھویں دنیا میں سولہ کی بدعت لے کر اپنے دلوں کو اپنے اور غیروں کے غمگین ہونے کا نشانہ بنایا
جا سکتا ہے۔ اور اس رہ میں آگے بڑھنے والوں کو اس کے لیے پوری طرح تیار رہنا چاہیے۔ اس راہ
میں بڑے عزم اور صبر و ثبات کی ضرورت ہے۔ صرف جسمانی ذہنیات کے مقابلہ میں نہیں، بلکہ مار
کے اس زبردست دباؤ کے مقابلہ میں بھی جو محبت پرندہ رشتہ کارکنوں کو تنہا ایک اسلامی کے صحیح
ذاتی طاق کا رستہ پیش کرنا چاہیے۔ یہ عزم و ثبات صرف اتنے میں آ سکتا ہے جو
انسانی تان بھونچا ہو۔ اللہ نے اسے اس پر مامور نہیں کیا ہے کسی ہی طریقہ سے کام لے کر سلام کو کسی
مکان میں غالب نہ کھائے۔ بدقسمتوں کا نتیجہ اس میں ہے کہ اسلامی دعوت کی کتاب اس طریقہ سے
سے بڑے بڑے جو کتاب و سنت نے اسے سکھایا ہے۔ اس کی کامیابی اور کامی کے پیچھے دینی
نہیں اخروی ہیں، اور دنیا میں اسلامی نظم زندگی کا قیام آخرت کی بھلائی کے لیے مقصود ہے۔

اس راہ کی آزمائشوں کو مندرجہ پیشہ کے ساتھ برداشت کرنے اور صحیح دینی طریق کار پر قائم
رہنے کے ساتھ ہمیں اس بات کا بھی اہتمام کرنا چاہیے کہ اسلامی ملکوں میں ایسے حالات پیدا ہوں
جو دنیاوی لڑائیوں کو ملک کے اندرونی مسائل میں داخل نہ رہنے کا موقع نہ ملے، اور ملک کے ارباب
اقتدار کو دنیاوی مصالحت، سیاسی اشتیاع یا معاشی ترقی کے نام پر جمہوری حقوق کی یا مادی و
بیرونی لڑائیوں کی کاسہ ایسی کے مواقع نہ دیں۔ یہ ملک میں آخری فیصلہ کن طاقت اس کے عوام
کا عزم و ارادہ، ان کی محنت، ان کا نظم و ضبط اور ان کی عالی حوصلگی ہے۔ عوام کے اسلام سے
جذبہ باقی رکھنا، اسلامی تعمیر نو کے ان لاقتور عوامل میں تبدیل کرنا ضروری ہے۔ ملک کی اسلامی تعمیر نو

کے لئے ایل امیہ و منصوبہ میں معاشی طور پر دنیا کی بڑی طاقتوں سے بے نیاز کیا اور فوجی اعتبار سے ان پر عدم انحصار کو بھی پوری اہمیت دینی چاہیے۔ تو ایک اسلامی کے کارکنوں کو بھی طاح سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے مخالف مکتب فکر کے مغرب زدہ ارباب فتنہ زنجیں بلکہ بیانی بڑی طاقتیں بھی ہیں۔ ان بڑی طاقتوں کو انڈیا مسلم ممالک میں فوجی و معاشی مادہ بخینے کی وجہ سے حکومت وقت کی اندر و رنار تہ پامیسی پر اثر انداز ہونے کا بخیر و بدعتوں کی تسلسل میں ان کے لئے ہو چکا ہے۔ اس فتنہ کے سد باب کے لئے بڑی طاقتوں کی مدد سے بے نیازی ضروری ہے۔ یہ بے نیازی صرف بند باقی ترویش، مصلیوں اور تہذیب سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس کے لئے ہر مظلوم و مریح کسان، مخالف سماج کے ہر کارکن کو محنت کے ذریعہ اپنے ملک و معاشی طور پر تہذیبی طاقتور بنانا ہو گا کہ وہ وہ مصلحتوں کا اس طاقتور مکتب فکر کے ہاتھوں میں نہ آئے۔ سارے مسلم ممالک جہاں ہیں۔ ان کی دنیا میں مسلمان ملکوں کی سیاسی آزادی اور تہذیبی ترقی معاشی استحکام و ترقی اور اپنے مکتب فکر کے سلسلے میں تہذیبی ترقی ہو سکے بغیر عمل نہیں ہو سکتی۔ اور یہ محنت کسی تفصیلی بحث کا متقاضی نہیں کہ اسلامی ترقی میں مکتب میں کام کر رہے ہو۔ اس کا جو سیاق و سباق پر آزاد اور بند تہذیبی اعتبار سے خود مختار ہو۔

سید قطب اور اسلامی تہذیب

قامت دین کے داعی کی حیثیت سے سید قطب نے مکتب فکر کے نشان کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کیا ہے اور یہ سے اندازہ اور اجتماعی زندگی میں کس درجہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ جدید میں اسلامی زندگی کی تعمیر نو کا پروگرام سید قطب نے اس کی کتاب، اس کے رسالے کی سنت اور خلافت راشدہ کے اجتماعی نظام سے انداز کیا ہے۔ سلف صالح کی طاعت و بھی نبی کریم کے تربیت یافتہ بھی پر ایمان کے بنائے ہوئے معاشرہ اور اس کے اجتماعی نظام کو اسلامی تعلیمات کا اعلیٰ ترین مل مظاہر قرار دیتے ہیں اور اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اسلام کے ان نمائندوں کی انفرادی زندگیوں کو بھی وہ اسلامی زندگی کے اونچے نمونے قرار دیتے ہیں۔ مگر جیسا کہ سلف صالح کا بھی مسلک رہا ہے، وہ کسی غیر نبی کو موصوم من الخطا نہیں سمجھتے۔ سید قطب کی اس کتاب کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے اس کے

ساتویں باب کا موضوع یہی ہے کہ اسلام کی جو اصولی تعلیمات کتاب کے ابتدائی چھ ابواب میں بیان کی گئی ہیں ان کا عملی اظہار خلافت راشدہ کے دور میں بالخصوص اور اس دور کے بعد آنے والے صالح لوگوں کی زندگیوں میں بالعموم کس طرح ہوا۔

قرن اول کی تاریخ کے اس مطالعہ میں دوسرے متقین کی طرہ سے سید قطب کو بھی چند نازک مسائل سے عہدہ برتا ہونا پڑا ہے۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے مختلف اور بعض اوقات متضاد روایتیں آتی ہیں جن کے درمیان ترک و انتخاب کے بغیر پارہ نہیں۔ انتخاب و ترجیح کے معارف معیاروں کا لپکا کر رکھنے کے باوجود اس کا امکان باقی رہتا ہے کہ ایک مؤرخ اور دوسرے مؤرخوں کے درمیان روایات کے انتخاب میں اختلاف پایا جائے۔ اُس کا مثالیں اکابر سلف صالح کی تصانیف میں بھی ملتی ہیں۔ سید قطب نے بھی بعض ایسی روایات پر اعتماد کیا ہے جنہیں بعض معاصر محققین ناقابل اعتماد قرار دیتے ہیں۔ اس اختلاف کو دور کرنا ممکن نہیں۔ اُمت کی فلاح اس میں ہے کہ محقق کو تحقیق کے معارف معیاروں کے مطابق ترک و خذ کی پوری آزادی ہو اور وہ بلاشبہ ایک اپنی رائے پیش کرے اور اس کے حق میں دلائل دے۔ تاکہ مطالعہ کرنے والے مختلف نتائج تحقیق میں سے جس کو زیادہ مدلل اور معقول سمجھیں اختیار کر سکیں۔ مؤرخ یا محقق کو کسی دور کے مخصوص مصالح کے تحت کسی خاص رائے کا پابند بننا دینا ایک ایسا اقدام ہوگا جس کی اسلام میں کوئی سند نہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ خود خلفائے راشدین نے پسین آمدہ مسائل میں ایک دوسرے سے مختلف فیصلے کیے ہیں اور بعض اہم اجتماعی امور کے سلسلہ میں ایک خلیفہ راشد کی پالیسی دوسرے خلیفہ راشد کی پالیسی سے مختلف رہی ہے۔ اسلامی تاریخ کا ایسا مطالعہ جس کا مقصد زندگی کی اسلامی تعبیر نو کے لیے رہنما حاصل کرنا ہو ان مختلف فیصلوں کے درمیان ترجیح و انتخاب کے بغیر ممکن نہیں ہوگا اور نیز موزوں، مفید اور منفہ اور بعض اوقات صحیح درحاطہ کی تمیز قائم کیے بغیر اس بات کا فیصلہ ممکن نہیں کہ آج ہمارے لیے کون سی پالیسی اختیار کرنے کے لائق ہے۔

سلف صالح کی طرہ سے سید قطب بھی اپنی رائے رکھتے ہیں کہ ہر خلیفہ راشد شخص نیت اور شکی ارادہ سے مشغف تھا کسی خلیفہ راشد نے جان بوجھ کر کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا جو اسلام اور مسلمانوں کے

کے مفاد کے خلاف رہا ہو۔ لیکن وہ یہ کہے ہیں، کتنے کسی خلیفہ راشد سے مصلحت کی تدبیر میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ سلف صدائیں سے کوئی بھی سزا تو ملے گی۔ نیز۔ فیض کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کسی شری حملے سے کسی کے بند بچیں رہے ہیں، یا کسی کے بھائی یا مختلف شری حملے سے مرنے والے ہوئے، یا کسی فیصلہ کے دوران میں غلطی تباہی کا بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے۔ یہ سب باتیں یہاں پر اپنے فیصلوں کو عمال حکومت اور کلیہ کی من مصلحت پر فیاض افراد سے تحسین تحسین: لفظ اس کا۔ اچھے ارادہ اور پاک نیت کے باوجود انہیں اسباب کی بنا پر یہ سب پر فساد ہو سکتا ہے۔

دورِ حاضر میں کسی مؤرخ، محقق، مفسر، یا مؤرخین میں ہے۔ وہ بھی یہی ہے۔ والے مختلف فیصلوں کے اس سلسلے میں جو فیصلے، سلف صدائیں سے مرنے والے ہیں۔ موت تھے، بعد میں ظاہر ہوئے۔ ان سب سلسلے میں مقصود و مطلوب نتائج کے پیچھے سے یہ باتیں ان فیصلوں کے بارے میں مزاروں یا مزاروں پر بھی یہ غلط فہمی ہے کہ یہ سب سلسلے کے طبع فیصلہ کرنے والے کی نیت۔ وہ یہاں نہیں رہا، جیسا کہ صدائے راشدین کے فیصلوں پر تدبیر مصلحت کے باب میں، اس سے کہیں کہیں ہمارے وقت اسلامی مؤرخ کی عہد ان فہم اور خوب دانا خوب، اعلیٰ و ادنیٰ، عہد، نیت، رخصت کے ان بیانیوں پر جوتی ہے جو سب سلسلے رسول کی سنت سے ہیں۔ کہے ہیں، یہ سب سلسلے میں ہے۔ در سید مصلحت کی مصلحت قائم ہیں کہ یہ سب سلسلے میں، سب سلسلے میں، سب سلسلے میں سب سلسلے میں کتاب و سنت کے، یہ سب سلسلے میں سب سلسلے میں سب سلسلے میں سب سلسلے میں کے درجے مختلف ہیں۔ درجہ اولیٰ درجہ اولیٰ درجہ اولیٰ درجہ اولیٰ درجہ اولیٰ درجہ اولیٰ مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر، کبھی کوئی خلیفہ راشد کسی فیصلہ کی حد تک اس کو شیش میں کام بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے اس کے خلیفہ شریعہ نے، فی الجملہ، رشیدیات پر قائم ہونے والے آثار حسنات اور نیک ارادہ سے متصف ہونے کی شان میں ذرہ بر ذرہ نہیں آتا۔ یہ بات قرآن و سنت کی دی ہوئی قدروں اور اس کے مقرر کردہ میزانوں پر ظلم کے متعلق ہوتی ہے کہ اس کے سبب یہ کام ملے کہ وقت اعلیٰ و ادنیٰ اور موزوں و غیر موزوں کی تیز ختم کر دیں۔ یہ طریقہ ان قدروں کو صحیح کر دے گا، ان میں کوئی کو

کھوکھرا بنادے گا۔ اسلام کے مستقبل اور دورِ حاضر میں اسلامی زندگی کی تشکیل جدید کا نقشہ مرتب کرنے کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ ہمارے صحیح و غلط اور اعلیٰ و راہِ نئی کے میں واضح اور متعین ہوں۔

تعلیم، احکام اور جذبہ تنباغ کی حقیقی درپاؤں بنیاد علم ہے نہ کہ جہل حقیقت ہے۔ یہ تصدیق اُمت کی فطرت میں ہے کہ اس کے غور کے سامنے اس کے مسائل، بالخصوص صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کی تاریخ اُسی طرزِ بیان کی جائے جیسی کہ وہ تھی۔ اور اگر اس میں اختلافات پائے جاتے ہیں تو ان اختلافات کو بھی اور سمجھایا جاتا ہے۔ اس بات کو عوام کا ذہن بھی تسانی سے قبول کر سکتا ہے۔ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہ ہوگی کہ انسان کی بزرگی بے دشت اور بے دخل نہیں ہوتی اور اجتہادِ غلط یا کسی ایک معیار میں سو رہنے سے بزرگی میں فرق نہیں آتا۔ احکام اور انبیاء کے جذبہ کو حقیقت پسند نہ بنیادوں پر پروان چڑھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جب یہ عوام آتے اپنے علم اور اکابر کو بہت اختلاف کرتے دیکھیں گے تو ان میں وہ حیرت و شگفتہ و رازِ معاد بزرگوں کی جانب سے وہ بیزاری نہیں پیدا ہوگی جو آج جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں خاص طور پر پیدا ہو رہی ہے۔

آج بھی جب کسی ملک میں اسلامی بنیادوں پر قانون سازی، نظامِ تعلیم کی اصلاحات اور سیاسی و معاشی نظام کی تعمیر نو کا کام شروع ہوگا، تدریجِ مسکن سے متعلق ان امور میں غلط و صحیح علم و تقویٰ مسلمانوں کے درمیان بھی اختلاف رائے ناگزیر ہے۔ صحیح یہ کہ غلط، انہوں نے خلفائے راشدین کے زعم میں امورِ مملکت کی تدریج سے متعلق پائے جاسنہ، اختلافات پر غور و بحث اس ذیل میں بڑی بہت رکھتی ہے۔ اس بحث میں اُمت کو یہ معلوم ہوگا کہ سلامی تعینات کی تعبیر و تطبیق میں ماہرین و ترمیم یا احوال و مناسبات کے فوق کی بنیاد پر اختلاف ممکن ہے و اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ اسلام نے ہمیں اختلافی امور میں اجتماعی فیصلہ طرغیہ بھی بتا دیا ہے۔ ہمیں اختلاف کو کتاب و سنت کی روشنی میں باہمی مشورہ کے ذریعہ طے کرنے کی تربیت حاصل کرنی چاہیے، اور اپنے اندر یہ مزاج پیدا کرنا چاہیے کہ اختلاف کے باوجود اصحابِ امر کی طاعت میں کمی نہ ہو۔

اس اصولی گفتگو کے بعد ہر اختصار کے ساتھ یہ واضح کر دیں گے کہ اس کتاب کے ساتویں باب

میں مصنف کی جو رائیں بعض حضرات کے لیے تشویش کا سبب بنی ہیں ان کے طہارت مصنف کا
منشاء کیا ہے۔

میں نے کی تقسیم میں نہایت بہتار سے مساوات برتنے کا فیصلہ کیا اور ہر ایک کو مساوی قدر
دیا۔ حضرت عمرؓ نے ایک وزنی دلیل کی بنیاد پر جو انھوں نے واضح کر دی تھی اور مصنف نے نقل کی ہے
بعض اوزان کو بعض اوزان سے زیادہ "تھکا دیا"۔ عدم مساوات برتنے کی یہی اختیار کی۔ مصنف سے
یہ رائے غائب کی ہے کہ کئی پر تک عدم مساوات کی پالیسی پر عمل کی وجہ سے اور چند دوسرے اسباب
کی بنا پر دو سائیکس سائیکس کا رتبہ بھی اس قدر میں دولت کی تقسیم کے برابر تھا۔ اس لیے
میں نے سکا۔ اور دولت کے ساتھ ہی ایک طبقہ کے اندر موزوں بننے کا رتبہ یہاں بیان کیا ہے۔
مصنف نے ایک تاریخی رویے کے طور سے حمایتِ خلافت کرنے میں ناسمجھانہ رویہ کو ملحوظ
رہا ہے۔ پچھلے دور خلافت کے آخری سال میں یہ سبب بڑا بڑا گناہ یہاں بھی بیان کیا ہے۔
اور وہی تقسیم میں مساوات برتنے کے لیے مکرر آپ کی تباہی کے لیے اس رتبہ کا عملی حوالہ
دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مصنف کے ایک زیادہ موزوں یا جیسی وہی تھی جسے نہت ہو جانے منہ پر
کیا تھا۔ جس کی طرف ماضی مہم نے بھی جوت کر رہا تھا۔

باب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا منصف و تپ نے کی تقسیم میں عدم مساوات برتنے
کا طریقہ جاری رکھا۔ مصنف نے نزاعِ آپ اس امر کا مطالبہ کیا کہ اگر وہ عربی میں کی منہ جھوس کر کے نہت
نے اس پالیسی کو بدل دینے کا ارادہ کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں بڑا بڑا جیسی ہو رہی تھی۔
نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ نے وہ خلافت میں ساری مہم کے دور میں تقسیم کا نوزن بہت
بگڑا ہے۔ باب حضرت علیؓ کا منصف و تپ نے کی تقسیم میں مساوات برتنے کا طریقہ اختیار کیا۔
مصنف نے نزاعِ آپ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا عمل اور حضرت عثمانؓ کا جوت منہ تک پہنچنے کے
لیے کافی ہے۔ تقسیم نے میں مساوات برتنا اسلام کا مسلخوں کے حق میں زیادہ بہتر ہے اور
عدم مساوات برتنے کا طریقہ ٹھیک نہیں۔

دوسرا مسئلہ جس کے بارے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی پر مصنف نے تنقید
کی ہے، اہم سرکاری مناصب پر خلیفہ وقت کے رشتہ داروں کا تقرر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت

بوکرؓ اور حضرت عمرؓ ایسا کرنے سے پرہیز کرتے تھے مگر حضرت عثمانؓ نے مختلف کلیدی مناصب پر ایسے اذدکوم مقرر کیا جو ان کے قبیلہ یا خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرت ایک مخصوص گروہ کے لوگوں کو پوری اسلامی مملکت پر چھا جانے کا موقع مل گیا جس سے آگے چل کر دور رس ناپسندیدہ نتائج رونما ہوئے۔ بدشعبہ ایسا کرتے وقت حضرت عثمانؓ کے سامنے بعض اہم مصالح اور اس کے نام نظر کے تقاضے رہتے تھے۔ لیکن مصنف کی نظر ان فوری مصالح کے ماوراء ان عملی نتائج پر ہے جنہوں نے آگے چل کر تاریخ اسلام کا رخ بدل دیا۔ ان کی رائے میں اس مسئلہ میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی پالیسی صحیح تھی، حضرت عثمانؓ کی پالیسی غلط تھی۔

تیسرا مسئلہ بیت المال سے عطیت اور ہبہ یا انعام کے طور پر تمسک دینے کا ہے جس سے حضرت عثمانؓ کے دور میں بعض لوگوں کو بیت فائدہ پہنچا۔ حضرت عثمانؓ اس سلوک کو صلہ رحمی کی اسلامی تعلیم کا تقاضا سمجھتے تھے۔ مگر مصنف کے نزدیک یہ ان کے سمجھنے کی دبا لفاظی دیگر ایک نص کی تعبیر یا تاویل میں غلطی تھی۔ بیت المال سے اس طرح کے خراجات مناسب نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بیت المال کے سال کے بارے میں سخت محتاط واقع ہوئے تھے۔ حضرت عثمانؓ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مردہ سے سنت پالیسی پر عمل کرنا ضروری سمجھتے تھے نہ مناسب۔ اس رائے کی بنیاد ضرور بعض مصالح پر ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیت المال میں اس کی ثبات اس وقت کا سبب بنی ہو۔ لیکن مصنف کے نزدیک اس سے دو خرابیاں پیدا ہوتیں۔ پہلی خرابی یہ تھی کہ سمیت کے ایک طبقہ میں دولت کے مرکز کا جو رجحان دوسرے اسباب و معاملات کی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا اس پالیسی سے اس کو مزید تقویت حاصل ہوئی، اور دوسری خرابی یہ کہ اس سے بعض لوگوں کو شہادت پیدا ہوئی جس سے فتنہ کو فضا ملی۔

اس مسئلہ پر ظہار خیال کے دو مسائل مصنف نے جن رائتی روایات پر اعتماد کیا ہے ان کی صحت پر یا خود مصنف نے ان روایات کو جس طرح سمجھا ہے، اس پر کافی بحث کی گنجائش ہے۔ خود یہ بات بھی مختلف فیہ ہے کہ یہ انعامات آپؐ نے اپنے ذاتی مال میں سے دیئے تھے یا بیت المال سے۔ اگر سے صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ فقہی مسئلہ کہ وہ اسلامی سمان کے اندر دولت کی تقسیم میں ترمیز کا رجحان پیدا کرنے میں چند دوسرے اسباب و عوامل نے بھی حصہ لیا تھا جو انعامات و ہدایاں کی غیر مساوی تقسیم سے زیادہ طاقتور ردیئے جاسکتے ہیں۔ مصنف کے سادہ تجزیہ اور

فیصلوں کے بارے میں اختیار کیے۔ لیکن انھوں نے امت میں یہی سب کچھ ہی نہیں کرتی ہے۔ انھیں کہ سید قطب پر تنقید کرنے والوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور ان کے بارے میں بعض انتہا پسندانہ رائیں ظاہر کی ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقیدوں میں سید قطب کی طرف یہ بات بھی منسوب کر دی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جان بوجھ کر اصول اسلام کی خلاف ورزی کی اور مفادِ اسلام کو نقصان پہنچایا۔ اس کتاب کا ساتوں باب بالخصوص اس کی وہ عبارت جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے گواہ ہے کہ یہ الزام بے بنیاد اور غلط ہے۔

ہمیں اس بات پر بھی افسوس ہے کہ بعض ناقدین نے اردو زبان میں سید قطب پر تنقید کرتے وقت ان کی کتاب کے ترجمہ یا العدالۃ الاجتماعیہ کے آخری "بی ایڈیشن" کی عبارتوں کو سامنے رکھنے کے بجائے کسی پچھلے ایڈیشن کو سامنے رکھا ہے جس کی بہت سی عبارتوں کو مصنف نے ساقط کر دیا تھا۔ یہ افسوس اس بات پر ہے کہ بعض اصحابِ قلم نے توجہ دلانے کے باوجود بھی اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔ حالانکہ یہ بات کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی کہ کسی مصنف پر ایسی عبارتوں کے حوالہ سے شدید ترین تنقید کی جائے جن کو وہ حذف کر چکا ہو۔

تیرہ سو سال کی طویل مدت میں اسلامی تاریخ کے تبدیلی دور پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ درج ذیل سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دورِ جدید میں اسلامی تاریخ کے کسی طالب علم کے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ انہیں ہندو کے کسی ایک مصنف کی ریویو کو یا اس کی بیان کی ہوئی تاریخ کو اس موضوعات پر صرف غور سمجھ لے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے بھی اس اکتہ سے نا اہل نہ ہوں گے۔ ہر حقیقت بھی سامنے رہے کہ اس کتاب کا اصل موضوع تاریخی اسلامی کی تحقیق نہیں بلکہ اجتماعی عدل کے اسلامی اصولوں کی وضاحت ہے۔ اس کتاب کو اردو زبان میں پیش کرنے کا محرک یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مصنف کو اس کام میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید ہے کہ اسے پڑھنے والے بھی اس کے اصل موضوع کو مرکزِ توجہ بنائیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ انہیں محسوس ہوگا کہ مصنف کی تاریخی بحثیں ان کے اصولی بیانات کے لیے نظائر فراہم کرنے کا کام کرتی ہیں۔ درج ذیل اختلافات کے باوجود ان کا اصولی استدلال فی الجملہ اطمینان بخش ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ موجودہ ترجمہ "العدالۃ الاجتماعیہ" کے ساتوں

تعارف طبع اول

استاذ سید قطب کی شخصیت ہمارے لیے اجنبی نہیں۔ آپ مصر کے ایک بڑے دیب، انخوان المسلمون کے چوٹی کے مفکر اور عالم اسلامی کے ان چند مصنفین میں سے ہیں جن کی تصانیف تمام سنی ممالک میں قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ عربی میں آپ کی تصانیف ہندوستان کے مختلف علمی مراکز میں عام ہو پہنچ چکی ہیں اور بعض مکتبے بھی انہیں فراہم کرتے رہے ہیں۔ اردو میں آپ کے بعض مقدمات کے ترجمے متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ چونکہ یہی کتاب ہے جس کا مکمل ترجمہ اردو میں پیش کیا جا رہا ہے لہذا قدرے تفصیلی تعارف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ (دریہ) استیواہ کے موشاناہی گاؤں میں پیدا ہوئے والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور دائرہ کلام فاطمہ حسین صہب تھا۔ دونوں مسلمان تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب بھی صاحب تصانیف ہیں اور ان کی دو کتابیں "الانسان بین العادیۃ والاسلام" اور "مستقبل حول الاسلام" اچھے معیار کی حامل ہیں۔ ان کی بہن بھی سحرمنہ دم اسد اور صاحب قلم خاتون ہیں۔ ان کے اصلاحی اور مدنی افسانوں کا ایک مجموعہ "فی تیار احیاء" کے نام سے سال ہی میں شائع ہوا ہے۔

والد کا پیشہ زراعت تھا۔ والدہ بڑی دیندار خاتون تھیں اور قرآن مجید سے بڑا شغف رکھتی تھیں۔ ان کی آرزو تھی کہ ان کے بچے صرف قرآن ہوں۔ چنانچہ سید قطب نے بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا اور اسی عمر میں ان کو قرآن کریم سے خصوصی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں

کہ اسلام دین حق ہونے کے ساتھ انسانیت کو موجودہ تہذیبی بحران سے نجات دلا کر ایک متوازن نظام زندگی دینے کی بھی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ امریکہ سے واپس آ کر انھوں نے اپنے ان تاثرات کو امریکی "الٹی رائیٹ" نامی کتاب میں پیش کیا۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرف سے بھی مغرب کی اندھی تقلید میں مبتلا تھا۔ ہندو مغربی تہذیب کے براہ راست مطالعہ کا مستند پتہ حورہ میں ہوا جس نے خود مغرب میں مغربی اثرات کے مقابلہ اپنے وطن کو مغربی نظموں کی تقلید کے خطرات سے آگاہ کرنے اور اسلام کے متوازن نظام کی طرف دعوت دینے کا داعیہ پیدا کیا۔

امریکہ میں ان کا قیام تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رہا۔ واشنگٹن میں ولسن ٹیچرس کالج، میڈیسن کولورڈو میں ٹیچرس کالج اور کیلیفورنیا میں سٹن فورڈ یونیورسٹی میں قیام رہا۔ اس کے علاوہ نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو، سینیگزا اور دوسرے شہروں میں جانے کا بھی موقع ملا۔ امریکہ سے واپسی کے دوران آپ نے پاکستان، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی چند ہفتے گزارے۔

اسلام کی طرف توجہ اور مآخذ اسلام کے مطالعہ کے ساتھ ہی سید قطب کو "خون المسون" سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن امریکہ جانے سے پہلے "خوان" سے باضابطہ طور پر متعلق نہیں ہوئے تھے۔ ابتدا میں انھیں "شرعاً حسن، لیکن رقتہ اللہ علیہ" کی شخصیت سے خاص اشتداف بھی تھا۔ امریکہ سے واپسی پر ان کا فلم اسلام کے لیے وقت ہو گیا۔ انھوں نے انھوں کے اخبارات دہراک میں کثرت کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہفت روزہ "الدعوۃ" کا کافی شمارہ ان کی نگارستان سے خالی نہ ہوتا تھا۔ "خوان" کے باضابطہ ممبر اور ۵۳ء میں بنے۔ انھوں نے جس نے مکی بنی شعبہ نشہ و شاعت کا سرکاری بنادیا۔ سید قطب نے "خوان" کے لئے بحر کوؤ النسیسی، انگریزی، انڈونیشیائی اور دوسری زبانوں میں منتقل کرنے اور نئی تصانیف سامنے لانے کا ایک جامع پروگرام بنایا۔ مگر ابھی اس پر عملدرآمد شروع ہی ہوا تھا کہ جماعت خلافت قانون قرار دے دی گئی جس سے پہلے آپ انھوں کی تنظیم کے سلسلہ میں یورپ سے سفر کا دورہ کر چکے تھے۔ اسے کی ان "خوان" مسلمانوں کے ساتھ سید قطب عالمی اسلامی تحریک میں بھی مقصد لیتے تھے۔ اور ایک زمانہ میں موتمر اسلامی برائے فلسطین کے سرکاری بھی تھے۔ اسی سلسلہ میں آپ نے ۱۹۵۲ء میں شام اور بیت المقدس کا سفر کیا تھا۔ جب "خوان" مسلمان

... یہاں آئیں گے اب بہت زور دے گا۔ خونِ افسانہ کے ہاں فیصلہ کیا اور اس کا ٹریٹ
سند قصبہ ...

تو ان کے تلی بارہ سو تالیفوں پر دیکھ جائے گا کہ سید قطب کو بھی ۳ جنوری ۱۹۵۷ء
میں گرفتار کر لیا گیا۔ جس کے بعد سے اب تک انہیں رہا نہیں کیا گیا ہے۔ اس دور سے دور سید
ابن ابی طالب نے درجہ امیر ملت مودعائے شیعہ میں وہاں دل بٹا دیا۔ یہ سختیاں اب باقی نہیں
ہیں۔ یہ سب سے جس میں موت کا آہم دور ملت بعد تصنیف کی آسانیاں پیش ہیں۔ ان کل
وہاں سے دس سو مہڑا رہا یہ دس سال کے فاصلہ پر طرہ، می منفہ پر محبوس ہیں اور خلیفہ میں
سمت ہی نمی ہے۔ انھوں نے یہ تصانیف پڑھیں ہی میں نظر ثانی کی ہے۔ درانی صبا مقرر۔
نامی نفسیہ بھی جیل ہی میں مکمل کی ہے۔

سید قطب کے حروفِ توقیہ مدت میں جو مقدمہ یا ایک تھا اس کا ذکر ممدی حکومت کے
شائع کردہ کتابچہ "محکم فی الشعب" میں آیا ہے۔ ایک مقدمہ روی نے مجھے شایاں کہ اس
عدالت کے سامنے سید قطب نے یہ کہا تھا کہ "گر تمہیں ضرورت ہو تو میں پناہ تجھلی پر رکھ کر آیا
ہوں۔ اپنے بیان میں سید قطب نے یہ اختلاف کیا کہ حکومت کی جانب سے وزارت کا عہدہ پیش
کیا گیا تھا کہ انہوں نے سے مسترد دیا انھوں نے یہ کہا کہ اگر انھیں وزارتِ تعلیم دی جائے تو غیر مشروط
طور پر ملک کے تعلیمی نظام کو اسلامی نظریات کے مطابق ڈھالنے کی آزادی دی جائے تو وہ سے قبول
کر سکتے مگر حکومت نے یہ شرط رکھ دی۔

ہاں مصنف کی تصانیف کا جو اسلامیات کے علاوہ شعورِ فسانہ، تنقید، سفرنامہ
وغیرہ اصناف سے بھی تعلق رکھتی ہیں تفصیلی تعارف ممکن نہیں۔ ذیل میں ہم دون چند اہم تصانیف
کا اجمالی تعارف کرائیں گے۔

۱۔ یک جہان سے پہلے کتابیں شائع ہو چکی تھیں جن میں سے دو کے علاوہ باقی سب کا تعلق
ادب سے تھا۔ بعد کی بارہ تصانیف میں سے زیادہ تر کتابوں کا موضوع اسلام ہے۔
بعض اہم تصانیف یہ ہیں:

فی سلالِ مقرران (قرآن کے زیرِ سایہ) — یہ تفسیر، جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ

اصطلاحی معنی میں کوئی تفسیر نہیں۔ مصنف نے وہ اثرات قلمبند کر دیئے ہیں جو مطالعہ قرآن کے دوران اس پر طاری ہوئے۔ مصنف کے نزدیک اس کے ہم معادوں کے لیے اپنے ہی جیسے ایک ”جدید“ ذہن کے ان تاثرات کا مطالعہ ایک مخصوص اور دینی کا مناسبت ہے۔ ہمارا مقصد مصنف کی سربلندی کی تائید کرتا ہے۔ تفسیر میں جذباتی اپیل اور دعوتی سلوب نمایاں ہے قرآن کریم کے فنی و فنی کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ تفسیر کی مقبولیت کا اندازہ اس سے جو سند ہے۔ اس کا کافی درجہ ”ورسائے قرآن“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔

التصویر الفنی فی القرآن۔ ہمارے نزدیک اپنے موضوعات پر ایک اچھوتی کتاب ہے جس میں دورِ جدید کے ایک ادیب نے جدید فنونِ لطیفہ کے زاویہ نگاہ سے قرآن مجید کی بلوغت کے ایک خاص موضوع کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ پہلو قرآن کی تمثیلات، تشبیہ اور استعاروں سے متعلق ہے۔ تبارکی تفسیرات میں مصنف نے جدا جدا تر جانی کی ”اسرارِ ہدایت“ جیسے بلند پایہ کتاب پر تنقید کرتے ہوئے بلوغت قرآن کے باب میں اپنے ذوق اور مسلک کی وضاحت کی ہے۔ کتاب میں منظر کشی، اشارہ و تمثیل، در بلندی تخیل کے جدید معیاروں پر قرآن کریم کی تشبیہ اور استعاروں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ قدیم عربی در سگاہوں کے ذریعے کو شاید یہ انداز پسند آئے لیکن جو لوگ جدید لٹریچر اور آرٹ کے میدان میں فنی تنقید کے لئے معیاروں سے مناسبت رکھتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اس سے قرآن کی عظمت کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ اور اس کی کشش اور جذباتیت کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ دلائل فیما یعشقون مذاہب۔

مشاہد القیامۃ فی القرآن میں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

معركة الاسلام والاسمالیہ الاسلام اور مایہ داری کی کشمکش،

ادب الاسلام العالمی والاسلام، اسلام اور عالمی اس، اپنے موضوعات پر اچھی کتابیں

ہیں۔ اسلوب دعوتی اور خطیبانہ ہے۔ اور یہ مصنف کے مزاج کا خاصہ ہے۔

العدالة الاجتماعية فی الاسلام اسلام میں عدل اجتماعی،

جس کا ترجمہ ”اسلام میں عدل اجتماعی“ کے نام سے پیش نگاہ ہے۔ مصنف کی سب سے بڑی

تصنیف ہے۔ کتاب زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کی وضاحت میں بڑی طرح کامیاب قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ نقطہ نظر کے زیادہ سے زیادہ مسائل سے زیادہ بہرہ ور اور مزید ہے جس کا اسلامی نقطہ نظر ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اسی بہت کی وضاحت کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ کتاب کی ایک تیز رفتاری خصوصیت روحیہ و مادی کی کسوٹی پر مسائل کی تاریخی کویر کھسک دینے کا یہ یقین پیدا کرنے کا شش ہے۔ تاریخ مادی تو اسی روح کے عمل کا نام ہے۔ ایک مسلسل عمل ہے جو آج میں جاری ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے قرآن و حدیث سے آج تک کی تاریخ سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جو روحانی مسائل کے منہ پر اور اس کے بقا و تسلسل کا ثبوت ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ اس کے بعد دعوت میں یہ غماز پیدا ہو گیا کہ اسلامی میراث نہ فنا ہو کر زینت یا کسی نہ کسی زمانہ کا طائفہ اقباز بن کر نہیں رہ گئی بلکہ تاریخ کے جاری مسلسل خزانہ بن رہی ہے۔

مستقبل قلم کے نزدیک آج دنیا ایک تیزی سے گزر رہی ہے اور بہت جلد ایک مسووم عالم زندگی کی تلاش ہے۔ دنیا صد برس کے عروج و انحطاط کے بعد مادی تہذیب سے بے نیاز ہو کر جس سماج عقیدہ اور مذہب کے اجتماع کی تلاش ہے وہ اسے صرف اسلام کی آغوش میں مل سکتا ہے۔ یہ حقیقت دنیا کو آسانی بخانی جاسکتی ہے اور وہ اسے تسلیم بھی کر لے گی لیکن اس کے بغیر اسلامی سماج میں انقلاب حال نہیں ہے۔ اس کا خاطرہ تو ایک سدھ کے کارکنوں کو بہت پریشان ہے۔ ان فکری و عملی کاموں کی نشاندہی مصنف نے خاص تفصیل کے ساتھ آٹھوں باب میں کی ہے۔ اسے علمی و فکری اور دینی کام پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ جدید اسلامی قانون سازی کے مسائل پر کھنگو کرتے ہوئے آپ نے اس سلسلہ میں چند متعین تجاویز بھی پیش کی ہیں۔

مطابق طور پر اس کتاب میں بالخصوص ساتویں باب میں مصنف نے بعض ایسی رائیں بھی ظاہر کی ہیں جن سے نقد کرنے کا سبب کے ہر قاری کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ لیکن ایک صالح اور روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے اپنے مانتا کا منقیدی مطالعہ ناگزیر ہے۔ اور اس اجماع قدرت کے پس منظر میں مصنف کی ان رہنماؤں کا مطالعہ بھی فائدہ کا حامل ہے جس سے اکثر اصحاب فکر کو اتفاق نہ ہو۔

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ "سوشل جسٹس ان اسلام" کے نام سے امریکن کاؤنسل آف لرننگ سوسائٹی، واشنگٹن کی جانب سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ کتاب کے پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے اور ترجمانی، زمان، طباعت، ہر اعتبار سے ناقص ہے۔ اپنے ترجمہ پر نظر ثانی کے دوران ہم نے بعض مقامات پر اس سے استفادہ کرنا چاہا تو غلط ترجمانی کی متعدد مثالیں سامنے آئیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ ۸۴ھ ہے۔ پہلا ایڈیشن غالباً ۸۹ھ میں شائع ہوا ہے اور اس کے بعد سے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پانچواں ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں بہت سی اہم ترمیمات اور اضافے مصنف نے دوسرے ہی ایڈیشن میں کر دیے تھے۔ لیکن نظر ثانی کا عمل اس کے بعد بھی جاری رہا اور پانچویں ایڈیشن میں بھی بہت سے اہم حذف و اضافے پائے جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس کتاب کے ابتدائی ایڈیشنوں کا مطالعہ کیا ہے ان کے لیے یہ امر دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس حذف و ترمیم کا اثر زیادہ تر کتاب کے ن صفحات پر پڑا ہے جن کا تعلق امیر معاویہ اور ہواست اور حضرت عثمان کے دور خلافت سے ہے۔ بہم بڑی مدت کے ساتھ یہ اطلاع بھی دینا چاہتے ہیں کہ متہجد کی درخواست پر مصنف نے آخری مطبوعہ (پانچویں) ایڈیشن کے بعض مقامات پر سچہ نظر ثانی کی ہے اور مزید ترمیمات کی ہیں۔ یہ ترمیمات تمام تراجم معاویہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے متعلق ہیں۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ اردو ترجمہ اردو ترجمہ ۵۳ء میں مدرسۃ الصلوات رائے میر میں شروع کیا گیا تھا اور ۵۵ء میں دہلی گڑھ میں مکمل ہو گیا تھا۔ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اس کے منظر عام پر آنے میں خاصی تاخیر ہو گئی۔ لیکن یہ تاخیر اس اعتبار سے بڑی بابرکت ثابت ہوئی کہ جس مصنف کی پے درپے نظر ثانی اور ترمیمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔

ساتویں اور آٹھویں باب میں مذہبی مہیوں کے اضافہ کے علاوہ ابواب اور ان کی ترتیب میں اصل کتاب سے کوئی انحراف نہیں کیا گیا ہے۔

نہ جیسا کہ طبع ثانی کے مقدمہ میں ملاحظہ کر دی گئی ہے موجودہ اردو ایڈیشن کتاب کے ساتویں اور آخری عربی ایڈیشن کے مطابق ہے۔

دورانِ ترجمہ میں نے ہر مسئلہ الٰہی و انسانی اور دنیاوی و دنیوی سے متعلق ہر مسئلہ میں نے ساری باتیں
 مولانا جلیل احسن ندوی صاحب سے خاصا استفادہ کیا ہے جس کے لیے میں بہت شکر گزار ہوں۔
 اے میں نے اس وقت جبکہ میں نے اس کتاب کی زبانِ معلومہ میں یہ باتیں لکھی ہیں کہ یہ کتاب
 قلم کاروں میں مقیم ہیں، مصنفین و محققین سے سب سے پہلے لکھی جائے گی۔ یہ کتاب معلومہ
 مصنفین کے لیے ہے جو ان کے قلم سے صاحب سے حدیث میں بڑی مددگار ثابت ہوگی۔ سب کے
 ذہن تیز ہیں۔ یہ کتاب سب سے پہلے لکھی جائے گی۔ یہ کتاب سب سے پہلے لکھی جائے گی۔
 یہ کتاب سب سے پہلے لکھی جائے گی۔ یہ کتاب سب سے پہلے لکھی جائے گی۔
 لکھے جس میں یہ بات بھی لکھی جائے گی کہ یہ کتاب سب سے پہلے لکھی جائے گی۔
 مولانا جلیل احسن ندوی صاحب سے استفادہ ہوا۔ اس سلسلہ میں ہر مسئلہ میں نے ساری باتیں
 قیمتی مشورے مختلف ماحول پر میرے مددگار رہے ہیں، اللہ ان تمام حضرات کو جزائے خود سے
 اور ان متعدد ساتھیوں کو بھی جن کی دلچسپی، مسرت و درخشاں ہے مجھے راسخاں دیا ہے۔
 سب سے زیادہ شکر ہے مجھے خود سنا، شہرِ مصب کا ڈکٹریٹ سب سے سب کے سب
 ترجمہ و فی مقدم کرتے ہوئے بڑی فائزہ دے رہا ہے۔ اس کتاب کی اجازت عطا فرمادے۔
 ان کی مشکلات دور کرے، راہِ حق کی معیتوں کو ان کے لیے آسان بنائے۔ اسلام اور مسلمانوں کو
 ان کی خدمات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ اور ان کی درباری خطافوں سے دیر
 کرتے ہوئے باری مغفرت فرمائے۔ آمین!

محمد نجات محمد مدنی

آفتاب پوسٹل، علی گڑھ

۴ مئی ۱۹۶۰ء

باب اول

مذہب اور سماج

اسلامی اور سنی نقطہ نظر کا موازنہ،

مذہب اور سماج اسلامی اور سچی نقطہ نظر کا موازنہ

کوئی صاحب دوست اس وقت تک قرض نہیں لیتا جب تک وہ خود اپنی پونجی کا جائزہ لے کر یہ نہ دیکھ لے کہ وہ کافی ہے یا نہیں۔ اسی طرح کوئی حکومت اپنے اسٹاک، خام پیداوار اور قدرتی وسائل کا جائزہ لے بغیر کوئی سامان نہیں درآمد کرتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا روحانیت کے خزانہ، فکر و نظر کے ذخیرہ اور طلب و خیر کی پونجی کو اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جتنی، شہیا، ضرورت اور سامان تجارت کو حاصل ہے؟ جواب ظاہر ہے۔ لیکن آج جن ممالک کو عالم اسلامی کہا جاتا ہے اس میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے روحانی خزانہ اور فکر کی طاقت کا کبھی دیکھے بغیر لوگ نظایات و اصول اور قوانین و دستور سب کچھ سات سمندر پار سے یا آہنی پردوں کے پیچھے سے درآمد کرنے کا ہنسلہ کر لیتے ہیں۔

لوگ اپنے سماج پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کا حال، بہت خراب نظر آتا ہے۔ ان کے سامنے ایک ایسی اجتماعی فضا ہے جس کو مدلل و انصاف سے دیکھا بھی واسطہ نہیں۔ پھر ان کی نگاہیں یورپ، امریکا، روس، چین اور یوگوسلاویہ کی طرف اٹھتی ہیں اور جس طرح وہ ان سے سامان معیشت درآمد کرتے ہیں۔ اسی طرح اپنی ان مشکلات کا حل بھی چاہتے ہیں۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ اشیاء ضرورت درآمد کرتے کرتے وقت تو وہ اپنے اندر دھتہ ذخیروں کا جائزہ لیتے ہیں، بازار میں موجودہ سامان کو دیکھتے ہیں اور

اپنی قوت پیداوار کا اندازہ لگاتے ہیں، لیکن بنیادی اصول، قوانین حکومت اور نظام زندگی اخذ کرتے وقت اپنے فکری خزانوں کا جائزہ لینے کی زحمت، سکل نہیں گوارا کرتے۔ ان کے حالات، ان کی تاریخ اور ان کی مادی، فکری اور روحانی قدریں سات سمندر پار بسنے والوں یا آہنی پردے کے پیچھے رہنے والی قوموں

کے حالات، رندوں سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں وہ جمہوری، اثر کی یا اشتراکی اصولوں کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل چاہنے میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے۔ وہ بہت آسانی سے اس کی بنا پر اپنی تمام روحانی مناسبات اور فرائض سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور اپنے مسائل کے ان حلوں کو بھی غور سے نہ کر دیتے ہیں جو ان کے لئے بہت دشوار ہوں۔ یہ غور کرنے سے مسائل آسکتے ہیں۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو یہ صدمہ ہی ہے، درحقیقت کبھی یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے حقیقی ورثہ ہیں لیکن انھوں نے ہی علیٰ زندگی سے سلام کوئی رشتہ کر رکھا ہے۔ یہ حدیث کے کلام میں سے خارج خوب نشیں ہے کہ زندگی بڑھ چکی ہے۔ ان کے معاملات میں دخل دے دینا ان کی مشکلات کا حل بن سکتا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ عام خیال کے بموجب یہ مندے اور صدمے درمیان ایک تعلق کا نام ہے اور نہیں۔ جہاں تک ساری تعلقات، جتنی ہی زندگی بڑھ کر زندگی کے عملی مسائل، امور صحت اور اقتصادانی معاملات کا سوال ہے۔ وہ ان کو ان میں کچھ دخل ہے اور نہ ان کو دین سے کوئی واسطہ ہے۔ یہ ان کا خیال ہے جو دین کے شکر نہیں رہے دوسرے خیال کے لوگ، تو وہ کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے ہیں کا ذکر ہی نہ کرو۔ مذہب تو ایک انبیوں ہے جسے ظاہر حکماں اور مایہ دار، محبت اس مایہ کو خوب غفلت میں مبتلا رکھنے درجے درجہ کاروں کے احساس، شعور کو مردہ اور ان کے ذہنوں کو مایہ کے لیے استغناء کرتے ہیں۔

اسلام کے مذہبی ورثہ کی تاریخ کے بارے میں ان کو سمجھنے میں انوکھی رائے کہاں سے اخذ کی؟ دوسری باتوں کی طرح اسے بھی انہوں نے سمجھ کر پار یا اپنی پرہیزگار کے پیچھے سے درمیان میں ہے۔ سب سے زیادہ تفریق دین و دنیا کا فساد تو شرع اسلام کی مبدیہ درجہ سے اسلام اس سے کبھی آشنا رہا۔ یہ خیال بھی اسلام کے زیر اثر نہیں پیدا ہوا اور دین احساس و شعور کے لیے موت کا بیج مہیا کرتا ہے۔ اسلام کے مہتمم سے یہ بات ذرا بھی مناسبت نہیں رکھتی لیکن یہ لوگ ان باتوں کو طویل کی طرف رٹ کر دیتے ہیں اور صدمہ کی طرح دوسروں کی نقل اتار دیتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کی رحمت کبھی نہیں گور کی کہ اس کی حقیقت معلوم کریں۔ اور دیکھیں کہ بات کہاں سے نکلی اور کس پر مبنی تھی ہے۔ آئیے اب ہم تحقیق کریں کہ یہ عجیب رائے کہاں سے اور کس طرح نکلی ہے۔

مسیحیت رومن اور یلیزم کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے۔ اس وقت یہودیت جو خدا کا شکار

ہو کر بے جان رمبوں اور کھوکھلے بے روح منطقیات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ رومن ایمپائر کے پاس اُس کے وہ مشہور قوانین تھے جو اب بھی جدید یورپ کے قوانین کا منبع ہیں۔ رومن سماج اپنی مخصوص سماجی قدریں و رُخود بنانا یا ہوا اجتماعی نظام رکھتا تھا۔ مسیحیت نے نہ تو اس کی ضرورت محسوس کی نہ وہ اس کی قدرت رکھتی تھی نہ غلبہ طبعی ہوئی رومن اسٹیٹ اور منصب رومن سماج کے لیے یک نیا نظام اور نئے قوانین و ضوابط تجویز کرے، تاہم سماج اور ریاست اس کی ہدایات کے سانچہ میں ڈھل سکیں۔ سائنس کیسویہ اور روحانی تزکیہ و تربیت اور جہان کی تہذیب و تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اس نے اسی کو زیادہ اندری تھی اور اس سے زیادہ ۱۰۰۰ء جو ابھی نہیں ملتی تھی۔ اس نے یہودیت کی جادہ رسوم اور اس کے بے رت منطقیات و تنقید کی اور مدد سے نیلی دنیا کو نہ نوید رکھ کر کے اُسے روت نازہ بخشنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منصفانہ روحانی و مادی علاقے سے بے نیازی اور صبر و تحمل کے سلسلہ میں مسیحیت نسبتاً کماں کو جو سنبھالی۔ اس نے انسان کی روحانی زندگی کے سببوں کے سلسلہ میں ۱۰۰۰ء سب کچھ دکھایا جو کسی مذہب کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس نے روت و وجدان کو بلند و پایہ عالی مقامی قلب و ضمیر کی تطہیر کی اور انسان کو خواہشات نفس پر اتنا قابو یافتہ بنا دیا کہ خدا و خیرت و نیوتی و در بات پر بھی غالب ہو کر ان کی عمل منہاں عالم خیال کی مقدس تمنائیں قرار پائیں۔ اس کی بناءً اس نے اجتماعی زندگی کو حکومت وقت کے حوالہ کر دیا کہ وہ اپنے سیکولر قوانین کے ذریعہ اس کی تنظیم عمل میں آئے۔ کیونکہ خود مسیحیت کی توجہ تمام تر قلب و ضمیر کی دنیا پر مرکوز تھی۔ اہل کلیسا نے مسیحیت کو جو مخصوص شغل و یدری تھی اور جس مخصوص فضا میں مسیحیت پروان چڑھی تھی اس کے ساتھ یہ پالیسی منطقی ربط رکھتی تھی۔ یہی طائفہ اس زمانہ میں اسرائیلی قوم کی ضروریات کے بھی مطابق تھا۔ جب مسیحیت اپنی سر شمل میں سمندر پار کر کے یورپ میں داخل ہوئی تو وہاں اُسے یونان کی صنم پرستانہ مادی تہذیب کی وارث رومن قوم ملی۔ یورپ کے دوسرے اطراف و جوانب میں اُسے ان قبائل سے ساتھ چڑا ہوا بھی تھے و حشت و بربریت کی زندگی سے نکلے تھے اور جن کے جھوٹے چھوٹے خدوں پر بسنے والی کمسن آبادیاں باہمی جنگ و جدال اور خونریزی میں مصروف تھیں۔ یہ مزاج کے سخت رکش تھے اور حرص و نجل کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایسے خطوں میں بسنے والوں کے لیے کچھ صدمہ بھی امن و چین کے ساتھ گزارنا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ہتھیار رکھ دینا

اقتدار کے مسئلہ پر تھی۔

یہ ہے اصل صورت حال اور کہہ بیگ کہ دین اہل اقتدار اور مذہبی طبقات کے ہاتھ میں

عوام الناس کو مغدوب رکھنے کے لیے ایک آئے کار ہے۔ صرف سمجھے کہ یورپ و روس کے یہاں دین کی پوزیشن یہی تھی۔

جرج یک مقدس انتھارچی بن کر انہوں کی دنیا اور آخرت دونوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ وہ پورا

مفہمت ہیئت، رز بین محدودی نہایت کرتا۔ عوام کے جذبات و احساسات اور ان کے افکار و خیالات دونوں پر وہ یکساں چپ یا رہا۔ اس کی پشت پر وہ وہ تحقیقاتی عدالتیں نہیں جو یہ اس شخص کو تسلیم نہیں

یا آگ میں جلا دیتیں جو ذرا بھی راتھتا، یہ جس یراح دو کچے رونی کی نہمت سکا دی حالتی، نشہ قائم یہ تک یہی حال رہا، مگر یہ دور آیا تو چرچ کو بھی دیا گیا، رونی کی صدیاں کدر جانے کے بعد اب انکیں

کھل رہی ہیں اور سوائے جوئے جذبات انکڑا یں سے رہت ہیں۔ جدید فکر اور زندگی سے تہہ احمق رکھنے والے سائنس کے سامنے اتنی آسانی سے اپنے حلیہ سے دست بردار ہو جانے پر چرچ کو بھی گور نہ تھا چنانچہ

وہ جرأت مندوں کی زبان بند کر کے اور قدیم و قدسودہ نظریات کے حق لفظ سے خیالات کو مٹا دینے پر نکل گیا۔ اسی دن سے آزادی فکر اور حریت کے درمیان شدید فزائت چلی آ رہی ہے۔ چرچ نے نو مسیحیت

کی طرحت دین پر قانع ہو سکا، مذہبیائیت کی طرحت صرف آخرت کے بارے میں۔ مگر چرچ نے پر اکتفا کر سکا۔ زمین و آسمان اور مذہب کے بارے میں چرچ کے نظریات سائنس کے ان نظریات سے

مٹائے جو کلیسا کے مقرر کردہ طریقہ تحقیق سے آزاد تھے خود یہ طریقہ تحقیق بھی، بعض اسان سہ پر ہی مبنی تھا اور اسے بنیادی طور پر دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یوں اور مشرمن کی کئی کئی پشیمیں ایسی پیدا

ہوئیں جو چرچ کو نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں اور ان کے دلی میں علمبرداران مذہب سے سخت دشمنی اور نفرت کے جذبات موجزن تھے۔

یہاں سے یورپ کی زندگی میں مذہب اور سائنس، اور چرچ اور فکر و نظر کے درمیان کش

کا آغاز ہوتا ہے۔

لیکن ہم سے ان باتوں کا کیا تعلق، جب کہ ہماری تاریخ اور اسلام کا مزاج دونوں اس طرح کی باتوں سے کوسوں دور رہے ہیں۔ اسلام ایک آزاد ملک میں پروان چڑھا، جس پر کسی شہنشاہ یا کسی امپائر کا تسلط نہیں تھا۔ اس کی نشوونما ایک قبائلی بدوی معاشرہ میں ہوئی جس میں روشن رہنمائی کی طرح کے قوانین اور ادارے نہیں پائے جاتے تھے۔ یہ اس دین کی ابتدائی نشوونما کے لیے سزاوارتہ ترین حالات تھے، کیوں کہ اسے بلا کسی حقیقی رکاوٹ کے وہ معاشرہ برپا کرنے کا موقع ملا جو یہ قہر کرنا چاہتا تھا۔ اس معاشرہ کی تنظیم کے لیے قانون سازی اور اس کی نشوونما ارتقاء کے لیے مختلف تدبیر کو رو بکار لانا یہ سب پوری طرح اس کے ہاتھ میں رہا۔ اس کو اس بات کا موقع ملا کہ انسان کے قلب اور ضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر بیک وقت چھایا رہے اور اپنی قانون سازی اور ہدایات میں دین و دنیا دونوں کو سامنے رکھے۔ چنانچہ اسلام نے انسان کے عالم نفسی میں ارضی و سماوی دونوں جہانوں کو جمع کر دیا۔ وہ فرد کے ضمیر اور جماعت کی غلی زندگی دونوں کی روح رواں بن کر رہا۔ اس کے نظام میں عملی سرگرمیاں کبھی بھی اس دینی حس سے جدا نہیں ہوئیں جو برائیوں کے خلاف سب سے بڑی روک ہے۔ چاہے وہ کتنے کتنے روپ دھارے اور اچھوتے ہیں، یہ میں سامنے آتے لیکن اس کا اصل جوہر ہمیشہ اپنی صحیح شکل میں باقی رہتا ہے اور کبھی رنگ نہیں بدلتا۔

اسلام جس کا اولین کام پوری انسانی زندگی کی ایک جدید تشکیل ہے، عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر وجدان میں گوشہ گیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح وہ اپنے تاریخی ارتقاء میں بھی ایک لمحہ کے لیے اس پر نہیں مجبور ہوا کہ کسی بادشاہ یا سامراج کے خوف سے پند و نثر عمل محدود کر لے۔ وہ ہمیشہ اپنا فرمان روا آپ رہا۔ یہاں تک کہ اس دور میں بھی جب جاہلیت عرب اس سے نبرد آزما تھی۔ کیونکہ یہ جاہلیت گہری جڑیں رکھنے والی سماجی روایات اور اس طرحت کے مستحکم جمعی نظام سے محروم تھی جس طرح کے اجتماعی نظام سے مسیحیت کو اپنے ابتدائی دور میں سابقہ پڑا تھا۔ اسلام کا میدان عمل پوری انسانی زندگی ہے۔ روحانی بھی اور مادی بھی، دینی بھی اور دنیوی بھی۔ وہ موزوں ترین نصاب میں پروان چڑھا اور اُسے اپنے مزاج کا پوری طرح مظاہرہ کرنے کا موقع ملا۔ درپیلے ہی دن سے اس کی حقیقت کو عمل کے جامہ میں دکھایا گیا۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغام بردار کے سپرد کرنی چاہیے۔ اس دین کے لیے جسے آخر زمانہ تک رہنا ہے۔ اللہ کی تقدیر یہ ہوئی کہ روز ازل

ہی سے بغیر کسی رکاوٹ کے پوری طرح، فزہوتا کر آنے والی نسلوں کے لیے اس کی مکمل تصویر بغیر کسی آمیزش اور ابہام کے باقی رہے۔

سائنس کے کثرت پرستی میں یہ صحیح نتائج برقرار نہیں رکھ سکتا خواہ اس سائنس کے اعداد ایسے "مسلمات" ہی کیوں نہ ہوں جو اپنے بنیادی، فنکارانہ و عقلی نوعی نظام میں اسلام کو حکم دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے اسلامی معاشرہ کے نتیجہاتی فائدہ و فوہ میں سے، رکھی ہو اور وہ ان کے اہم ترین مصلحت سے غافل رہ گئے ہیں ان کا سامنا ہی اسلامی سائنس میں تو دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر سہم ہی ہے کہ بند کثرت کے دائرہ کی ہو اور جو بیت کی ہذا مصلحت وہ اسی کے لیے نہیں سمجھتی جو یہاں مسیحا کے سلسلہ جنسیل سے بیان کیا جائے گا، ان مصلحت میں تو ہیں مصلحت ماضی ہے :

لَا تُرْكَ رِيَاضُوتُ حَتَّىٰ تُحْكَمُوا نِيْمَاتُكُمْ نِيْمَاتُكُمْ لَا يَجْدُو
فِي الْعُسْرِ حَرْبٌ مَّقَادِمُهَا وَتَسْتَبِيحُوا نَسِيْمَهَا

ابن جریر، ۱۶۵

ہیں، سہم کے رب کی قسم جو بھی مصلحت میں ہیں جو سکتے ہیں
تک۔ یعنی، یہی حقائق ہیں کہ کو فیصد کرنے، نہ مصلحت میں، یہ جو کچھ فیصد
کے اس پر پے دوں میں کون کسے نہ محسوس کریں ورنہ سہم کریں :
وَمَا أَسْأَلُ الرَّسُوْلَ بِعَهْدِهِ وَوَعْدِهِمْ غَلْفًا وَهَوًّا ج
(حشر: ۷)

جو یہ تو کورسوں دے دے، ورنہ میں سہم کے بھی وہ روکے رکھ جائے :
وَمَنْ لَمْ يُحْكَمْ لِمَا أَمَرَ اللّٰهُ فَاذْكُفْ لَكُمْ هُمُ الْكُفْرُوت (مائدا: ۴۴)
جو لوگ اللہ کے امر کردہ قورس کے مطابق فیصد نہ کریں وہی کافر ہیں :

یہ سہم ہی ہیں جو جہ فیصد کن رہی ہے وہ اس میں کاپک : قابل تقسیم کائی
ہونا ہے، اس کے مصلحت و مصلحت، اس کے قوانین اور اس کی ہدایات، سب میں ایک گل بناتے
ہو، قابل تجرہ ہے یہ سہم مصلحت و مصلحت اور مقاصد کے اعتبار سے معاملات زندگی اور

نظام حیات سے مجدا نہیں۔ چنانچہ نماز جو اہم ترین عبادات میں سے ہے، جہاں اس کا منشاء یہ ہے کہ ذہن و جماعت دونوں ایک صاحب قدرت و جبروت الہ کی طرف متوجہ ہوں، صرف اسی کے آگے سب کی گردنیں جھکیں اور یکسو ہو کر ہر طرح کی کجی اور بے راہ روی سے بچتے ہوئے سب ایک ہی قبلہ کی طرف متوجہ ہوں، وہیں ایک طرح کی مساوات اور ایک بڑا دھڑا کا اختیار رکھنے والی مستی کی نظر میں برابری کا احساس دریا بھی اس کا منشاء ہے۔ سب اس کے بندے ہیں اور سب اس کے آگے برابر ہیں۔ لا الہ الا اللہ کا اہم ترین عقیدہ بھی ضمیر انسانی کو بندوں کی بندگی کے بہ شائبہ سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی آزاد فی ضمیر ایک صالح اور پاکیزہ سماج کی تعمیر میں پہلا قدم ہے، ایسا سماج جس میں سب کا درجہ مساوی ہو۔

اس دین کا مطالعہ کرنے والے کو اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اجتماعیت اس کے مذہبی آداب و مراسم اور نظام زندگی دونوں میں سے ایت کیے ہوئے ہے، یہ ایک طاقتور بنیادی فکر بن کر اس کے پورے نظام میں جاری و ساری ہے۔ اب اگر کسی دور میں دگ عبادات کے پہلو پر زیادہ زور دینے لگیں اور دین کو اجتماعی زندگی سے یا اجتماعی زندگی کو دین سے کاٹ کر علیحدہ کرنا چاہیں تو یہ اس دور کی آفت ہے نہ کہ اس دین کی کمزوری۔

سلام کے بارے میں ہماری یہ رائے بنی گھڑی ہوئی نہیں اور نہ یہ کوئی نئی تاویل ہے۔ یہ دینی مدامت و راستی طرح سے پیش کیا جا رہا ہے جس طرح کہ اس کے آداب و مراسم میں ہمیشہ سے طلبہ و مسلم نے سمجھا اور سمجھایا تھا۔ اسلام کے اصل منبع سے قریب رہنے والے محققین نے یہ کرامت بھی پہنچا تھا۔

۱۔ اسلام میں عبادت شعائر مذہبی، قوانین اور قبلہ انسانی سرگرمیاں اور اعمال یہ حاوی ہے۔ لیکن فقہ کی کتابوں میں، عبادات، کی اصطلاح مذہبی شعائر سے متعلق حکام کے لیے استعمال ہونے لگی اور معاملات، کی اصطلاح دوسرے قوانین و حکام کے لیے، جب کہ اسلام ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ ملاحظہ ہو ہماری کتاب ”خصائص التصور الاسلامی و مقوماتہ“ کا باب ”الشمول“۔

قرآن کریم فرماتا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا دُخِيَ مَسْجِدُكُمْ فَاتَّخِذُوا جُمُعَةً
وَأَسْمِعُوا نِدَاءَ دُخْرِهِمْ وَأَسْمِعُوا دُخْرَهُمْ وَاسْمِعُوا دُخْرَهُمْ
وَأَسْمِعُوا دُخْرَهُمْ وَأَسْمِعُوا دُخْرَهُمْ وَأَسْمِعُوا دُخْرَهُمْ
وَأَسْمِعُوا دُخْرَهُمْ وَأَسْمِعُوا دُخْرَهُمْ (البقرہ: ۱۷۰-۱۷۱)

اے ایمان والے! جب تم کو مسجد میں جمعہ کی دعا پڑھانی جائے تو
کاروبار ترک کر کے اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو۔ یہ تمہارے لیے بہت ہی
بہتر ہے کہ تم اپنی علم رکھتے ہو۔ جب نماز ہو جائے تو زمین میں بیٹھیں جو اللہ
کا فضل ان میں بکریں گے۔

پتھنص جانتا ہے کہ فرض نماز دن بھر میں کتنی وقفہ ہے۔ اس کے بعد جو وقت بچتا ہے
وہ دن، رات اور رات میں بہت ہی کم ہے۔ پوری زندگی میں نماز کتنی ہوتی ہے وہ وقت
بہت کم ہے۔ رات کے پتھنص سر پہی وقت صحت و عمل زندگی کے کچھ شے چاہئے کہ یہ حلالی ہیں۔
قرآن ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے:

وَجَعَلْنَا الْفَيْلَ لِبِئْسَ أَهْلٍ وَجَعَلْنَا الشَّاهِدَ عَسَا ۝
(النبا: ۱۰-۱۱)

”ہم نے فیل کو پرہیزگار اور نیک کو مفسد کا موقع قرار دیا۔“

اس کے بعد میں زیادہ تر وقت معاش میں صرف ہوتا ہے کہ فرض عبادت میں
اس میں عبادت میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں
ہون کی ثابت ہو رہی ساری سرگرمیوں کے ساتھ خود ہی کی طرف متوجہ ہو۔ چنانچہ ہر اجتماع
خدمت اور بہت کام عبادت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

السَّامِعُ عَلَى الْأَرْضِ وَالْمُسْكِينُ كَالْمُحِي هُدًى سَبِيلِ اللَّهِ ۝
الْقَائِمُ الْيَلِ الْعَالَمِ الْمَصَارِ (مسلم، بخاری، ترمذی)

”غریبوں اور بیواؤں کی خدمت کرنے والا ایسی درجہ رکھتا ہے جو اللہ کی راہ

میں جہاد کرنے والے کا یا رات بھر نما پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے والے کا ہے۔

اسلام کی روح صاحبِ اسلام — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — کے فہم کے مطابق

کیا تھی، ذیل کے دو واقعے اس طرف رہنمائی کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد سفر میں تھے۔ کچھ لوگ روزہ سے تھے۔ اور کچھ لوگ روزہ سے نہیں تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ”اس سال میں ہم نے ایک سخت گرمی والے دن ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہم میں سے سب سے زیادہ سایہ اُس کو میسر تھا جس کے پاس چادر تھی۔ ورنہ بعض لوگ تو ہاتھوں ہی کے ذریعہ دھوپ سے بچاؤ کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ وہ کہتے ہیں کہ ”اب روزہ دار لوگ تو آرام کرنے لگے اور جو روزہ سے نہیں تھے انہوں نے اٹھ کر خیمے نصب کیے اور سواری کے جانوروں کو پانی پلایا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”آج سارا جہاد لوگ لے گئے جو روزہ سے نہیں تھے۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ تین آدمی زواجِ مطہرات کے گم ہو جانے پر اُن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت گزاروں کا حال معلوم کرنے آئے۔ جب انہیں سورتِ حار بتائی گئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اس کو اپنے اندازہ سے بہت کم پایا۔ وہ بولے: ”کہاں؟“ کہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ کے تو اگلے اور پچھلے سارے گناہ معاف کیے جاتے ہیں۔“ ایک نے کہا: ”میں تو راتیں نماز میں گزاروں گا۔“ ”دو راتوں میں مسلسل روزے رکھوں گا۔“ اور کبھی ”میں نہیں کھڑنگا۔“ ”تیسے صاحب نے کہا: ”میں عورتوں سے لگ تھلگ رہوں گا۔ اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔“ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف تشریف لائے اور فرمایا: ”تم ہی لوگ جو دنیویوں نے ایسا ایسا خیال ظاہر کیا ہے۔ خدا کی قسم! میں تقویٰ اور اللہ سے ڈرنے کے معاملہ میں تم سے کہیں آگے ہوں، لیکن میں روزے کی رکھتا ہوں اور بغیر روزے بھی کچھ دن گزارتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اب جو شخص میری سنت سے علیحدہ کوئی روش اختیار کرے اس کو مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔“

۱۔ یہ حدیث صحاح ستہ سے منقول ہے۔

۲۔ مسلم۔ بخاری۔ نسائی۔

”اللہ نے تجھے جو کچھ عطا کیا ہے اس کے ذریعہ آخرت (کی بھلائی) طلب کر اور دنیا میں سے تیرا جو حصہ ہے اس سے بھی غافل نہ ہو۔“

وَلَوْ دَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ مَّا كَانَتْ تَوَاصِعٌ
وَبِيعَ وَضَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۝
(الحج ۱۰۰)

”اللہ اگر بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ہاتھوں میں اتنا نہ رہتا تو صومعے، معابد اور مسجد بن جن میں اللہ کا خوب ذکر ہوتا ہے سب ڈھا دیے گئے ہوتے۔“
ثُمَّ تَلَوْا فِي سَنَةِ اللَّهِ الْبَنِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ (البقرہ ۱۹۰)

۱۷ اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ سگرز یاد دہانی نہ کرو امتدہا دق کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآمَنَ بِمَا أُتِيَ مِنَ الْكِتَابِ وَآتَىٰ ذِكْرًا مِّنْهُ مَالًا مِّنْ قُرْبَىٰ وَأَتَىٰ ذِكْرًا مِّنْهُ مَالًا مِّنْ قُرْبَىٰ وَأَتَىٰ ذِكْرًا مِّنْهُ مَالًا مِّنْ قُرْبَىٰ وَأَتَىٰ ذِكْرًا مِّنْهُ مَالًا مِّنْ قُرْبَىٰ
وَالشَّابُّونَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَآقَاةَ الضُّفُوفِ ۚ وَآتَىٰ الزَّكَاةَ
وَالْمُؤَفَّقُونَ بَعْضُهُمْ إِذَا عَصَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ
وَالضَّرَاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۚ (البقرہ ۱۷۷)

”نیکو یہ ہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر کو، ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے ماننے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند میں رشتہ داروں اور یتیموں پر مسکینوں اور مسافروں پر مدد کے لیے ہاتھ پھیلائے والوں پر اور غلاموں کی ربائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے، نیک لوگ وہ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و

کہ ان کے سلسلہ میں ان کو کش مکش کرنی پڑی۔ یہاں سیکولر اقتدار اور مذہبی و روحانی اقتدار کی ایسی تقسیم نہیں جس کے باعث کش مکش کی نوبت آئے جیسا کہ پاپاؤں اور بادشاہوں کے درمیان ہوتا رہا ہے۔

اسلام نہ تو علم کا دشمن ہے نہ علماء کا بلکہ معرفت خداوندی کی طرف سے جانے والے ہر علم کو اور ہر صحیح علم اسی مقصد کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک مقدس فریضہ قرار دے کر دینی کام بنادیتا ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ۔ (ابن ماجہ)

”علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔“

مَنْ سَلَكَ سَبِيلًا يَطْلُبُ فِيهِ عِلْمًا سَقَرَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًا
إِلَى الْجَنَّةِ۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)۔

”جس نے طلب علم کی خاطر کوئی راستہ طے کیا۔ اللہ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کرے گا۔“

تاریخ اسلامی اپنی تکرر و تکرر پر اس طرح کے منظم اور نامعقول مظالم اور سخت سزاؤں سے بھی آشنہ ہے جو یورپ کی تحقیقاتی عدالتوں Inquisition کا شعار رہا ہے۔ ایسے واقعات کہ کچھ ازاں کو ان کے مخصوص فکر کی بنا پر سزا دی گئی ہے اسلامی تاریخ میں معدودے چند ہیں۔ اور وہ بھی اتفاقات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کثرت و بیشمار واقعات کا کوئی خاص سیاسی پس منظر رہا ہے۔ کسی گروہی تعصب یا نزاع نے ان کو جنم دیا ہے۔ اسلامی زندگی کے عام مزاج سے یہ بات ہمیشہ دور رہی ہے اور ایسے افراد اس کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو اسلام کا صحیح فہم بھی حاصل نہیں تھا۔

جس دین نے صرف معجزات و خوارق پر نہ بھروسہ کر لیا ہو اور جو بعض غیب کی باتوں پر نہ قائم ہو بلکہ کائنات میں چار سو کبھری ہوئی آیات کے مشابہہ اور ان پر غور و فکر کو اپنی اساس قرار دیتا ہو۔ اس سے اسی مزاج کی توقع کی جاسکتی تھی۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْخِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

وَالْعُلُكُ تُنْفِى سَحَابٌ فِي الْبَحْرِ مَعًا مَتَّعَ الْبَاقِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنَ
الْسَّمَاءِ مِنْ قَدْ وَرَدَ خَلْقًا بِلَدِ الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِ صَوْتِهَا دَبَّتْ بَيْنَهَا مِنْ كُلِّ
وَأَقْبَدَتْ مَصْرُوفٌ تَرْتَجِى سَحَابٌ مَسْقُوفٌ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ
لَا يَأْتِ لِقَاؤُهُمْ يُعْقِلُونَ ۝ (البقرة: ۱۶۴)

جو وگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی سائنس میں،
رت اور دن کے پیچیدہ کام کے بعد آسمانوں میں ان کشتیوں میں جو
انسان کے نفع کی چیزیں لیے جوئے دریاؤں درمندرہا میں جیتق پھرتے ہیں
بارش کے اس پانی میں جسے اللہ دیر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ زمین کو
زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق
کو پھیلاتا ہے۔ ہر قسم کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے
درمیان، بے زمان بنا کر رکھے گئے ہیں یہ سرشت نیاں ہیں:

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ، يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ، يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ،
بَعْدَ مَا هُوَ كَذَلِكَ زُجْرًا ۝ ۱۰ مِنْ أَيْنَ أَنْ خَلَقَ مِنْ
تَابَ نَحْنُ أَهْلُ الْفَتْحِ لَسَرُ نَسْتَوْفِى ۝ ۱۱ مِنْ أَيْنَ أَنْ خَلَقَ
مِنْ الْفُتُكُ أَنْ أَحَالَ تَسْلُكُ الْآلِهَاءِ وَحَدَّ يَلِينُكَ مَدَّ ذَاةَ جَلَّ
أَنْ لِي ذَلِكَ لِأَنْبِ لَعَنَ مَقْصَدٌ ۝ ۱۲ مِنْ أَيْنَ أَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَ
الْأَرْضِ وَأَحْلَاكَ السُّنَنُ ۝ ۱۳ أَنْ لِي ذَلِكَ لِأَنْبِ
لِلْعَالَمِينَ ۝ ۱۴ مِنْ أَيْنَ مَنْ مَنَّا صُكُّ مَسْلِي وَالتَّهَادِ وَأَبْقَى كَمَقِينُ
فَضْلِهِ ۝ ۱۵ أَنْ لِي ذَلِكَ لِأَنْبِ لَعَنَ مَقْصَدٌ ۝ ۱۶ مِنْ أَيْنَ أَنْ خَلَقَ الْوَرَقَ
خَوَافًا وَطَمَعًا وَيَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُخْرِجُ بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْنِهَا
أَنْ لِي ذَلِكَ لِأَنْبِ لَعَنَ مَقْصَدٌ ۝ (الرود: ۱ تا ۱۶)

”وہ مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے، و زمین کو مردہ (خشک
اور بیکار) ہو جانے کے بعد از سر نو زندگی بخشتا ہے اسی طرح تم بھی (دوبارہ) نکلتے

جاؤ گے۔ اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر تم ہر
 چار طرف پھیلے ہوئے انسان بن گئے۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ
 تمہارے لیے تمہاری ہی طرح کے جوڑے بنا دیے تاکہ ان کے پاس جا کر سکون حاصل
 کر سکو۔ نیز اس نے تمہارے درمیان (فطری طور پر) محبت اور رشتہ رکھا۔ ان
 باتوں میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں۔ آسمانوں اور زمینوں
 کی تخلیق اور تمہارے رنگوں اور تمہاری بولیوں کا ذوق بھی اسی کی (قدرت کی)
 نشانی ہے۔ سوچنے سمجھنے والوں کے لیے ان باتوں میں کافی اشارے موجود ہیں۔ تمہارا
 رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل کی تلاش کرنا بھی اس کی ایک نشانی ہے
 ان باتوں میں مینے والوں کے لیے متعدد علامتیں موجود ہیں۔ اسی کی ایک نشانی
 یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں بجلی دکھاتا۔ خوف درامید (کے ملے جلے جذبات)
 کے ساتھ دیکھتے ہو۔ وہی آسمان سے پانی تارتا ہے اور اس سے زمین کو زندہ کرتا
 ہے بعد اس کے کہ اس پر مردنی چھا چکی تھی۔ ان چیزوں میں کچھ بوجھ رکھنے والوں کے
 لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں۔“

ایک ایسے دین کی پالیسی یہی ہو سکتی تھی جو علم اور تقویٰ کے درمیان علت اور معلول کا رشتہ
 بتاتا ہو اور علم کو معرفت خداوندی اور خشیتِ الہی کا ذریعہ قرار دیتا ہو۔

۱۲ نَحْمَدُكَ اللَّهُ مِنْ عِبَادِكَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (فاطر ۱۶۸)

”اللہ سے کما حقہ خشیت اس کے بندوں میں سے اصحابِ علم ہی کرتے ہیں۔“
 جو اہل علم کو جاہلوں سے بزرگوار کرتا ہو۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (زمر ۹۱)
 ”کہو کیا اہل علم اور علم سے بے بہہ لوگ برابر ہو سکتے ہیں۔“

فضل العالم علی العابد کفضل القمر علی سائر النواجب۔

(ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابنِ جبان۔ بیہقی)۔

”صاحبِ علم کا مرتبہ عبادت گزار سے اتنا ہی بلند ہے جتنا چاند کا (دوسرے ستاروں سے)۔“

بد اسلام اور اس عرصہ کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں جو کائنات اور نفس انسانی میں قدر کی نشانیوں کے مطالعہ کی راہ سے معرفت حق کی طرف لے جاتا ہو۔ سلام کے مابقی اس کی علمی تاریخ میں دین اور ایسے علم کے درمیان اس بات کی دشمنی نہیں پائی جیسی کہ نتائج ثانویہ اور اس کے بعد کے زمانہ میں پرت اور اہل سائنس کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔

وہی بات کہ دینی طبقات نے ارباب اقتدار اور اہل دولت کا ساتھ دیا اور غیبی مکتب عوام کو خاموش کرنے اور فاضل رکھنے کے لیے مذہب کو تاریک بنایا تو اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی تاریخ کے بعض دور میں ایسا ہوا ہے۔ لیکن دین کی حقیقی روح ان لوگوں کو یہ موقف اختیار کرنے پر مامور کرتی ہے۔ مذہبی مفادات کی خاطر اللہ کی آیات کی اس نجات پر دیں ان کو سخت سزا اور دردناک مذہب کی دھمکی دیتا ہے۔ ان لوگوں کے پہلو پہ پہلو تاریخی ایک نکل دوسرے کے در کے حاملین دروں کو بھی سامنے دیتی ہے۔ کسی کی لعنت ملامت ان کو حق بات کے اعلان سے روک سکی۔ انھوں نے حق اللہ اور فخر و مساکین کے حقوق کی حمایت میں سرمایہ داروں اور ارباب اقتدار سے ٹکرائی۔ حق داروں میں یہ احساس بھرا کہ ان کو اپنے حق کے لیے جہاد جہد کرنی ہے اور اس کے نتیجہ میں حکومتوں کے علم و کسب کا نشانہ بنے۔ بسا اوقات تو ان کو سخت سزائیں بھی چھیلی تھیں اور جلا وطنی اختیار کرنی پڑی۔

اسلام کا مخصوص راجہ درمیان کی تاریخ دونوں میں سے کوئی بھی اس میں کو سماج سے علیحدہ رکھنے کے لیے کوئی وجہ جو زائد نہیں کرتا۔ یہاں اس سبب میں سے کوئی سبب بھی موجود نہیں جو یورپ میں مسیحیت سے وابستہ ہو گئے اور ان کے نتیجہ میں مسیحیت نے دین کو دنیا سے تارہ کش

۱۔ ہم دینی طبقات (رجال الدین) اور علماء دین کو دو الگ الگ اصطلاحیں سمجھتے ہیں بعض اور میں رباب اقتدار کو شمس کرتے ہیں کہ اسلام میں ایک مخصوص دینی ادارہ قائم کر کے ایسے خفائق کو توڑ دے کہ پیش کرنے اور ارباب اقتدار کے حق میں فتویٰ دینے نیز ان کے افعال و اقوال اور ان طریقوں کی تائید کرانے کے لیے استعمال کریں جن کی دین میں کوئی سند نہیں۔ یہ ادارے کلیسا کے

طبقة کی Ecclesiastic

مانند ہیں جن کا اسلام میں کوئی مقام نہیں۔

کر لیا۔ دین کو صفائے باطن اور تطہیر نفس تک محدود رکھا اور سماجی زندگی کی ہلک ڈور خود ساختہ قوانین کے حوالہ کر دی۔ اس طرح کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی طریقہ کار اور شریعت اسلامی کے دائرہ میں رہتے ہوئے، سڈا اور اجتماعی عدل کے قیام کی جدوجہد میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔

عیسائیت اور اشتراکیت کی کش مکش میں ایسے اسباب ضرور کار فرما تھے۔ مگر اسلام تو خود اجتماعی عدل کے لیے اصول و ضوابط تجویز کرتا ہے، مال داروں کی دولت میں فقراء کا حق متعین کرتا ہے اور حکومت و اقتصاد کے لیے عدل و انصاف پر مبنی نئی مڈینا ہے۔ نہ اس نے عوام کو پنک میں مبتلا کیا۔ اور نہ انھیں تعلیم دی کہ دنیا میں اپنے حقوق سے دست بردار ہو کر صرف عقبی میں ان کی بازیافت کے متوقع رہیں۔ برعکس اس کے اسلام نے اپنے فطری حقوق سے یوں ہی دست بردار ہو جانے والوں کو، خواہ وہ کسی دباؤ کے تحت ہی ایسا کریں، آخرت میں عذاب شدید کی دھمکی دی اور آپ اپنے اوپر ظلم کرنے والے قرار دیا۔

إِنَّ الدِّينَ تَوْفِيقُ الْمَلَكِ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ
قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ أَرْضَ اللَّهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَإِنَّا لَهُ لَنَخضع
فَتَهَاجَرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَا أَوْفَقُوا لَكُمْ جَمْعُهُمْ وَنَسَاءُ مَصَائِرُ
(نساء: ۹۷)

”جو لوگ اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو اُن سے پوچھا کہ تم یہ کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یہ وہ دگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔“

ایسے لوگوں کو وہ اپنے حقوق کے لیے جنگ کرنے پر اکساتا ہے۔

مَنْ قُتِلَ دُونَ مَظْلَمَةٍ فَهُوَ شَهِيدٌ (سنائی)

”جو کوئی اپنے اوپر کیے جانے والے کسی ظلم سے بچاؤ کرتا ہو مارا جائے وہ شہید ہے۔“

اب اگر یورپ مذہب کو عملی زندگی سے دور رکھنے پر مجبور ہوا تو ہم کو اس معاملہ میں اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر اشتراکیت مزدوروں کے تحفظ کے لیے مذہب دشمنی

پر مجبور ہوئی تو ہم سے ضرورت سے بھی بے نیاز ہیں۔

لیکن محض وہ جس میں جیسے حضرات بھی شامل ہیں جو مسلم بن ہونے کا دعویٰ کرنے ہیں اور مسلمان ہیں، مگر کہتے ہیں کہتے ہیں کہ

اس کی کائنات اس کی حاکم کو سدا م نے ایک خاص دور میں قائم کیا تھا اس میں نشوونما کی اور نئے نئے مسائل سے مشابہت پیدا کرنے کی ضرورت تھی یا فی جانی ہے۔ کائنات قابل ہو سکتا ہے کہ بچ کے کک سے دور میں بھی کامیابی کے ساتھ میل سکے جبکہ دورینے حالات اور اپنی سماجی و درجے اعتبار سے سدا م کے ظہور و وجہ کے زمانہ سے بہت مختلف واقعہ ہوا ہے اور جو یہ دنیا کک سے دور کے سوالات کا جواب ہے۔ لیکن یہاں ہر حصہ رکے ساتھ چند باتیں پیش کریں گے۔

اسلام سے کائنات کا مذہب یہ جو طریقہ زندگی ہے جس نے اس کائنات کو اور اس میں جاری قوانین کو بنا یا ہے، جو اس میں ہونے والی تبدیلیوں اور رونما ہونے والے نئے حالات سے بخوبی واقف ہے۔ بنیادی تبدیلیاں اسے معلوم تھیں، اور یہ بھی معلوم تھا کہ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں معاشات و معیشت و نظریات و افکار کی دنیا میں کیا تبدیلیاں ہوں گی۔ اس نے بنیادی اصول متعین کر دیے ہیں و ایک اصول نکال کر دیا ہے۔ یہاں ان اصولوں کا طبعی انطباق تو بہت غایت زمانہ اور ضروریات مصالحت کے حوالہ ہے۔ یہ کام مقدرہ اصولوں اور متعین حدود کے اندر انجام پاتا رہے گا۔ جزئی اور تفصیلی قوانین زندگی کے صوف ان شعبوں کے لیے دیے گئے ہیں جو ان تبدیلیوں سے بنیادی طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ ان امور کی حد تک اسلامی قوانین ہر زمانہ اور ہر ماحول میں پوری افادیت اور موزونیت کے ساتھ قابل عمل رہتے ہیں۔ انی جامعیت اور لچک کے سبب اسلامی قوانین زمانہ کی ترقی کے ساتھ نمو اور تجدید کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس دین کے علماء قانون نے قیاس و تفریع اور قوانین کو عملی حالات پر منطبق کرنے کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت سماج پر اسلامی قوانین کی حکمرانی تھی در انہی فقہاء کی کوششوں کی بدولت اسلامی احکام سماج کے منت نے مسائل کا پوری طرح سہا دیتے رہے۔ پھر ایک طویل عرصہ تک یہ کام معطل رہا۔ چنانچہ فقہ اسلامی کا نشوونما اسی متفکر

رک گیا۔ اب اس صدی کے آغاز میں سارے عالم اسلامی میں زندگی کی نئی لہریں نمودار ہوئی ہیں اور ان کے پہلو بہ پہلو اسلامی قانون میں بھی از سر نو جان پیدا ہو رہی ہے۔

اس صورت حال کا علاج یہ نہیں کہ شریعت سے ماخوذ اسلامی قوانین کی تدوین کے چھوٹے موٹے سلسلہ کو از سر نو شروع کرنے سے قبل ہم فرانسیسی قوانین سے اپنی قانون سازی میں رہنمائی حاصل کرنے لگیں یا اشتراک کی نظریات سے اپنا اجتماعی نظام اخذ کر لیں۔ جن قوانین کی اساس پر ماضی میں ہماری سماجی زندگی قائم تھی۔ اب جدید سوسائٹی کی تشکیل و تعمیر میں ان کی صلاحیت و افادیت سے مایوس ہوئے بغیر مذہب کو محض عبادات تک محدود کر دینا بڑی زیادتی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ماحول کے لیے وہی نظام موزوں ہوتا ہے جس نے خود اسی ماحول کے اندر فطری طور پر ارتقاء کے مراحل طے کیے ہوں۔ کسی اجنبی ماحول کے نظام کو، جس نے اس مخصوص نظام میں ارتقاء کے فطری مراحل نہ طے کیے ہوں، لاکر اس پر مسلط کر دینا کبھی سازگار نہیں ہو سکتا۔ ہمارا دعوائے اسلام ہم سے جو

تقاضا کرتا ہے اس پر یہ باتیں مستزاد ہیں۔ اس دعویٰ کی بنیاد یہی تو ہے کہ ہم خدا کے واحد ہی کو الٰہ تسلیم کر کے اس کی بندگی اختیار کرتے ہیں۔ اللہ ہی کو الٰہ مان کر اس کی بندگی اختیار کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ اللہ کی شریعت کو حکمراں بنایا جائے۔ ایسا کرنا نہ صرف اس دین کی حقیقت سے ناواقف ہونے بلکہ خود انسانی زندگی اور انسانی سماج کی نفسیات سے جہالت کا ثبوت ہے یہ اندھی تقلید ہے تفریق دین و دنیا کے اس رُحمان کی، جو سراسر یورپ کا پروردہ ہے۔ یورپ والوں کے دین کا مزاج خود ان سے تفریق کا مطالبہ کرتا ہے جبکہ اسلام کا مزاج اس سے کوسوں دور ہے۔ اوپر ہم نے تاریخی تجزیہ کر کے واضح کیا ہے کہ ان کے یہاں مذہب و سائنس اور جرج اور اسٹیٹ کے درمیان کشمکش کیوں ہوئی، اور کس طرح اسلامی تاریخ کا حال اس سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ ان کی مخصوص تاریخ تھی جس نے اس رُحمان کو ختم دیا، ہمیں اس سے کیا واسطہ۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم فکری، روحانی اور سماجی طور پر انسانیت کے قافلہ سے کٹ جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، اسلام اس طرح کی کنارہ کشی کا بالکل قائل نہیں اور ہو بھی کس طرح سکتا ہے۔ جب وہ خود ایک عالم گیر پیغام کی حیثیت میں سامنے آتا ہے ہم صرف اس پر زور دینا چاہتے ہیں کہ کسی کی تقلید سے پہلے ہمیں خود اپنے سرمایہ کا جائزہ لے لینا

چاہیے۔ ہمیں اپنے اصول کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس بات کا صحیح اندازہ لگانا چاہیے کہ وہ زمانہ
 کا ساتھ دینے درحقیقت قابلِ عمل رہنے کی صلاحیت کس حد تک رکھتا ہے۔ ہماری روایات اور ہماری
 تاریخ کو اس بات کی ذمہ داری ہے کہ اس سے ذرا بھی مناسبت نہیں ہے۔ اس میں پھنس کر ہم اپنا امتیازی
 وجود کھو بیٹھیں گے۔ ہمیں مقصد بن کر انسانیت کے قہر میں پیچھے پیچھے چلنا ہو گا جبکہ ہمارے دین ہمیں آگے
 رہنے پر ابھارتا ہے!

كَلَّمْنَا خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ
 الْمُنْكَرِ ۚ وَالْعَرَبُ ۝ ۱۱۰

”دنیا میں تم ہی وہ بہتر قوم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں
 لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔“

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَ
 يَكُونَ التَّوْسُونَ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۝

۱۱۲۳

”اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنا دیا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں
 پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔“

یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ ہمارے ہی پاس وہ نسخہ شفا ہے جو اس آفت کی ماری مصیبت

اور خستہ حال دنیا کے درد کا درمان ہو سکتا ہے۔ جسے یہ روحانیت سے ماری مادی تہذیب
 پونہائی صدی کے فتنے سے، صدمہ میں دو عالم یہ جنگوں میں جھونک چکی ہے۔ جواب بھی اسی گمراہی
 میں مست ایک تیسری عالم یہ جنگ کی طرف بڑھ رہا ہے جس سے اس کا سارا تمدن برباد ہو جانے
 کا خطرہ ہے۔

باب دوم

اسلام

مسی

اجتماعی

عدل

کا

مزاج

اسلام میں اجتماعی عدل کا مزاج

اسلام میں اجتماعی عدل کے مزاج سے ہم صحیح طور پر اسی وقت آشنا ہو سکتے ہیں جب اُلُوہیت، کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اسلامی فکر کو اجمالی طور پر سمجھ لیں۔ کیونکہ اجتماعی عدل کا اسلامی نقطہ اسی اصول اور بنیادی فکر کی ایک ذرہ ہے جو اسلام کی تمام تعلیمات کا موجد و منبع ہے۔

اسلام کے پیش نظر پوری انسانی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا کام تھا، اس لیے نہ تو اس کی اصلاحی کوششیں اہل ثبوت رہیں اور نہ اس نے ہر مسئلہ کے لیے الگ الگ علاج تجویز کیے ہوں۔ اس کے پاس اُلُوہیت، کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ایک جامع تصور اور مکمل نقطہ ہے۔ اس کی تمام فروع اور جزئیات اس نقطہ سے نکلی ہیں۔ اس کے نظایا و قوانین، اس کی متعین کردہ حدود، اور عبادات، معاملات کے باب میں اس کی ہدایات بھی اس اصل سے کبھی ارباط رکھتی ہیں۔ اسی جامع اور مکمل فکر کی روشنی میں اس کی عملی پالیسی بھی بنتی ہے۔ یہ طریقہ اسلامی مزاج کے بالکل منافی ہے کہ ہر نئی صورت حال کے لیے ایک نئی اور آزاد پالیسی وضع کر لی جائے۔ جو دوسرے امور میں اختیار کی ہوئی پالیسی سے کوئی ربط نہ رکھتی ہو، یا ہر مسئلہ کے لیے علیحدہ حل تلاش کیے جائیں۔

اس بنیادی فکر کا صحیح فہم ایک محقق کے لیے اسلامی اصول و ضوابط کا سمجھنا آسان کر دیتا ہے اس کی روشنی میں وہ آسانی اسلام کے تفصیلی احکام کو اس کے اصولوں سے ہم آہنگ دیکھ سکتا ہے اسلامی طرز زندگی کا دل چسپی کے ساتھ گہرا مطالعہ بھی اس فہم کے بعد ہی ممکن ہے۔ اسی کے فیض سے محقق اس

نتیجہ تک یہ پتہ چلے گا کہ اسلام ایک ناقابلِ تفسیر کل ہے جس کا ہر جز دوسرے اجزاء سے مجسمے طور پر
مکمل ہے، اور حیات انسانی کے لیے یہ نظام اس وقت نفع بخش ہو سکتا ہے جب اسے یہ راہ چار
پنایا جائے۔

اسلام کا مفہوم لوگوں کے دلے کے لیے یک ترتیب ہے نہ کہ سیاست و اقتصاد اور فرد
اتحاد کے باہمی تعلقات کے ضمن میں اسلام کی تعلیمات کا مفہوم لوگوں کے لیے یہ ہے کہ انسانیت، حیات
حیات اور انسان کے بارے میں اسلام کا بنیادی فکر معلوم کر لے۔ اس لیے کہ یہ سب اصول انسانیت
ہیں جو اس بنیادی فکر سے نکلے ہیں۔ اس لیے بغیر ان کو پوری صحت اور حجم ان کے ساتھ سمجھا ہی نہیں
جاسکتا۔

حقیقی انسانیت ابنِ سنا، ابنِ رشد، فارابی، ابنِ عربیت دوسرے سے غلامی کے خیال
نہیں ملے گا جس کو بنیادی مفہوم اسلام کا نام ملتی ہے۔ ان کا فلسفہ یونان فلسفہ کا چرچا ہے جو
پہلی روایت کے اعتبار سے اسلام کے لیے بطلِ احسن واقع ہوا ہے۔ اسلام کے پاس یہ حقیقی اور
مکمل فکر موجود ہے جو اس کے فکری مآخذ قرآن و حدیث، رسول خدا کی سید پاک و رب کے درجہ
میں انہیں کہا جاسکتا ہے۔ اسلام کے جس بنیادی فکر سے اس کی بنیادی تعلیمات — بشکل نوامیس
عبادت اور معاملات — نکلتی ہیں۔ اس کو یا لینے کے لیے یہ مآخذ ہر باغِ نظر محقق کے لیے کافی ہیں۔
اسلام نے خالق اور مخلوق، انسان، حیات، اور کائنات، انسان اور اس کی اپنی ذات
فرد اور جماعت، فرد اور ریاست، بحیثیت مجموعی قوامِ انسانی اور موجودہ اور آئندہ نسلیں کے باہمی
تعلقات کی نوعیت اور مزاج سے بحث کی ہے۔ اس نے اس میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں اپنے
اصولی موقف اور تفصیلی نظریات کی بنیاد ایک جامع اور ہمہ گیر فکر پر رکھی ہے۔

اس بنیادی فکر پر تفصیلی گفتگو اس کتاب کا موضوع نہیں۔ یہ کام ”اسلامی فکر کی خصوصیات
اور اس کے اصول“ نامی ایک علیحدہ کتاب میں کیا گیا ہے۔ یہاں ہم صرف اصولی اور اہم باتوں کی
کی ذات اشارہ کریں گے تاکہ یہ اشارات اسلام میں اجتماعی عدل پر گفتگو کے لیے تمہید کا کام کر سکیں۔
انسانیت عرصہ دراز تک کائنات اور خالق کائنات، اور کائنات، حیات اور انسان کے
بارے میں کسی جامع تصور تک نہ پہنچ سکی۔

جب بھی اللہ کے یہاں سے کوئی پیغامبر اس کے پاس یہ تصور لے کر آیا، کچھ لوگوں نے اسے قبول کیا اور کثرت گوں اس سے روگرداں رہے، پھر ساری کی ساری انسانیت اس سے روگرداں ہو گئی اور ٹکڑے ہوئے جاوے تصورات کی طوفان چلی گئی۔ پھر اسلام کامل ترین تصور اور جامع ترین شریعت ایک ساتھ لے کر آیا اور اس نے ان دونوں بنیادوں پر زندگی کا نظام قائم کیا جو اس تصور اور اس شریعت کا عملی مظاہرہ تھا۔

جہاں تک خالق اور مخلوق، کائنات، حیات اور انسان کے مابین تعلق کا سوال ہے، اس کی اصل وہ ارادہ ہے جس سے بغیر کسی فصل اور واسطہ کے ساری مخلوقات پیدا ہوئی ہیں۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝

(یس: ۸۲)

”اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ”ہو جا“۔
بس وہ چیز ہو جاتی ہے۔“

خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی واسطہ مائل نہیں۔ نہ قوت کا واسطہ نہ مادہ کا بلکہ مخلوق اس کے ارادہ مطلق کے براہ راست نتیجہ کے طور پر بلا کسی تاخیر کے وجود میں آتی ہیں۔ اسی کے مطلق اور کامل ارادہ سے مخلوقات کا تحفظ، ان کا انتظام اور ان کی تدبیر وابستہ ہے۔

يَذَرُ الْأَرْضَ بِفَضْلِ الْآيَاتِ (الرعد: ۲۰)

”معاظلات کی تدبیر کرتا ہے۔ آیات کی تفصیل سامنے لاتا ہے۔“

يُسَبِّحُكَ الشَّمْسُ أَنَّ تَقُمْ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بَذَلًا -

(الحج: ۶۵)

”وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے۔ الایہ کہ اللہ کا اذن ہو جائے“

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ذِكْرٌ فِي ذَلِكَ يُسَبِّحُونَ - (یس: ۴۰)

”سورج کے بس میں نہیں کہ چاند کو پالنے نہ رات دن سے پہلے آ سکتی ہے، نہ ایک اپنے دائرہ کار میں رواں دواں ہے۔“

اس بادل کو آسمان میں جس طرت چاہتا ہے پھیلاتا ہے۔ وہ ان کو تہہ بہ تہہ رکھتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان سے مینہ نکلتا ہے۔ پھر جب وہ اس سے اپنے بندوں میں سے جنہیں چاہتا ہے نوازتا ہے تو وہ خوش خوش نظر آنے لگتے ہیں۔
ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر موجود شے کی ایک حکمت ہے جو مقصد کائنات سے ہم آہنگ ہے اور یہ کہ جو ارادہ کائنات کا موجود ہے اور جو پھر اس کی تنظیم و تدبیر اور دیگر بحال کرتا ہے وہی ارادہ ہر شے میں اس امر کی رعایت بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ وہ وجود شئی کے لیے نفع کلی کیسے ملے اور اس سے ہم آہنگ ہو۔

وجود چونکہ ایک ہی مطلق اور کامل ارادہ سے براہ راست صادر ہونے کے باعث ایک ایسی وحدت ہے جس کے اجزاء باہم مربوط ہیں۔ اس لیے وہ زندگی اور خاص طور پر زندگی کے اصلی ترین مظہر اخلاقی زندگی کے لیے سازگار اور موافق بلکہ مددگار اور معاون واقع ہوا ہے۔ چنانچہ کائنات نہ تو زندگی کی دشمن ہے نہ انسان کی۔ بالبلت سافہ کی اصطلاح میں "قدرت" انسان کی دشمن نہیں جو اس سے دست بگ بیاں رہے بلکہ وہ اللہ کی مخلوق اور انسان کی دوست ہے جس کے رجحانات زندگی اور انسان کے رجحانات کے مخالف نہیں۔ زندگی گزارنے والوں کا کام یہ نہیں کہ وہ قدرت سے نیچے آزمائی کریں۔ کیونکہ انہوں نے اسی کے آغوش میں پرورش پائی ہے اور وہ اور قدرت دونوں اسی کائنات سے تعلق رکھتے ہیں اور ساری کائنات ایک ہی ارادے سے صادر ہوئی ہے۔ انسان ایک مانوس اور موافق فضا میں ایسی موجودات کے درمیان رہتا ہے جو اس کی مناس و غمخوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب زمین بنائی تو

وَجَعَلْ فِيهَا رَوَاسِي مِّنْ تَّوْقِيَةٍ وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدَّرْ فِيهَا
أَنْوَارًا (رحم السجدہ: ۱۰)

”اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے۔ اس میں برکت ڈالی اور خوراکوں کا انہما کیا۔“

وَأَلْقَى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِي أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ۔ (نحل: ۱۵)

”اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے تاکہ وہ تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔“

وَالْأَرْضُ وَضَعَهَا لِلْأَنْعَامِ (الرحمن: ۱۰)

اور زمین اس نے مخلوق سے بنائی گئی۔

فَوَسَّعْنَا لَهُ سُبُحَاتِهَا وَجَنَّتْ لَهَا الْوُجُوهُ وَأَكْثَرْنَا مِنْ
أُولَئِكَ أَصْنَافًا

اور زمین نے اپنے لیے جس طرح کے پھول بنائے۔ اور ان کے لیے
اور اس کے لیے بہت سے اقسام بنائیں۔

حَقُّكَ مَا لِي أَرْضُ جَعَلْتَ فِيهَا

اور زمین کی ساری چیزیں تیرے لیے بنائیں۔

آسمان اپنے لیے جس طرح کے ستارے بنائے۔ اور اس کے لیے

بنائیں جو سہولت ہے۔ اس وقت کہ کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ کائنات کے دو حصے ہیں۔

وَلَقَدْ رَئَيْنَا الذُّنُوبَ بِمَصَاحِجِ الْمَلَكِ

اور ہم نے آسمانوں کو جہانوں سے آستین کیا۔

اللَّهُ جَعَلَ الْأَرْضَ مَحْذَاهُ وَالْحَبْلَ أَوْثَانًا وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا قَبِيلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا الْقَدَرِ

مَعَ شَاءٍ وَبَنَيْنَا قَوْمَكُمْ سُبُحَاتٍ بَنَدًا وَجَعَلْنَا بَسْرًا جَا

وَمَا جَاهُ وَأَثَرْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا لِيُخْرِجَ بِهِ قَبَائِدَ

قَبَائِدًا وَجَنَّتِ الْأَصْنَافُ (الباقی: ۱۶ تا ۱۷)

کیا ہم نے زمین کو پھونانے سے کر دیا اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا۔ اور ہم نے تم کو

جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ اور ہم نے تمہاری نیند کو ذریعہ آرام بنایا اور رات کو پردہ پوش

کیا اور دن کو روزی کمانے کا وقت بنایا۔ اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط

آسمان بنائے۔ اور ہم نے چراغ روشن کیا۔ اور ہم نے برسنے والے بادلوں کے

بہت سا پانی نازل کیا تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے اناج، سبزیاں اور گنجان باغ

اگائیں۔

اس طرح اسلامی عقیدہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ انسانوں کے پروردگار نے ان تمام قوتوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کے دوست، مددگار اور معاون بن کر رہیں۔ اس دوستی کو عملاً حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ان قوتوں کا مشاہدہ کرے، اُن پر غور کرے، اُنہیں سمجھے اور اُن کے ساتھ تعاون کرے۔ اگر کبھی کبھی یہ انسان کو تکلیف پہنچاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان نے ان پر غور نہیں کیا اور ان اصول و قوانین کو نہیں سمجھا جن کے تحت یہ کام کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ایسا نہیں کر خالق نے انسان اور دوسری ذی رت موجودات کو اس سازگار کائنات کے حوالے کر کے ان کو خود اپنی براہ راست توجہ اور نگرانی سے محروم ہی رکھی ہو۔ اس کا براہِ راست ارادہ بیک وقت پوری کائنات اور اس کے ہر فرد کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُبْصِرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ إِنَّ تَزُولُ لَاحٌ وَلَئِنْ زَالَتَا لَنُكَفِّرَنَّ
مَنْ أَخَذَ مِنْهُنَّ بِعَدْوٍ ۖ (فاطر: ۴۱)

”حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو مل جانے سے روکے ہوئے ہے، اور اگر وہ مل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا نہیں تھا میں، الا میں ہی، وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَعِلْمُهُ مُنْتَقِزٌ مِنْهُ مُتَوَدِّعٌ“
(مُؤَدِّد: ۶۱)

”زمین میں کوئی ایسا حیوان نہیں جس کا رزق اللہ نہ ہم کرتا ہو، اللہ ان تمام جانداروں کی جائے قرار اور ان کی آخری منزل سے باخبر ہے۔“
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝ (شع: ۱۶)
”ہم نے انسان کی تخلیق کی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کیا کیا سکھاتا ہے۔ ہم تو اس سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔“

وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُوْنِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن: ۶۰)

”تمہارے رب نے کہا: مجھے پکارو، میں تمہاری پکار سنوں گا۔“

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرِزُّكُمْ ذَٰلِكُمْ ۖ وَآيَاكُمْ ۖ (الانعام: ۱۵۱)

”وقت رزق کے اندیشہ سے اپنی اور دکھ کو قتل نہ کرو، ہم تمہیں اور انہیں دونوں کو رزق فراہم کریں گے۔“

تین وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادہ کا فیض ہے۔ انسان اسی کائنات کا ایک بڑا حصہ ہے جو دوسرے ہزاروں سے بڑا اور ہم آہنگ بھی ہے۔ فوذا فی انظم کائنات سے ہم آہنگ ہو کر ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ اذاد انسانی باہم بھی ہم آہنگ ہو کر رہیں۔ اسی پر سلام وحدت انسانیت کے نظریہ کا قائل ہے کہ اس وحدت کے انداز اگر مختلف ہیں تو یہ بھی اخلاق و اتحاد ہی کی بنیاد پر متفق ہیں تو اس لیے کہ مجتمع ہو سکیں۔ وہ مختلف راہیں اختیار کر کے بھی بالآخر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں، کیونکہ وحدت کائنات کے ساتھ تعاون و ہم آہنگی سب کی منزل مقصود ہے۔

سَابِقُ النَّاسِ اَنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ دَكِرٰثٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنَاكُمْ سُعُوْبًا
وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا ۝۱۳۱ (الحجرات : ۱۳)

”اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا، یہ تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کر دیا کہ تم کو ایک دوسرے کے عارف میں آسانی ہو۔“

انسانی زندگی کا نظم اس وقت تک درست نہ ہو سکے گا جب تک یہ تعاون و ہم آہنگی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اس کی تکمیل اس قدر ضروری ہے کہ اس راہ سے بننے والوں کو واپس لانے کے لیے طاقت کا استعمال بھی مباح ہے۔

اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اَنۡ يُّسْعَوْا فِی الْاَرْضِ
فَسَادًا اِنَّ یُفْسَدُوْنَ اَوْ یُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعْ اَیْدِیْہُمْ وَاَرْجُلُہُمْ
مِّنۡ جِلْدٍ اَوْ یُنْفَخُوْا مِّنَ الْاَرْضِ ۝۱۳۲ (المائدہ : ۳۳)

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے لگ دوڑ کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں، ان کی سزایہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں

یا وہ جلا وطن کر دیے جائیں۔“

فَإِنْ مَا بُغِثَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ
أَحَدُهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي بُغِيَ حَتَّىٰ تَعْلِيَ إِلَىٰ أُمُورٍ لِّكُم بِهَا

فَاءَتْ فَأَصْلَحُوا بَيْنَهُمَا بِانصِلٍ وَأَقْبِطُوا ۝ (المحجرات: ۹۱)

۹۱ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ اگر ان میں سے ایک کی زیادتی ہو تو اس گروہ سے مقاتلہ کرو رہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر جب وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو، اور قسط پر قائم رہو۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ

(البقرہ: ۲۵۱)

۲۵۱۔ اگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔

لہذا جس چیز کو اصل قرار دیا جائے گا وہ تعاون، ہم آہنگی اور ربط باہم ہے جو اس اصل کو چھوڑنے اس کو واپس لانے کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے اس لیے کہ جو روش کائنات کی کلی معلومت کا تقاضا ہو، اس کی اتباع بہر حال افراد اور گروہوں کی خواہشات کی پیروی سے زیادہ اہم ہے۔ باہمی تعاون و ہمدردی ہی وہ روش ہے جو مقصد کائنات اور اس طور پر خالق کائنات کے ارادہ و منشاء سے ہم آہنگ ہے۔

انسان بحیثیت نوع بھی ایک وحدت ہے اور بحیثیت فرد بھی۔ اس وحدت کی بظاہر مختلف قوتیں درحقیقت ہم منزل و ہم سفر ہیں۔ اس بارے میں انسان کا حال کائنات ہی جیسا ہے کہ اصل قوت ایک ہی ہے مگر اس کے مظاہر بے شمار۔

زمانہ و راز تک انسانیت، انسان اور کائنات کی قوتوں کے بارے میں کسی جامع نظریہ تک نہ پہنچ سکی۔ روحانی اور مادی قوتوں کے درمیان تقسیم کی گئی۔ کبھی ایک کو ثابت کرنے کے لیے دوسری کا انکار کیا۔ کبھی دونوں میں تضاد و ادرش کش کا تعلق تسلیم کیا۔ اس نے اپنی تعلیمات کی بنیاد اس نظر

پر کئی کہ رتوں کا وہ میں نہیں دیتی مگر پھر خدا ہے۔ ایک کا بیڑا بھاری ہو گا تو...۔ زما بلکا ہو جائے گا...۔ میں سے کسی ایک کو ترجیح دے یہ پھر چارہ ہیں۔ اس عطر کی رو سے تضاد کائنات اور انسان کی فطرت میں اصل ہے۔ اس نظریہ کی سب سے نمایاں مثال ذہنییت ہے جس کا پس و پیش ہے ذہنییت کے ساتھ اس کی موجودہ شکل دی ہے۔ اس میں وہ کسی حد تک بندہ مذہب اور مذہبیت کے ساتھ ہے۔
 راجہ خود ان دونوں سبب کا نقطہ نظر بھی بہ مختلف ہے۔ ان کے نزدیک روت کا پائے جسم و تخلیق نہیں پنی نے، اسے محض اسے، بلکہ اسے اپنے یا مگر اس کی طرف سے ہے نیاز ہو جانے اور جسمانی لذتوں سے ہاتھ کھینچ لینے میں مضمر ہے۔

کئی شدہ سمجھت اور اس سے ملنے جتنے دوسرے مذہب کے اس اصول کا اثر انسانی زندگی اور اس کے مختلف مسائل کے بارے میں ان کے نقطہ نظر پر بہت عجب اڑا ہے۔ خود جماعت کے طرز عمل اور انسان میں یہاں فتنوں و سردائیتوں کے سلسلہ میں ان کے نظریات اس کی روشنی میں مرتب ہوئے ہیں۔ ان دونوں فتنوں کے درمیان کشمکش بہاری رہی اس کشمکش میں انسان کی عجیبیاں و کشمکشیں و کرب و اضطراب کے عالم میں یہ ان کے گرد اس رہا کیوں آتے امن و سکون کی دولت نہ نصیب ہو سکی۔ تاہم اسلام نے اسے ایک مکمل ہر طرف کی کئی انتشار اور تضاد سے پاک، ٹھوس اور مہیا نظر کرنے لے کر آیا۔ تمام مختلف قوتوں اور مضامینوں کو متحد کر دینا اور سارے ریحانات و میلانات کو ایک سمت میں لگا دینا اس کا مقصد نہیں۔ انسان، حیات اور کائنات میں اصلا جو انی دو کیسانیت موجود ہے اسے ملا کر یا کر دیکھنا اس کا مشن نہیں۔ وہ اس لیے آیا تھا کہ نظام کائنات میں زمین و آسمان کو نظام دنیا میں دنیا و آخرت کو، نظام انسانی میں جسم و روح کو اور نظام مل میں کار و بار و مہارت کو ایک جا کر دکھائے اور یہ سب ایک راہ پر سرگرم سفر لے آئے لگیں۔ وہ راہ جو خدا کی طرف جاتی ہے اور سب کو ایک ہی اقتدار کا تابع بنادیتی ہے، خدا کے اقتدار کا۔

کائنات ایک اکائی ہے جو مشہورہ معلوم، ظاہر اور نظروں سے اوجھل اور معلوم غائب سے مرتب ہے۔ حیات ایک وحدت ہے جو مادی اور روحانی قوتوں کے سوگ کا نتیجہ ہے۔ یہاں یہ قوتیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں انتشار اور خلل پیدا ہوا۔ اسی طرت انسان بھی ایک اکائی ہے جو آسمان کی طرف مائل روحانی ذوق و شوق، اور زمین سے وابستہ جسمانی تقاضوں اور مادی میلانات سے

مرکب ہے۔ فطرت انسانی دونوں کے مابین کسی دوری یا کشمکش سے بری ہے کیونکہ نظام کائنات میں زمین و آسمان اور معلوم و مجہول کے درمیان کوئی کشمکش یا ٹکراؤ نہیں۔ نہ ہی نظام دین میں دنیا و آخرت اور کار و بار عبادت میں کوئی تعارض یا تضاد ہے۔

اس سب کی پشت پر ایک ازلی اور بدی قوت کار فرما ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی ابتداء ہے کہ ہم اسے جان سکیں نہ کوئی انتہا کہ وہ اس طے بین میں لائی جا سکے۔ یہی قوت کمال برہمگیزی کے ساتھ کائنات حیات اور انسان پر چھپاتی ہوئی ہے۔ یہ اللہ کی قوت ہے۔

فرد فانی اس دائمی قوت سے ربط قائم کر سکتا ہے۔ یہ زندگی میں اس کی رہنمائی کرتی ہے اور فرد مصیبت کے وقت اس سے مدد کا طالب ہوتا ہے اور اس وقت بھی جب انسان اپنی معاش کی خاطر زمین پر کار و بار میں مشغول ہو۔

فرد بہ حال میں آخرت کی سجدائی کے کام کر سکتا ہے۔ وہ روزہ رکھے اور جسم کو ہر طرح کے لذائذ سے محروم کر دے۔ یا رفدہ سے نہ بھاوے اور زندگی کی ہر پاکیزہ نعمت سے نطفہ اٹھائے، دونوں حال میں اس کا عمل آخرت کے لیے مفید ہے اگر وہ دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اسی کی خاطر عمل کرے آخرت کی واحد راہ یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں نماز بھی ہے اور کار و بار بھی، کامیابی بھی ہے اور ناکامی بھی اور آخرت کی اس منزل میں جنت و جہنم اور خوشنودی و ستاب دونوں کا اہتمام ہے۔

کائنات کی مختلف قوتوں اور اجزاء یا انسان کی مختلف صلاحیتوں کی وحدت کا راز اسی قوت میں پوشیدہ ہے۔ یہی قوت ہے جو انسان اور اس کی زندگی کے واقعی پہلو اور خواب و خیال کو ایک اکائی بنائے رکھتی ہے۔

کائنات و حیات، حیات اور صحت حیات موجودات، فرد و جماعت اور خود فرد کے مختلف رجحانات و میلانات میں توازن و ہم آہنگی بھی اسی قوت کی مہربانی منت ہے۔ یہی قوت دنیا اور دین اور زمین اور آسمان کے درمیان ایک خوشگوار ربط اور پائیدار رفاقت کی فاسق ہے۔

اس توازن کی خاطر نہ تو جسم کا مفاہم مجروح ہوتا ہے اور نہ روح کا۔ ہر ایک کو پوری سہ گرمی کا موقع ملتا ہے تاکہ یہ قوت ان سرگرمیوں کو خیر و فلاح اور تعمیر و ترقی کا ذریعہ بنا سکے۔ اس قوت کو بھی یہ منحور نہیں کہ اس ہم آہنگی کی خاطر فرد کو زیادہ پابند کر دے یا جماعت کو کسی حد تک نظر انداز کرے۔ یہ ایک

گروہ کو دوسرے گروہ پر یا ایک نسل کو دوسری نسلوں پر بھی ہے یا ترتیب نہیں دیتی بلکہ ایک کے حقوق و ذرائع، بدل و مساوات کی روشنی میں واضح طور پر متعین ہیں۔

ایک ہی قانون ہے جو فرد، جماعت، جہت و انفرادیت و مختلف نسلوں پر یکساں رہتا ہے۔ ایک ہی مقصد ہے جو ہر نسل کے سامنے رہتا ہے، یعنی یہ کہ ہر کسی کو تصادم، کشت و کشتی سے نجات دلا دے اور تباہی کو چرنی پوری نہ کرے۔ ہر نسل زندگی کی حیرت انگیز کھیل کود ہے اور اس کو اپنے خالق کی طاعت متنبہ کرتے ہیں۔

اسلام بنائے شدہ دین تو حید ہے کیونکہ وہ کائنات کی ساری قوتوں کے درمیان وحدت و یکتہی کا قائل ہے۔ اس کے یہاں خدا ایک ہے، اللہ کے دین کی شکل میں سارے مذاہب کو ایک قرار دیا گیا ہے، اور انہی حیات سے اسی دین و امر کے پیغام بر ہونے کی حیثیت سے سارے اہل عالم بھی ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

اِنَّ هٰدٰىۤ اٰمَنُكُمْ اُمَّةً وَّ اٰحٰدًا لَاۤ اَربَابَۤ اِلَّا هُوَ فَاَعْبُدُوْهُ۔

(الانبیاء ۲۱)

سب تک تمہاری یہ امت ایک ہی جماعت ہے۔ دین سب کا پروردگار ہوں۔ لہذا تم سب میری ہی عبادت کرو۔

اسلام عبادت اور کاروبار، عقیدہ اور عمل، روحانیت اور مادیت، معاشی قدروں اور معنوی قدروں، دنیا اور آخرت، اور زمین و آسمان سب کے درمیان وحدت کا قائل ہے۔ اسی عظیم وحدت سے اسلام کے فرائض و قوانین، ہدایات و حدود اور سیاسی اور معاشی امور میں اس کی رائیں ابھرتی ہیں۔ اس کی روشنی میں وہ حقوق و ذرائع متعین کرتا ہے اور نفع و نقصان کو تقسیم عمل میں لاتا ہے۔ الغرض اس کے سارے اجزاء اور تمام تفصیلات اسی اصل اصول میں پنہاں ہیں۔ کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اسلامی طرز فکر کی یہ اساس اگر ہماری سمجھ میں پوری طرح آجائے تو اسلام میں اجتماعی عدل کے بنیادی خطوط خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔

اجتماعی عدل کے اسلامی تصور کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محدود معنی میں کسی معاشی عدل کا نام نہیں بلکہ ایک سمجھ گیا اور جامع انسانی عدل ہے۔ زندگی کے تمام منظر اور طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرہ میں داخل ہیں۔ وہ فکر اور عمل، خیر اور ویران سب پر چھایا ہوا ہے۔ اس کا انحصار معاشی قدروں پر نہیں۔ وہ وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے ساری مادی قدروں تک محدود نہیں۔ وہ مادی، معنوی، درروسانی تمام اہمیت کی قدر کے ایک خوشگوار امتزاج کا نام ہے۔

منجہ شدہ مسیحیت انسان کو صرف اس کے روحانی میلانات کے زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کے جسمانی تقاضوں، بین میدانات کی خاطر کچل دینا چاہتی ہے۔ اشتراکیت صرف انسان کی مادی ضروریات کو اہمیت دیتی ہے۔ وہ انسانیت بلکہ ساری کائنات پر مادی اعتبار سے نظر ڈالتی ہے۔ اسلام ان دونوں کے عکس انسان کو ایک ایسی وحدت تصور کرتا ہے جس کے روحانی میلانات اور جسمانی تقاضوں میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ نہ اس کی مادی ضروریات اور غیر مادی ضروریات کو الگ الگ کیا جاسکتا ہے۔ کائنات و حیات کا یہ جامع تصور تفریق و تقسیم کا قائل نہیں۔ اسلام اور اشتراکیت و مسیحیت کی راہیں یہیں آکر مختلف ہو جاتی ہیں۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ اسلام تمام تر نہ صرف اللہ کا بنایا ہوا دین ہے جب کہ مسیحیت میں انسانی تحریفات کو دخل ہو گیا اور اشتراکیت تمام تر انسانی وہم و گمان پر مبنی ہے۔

اسلام کی نظر میں زندگی تعاون و ہم آہنگی اور بہمدردی و مواساتہ کا نام ہے۔ مسلمانوں کے درمیان خصوصاً اور عام انسانوں میں عملاً مسیحیت کا نقطہ نگاہ بھی یہی ہے مگر وہ کوئی واضح اور متعین شہادت نہیں رکھتی اور نہ عالم واقعہ میں اس کا کوئی عملی اظہار اس کے سامنے ہے۔ اشتراکیت اُسے طبقاتی کش مکش کا میدان سمجھتی ہے تاکہ ایک طبقہ کے دوسرے طبقہ پر غلبہ کی شکل میں اشتراکیت کی عظیم تناہوری ہو سکے۔ اسی سے واضح ہے کہ مسیحیت عالم مثال میں ایک خواب ہے جس میں انسانیت کو عالم بالا کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسلام انسانیت کے ازلہ خواب کی عملی تعبیر ہے جو زمین پر قائم حقیقت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اور اشتراکیت ایک مخصوص دور کے انسانوں کے جذبہ حد کا دوسرا نام ہے۔

اسلام اجتماعی عدل کے قیام میں انہی دو بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتا ہے۔ متوازن

یہ ہم مربوط اور مکمل وحدت اور افراد اور جماعتوں کے درمیان تعاون و وحدت گیری کی اپہٹ اس عدل کے قیام میں اسلام انسانی فطرت کے بنیادی عناصر کا لحاظ رکھتا ہے۔ انسان کی صلاحیتوں کو بھی پوری طرح سامنے رکھتا ہے۔

قرآن کریم انسان کی بابت فرماتا ہے :

وَأَن تَهْتَبُوا لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (الْعنکبوت : ۸)

”بے شک وہ مال کی محبت میں آگے بڑھا ہوا ہے“

مال و دولت کی محبت خود اس کی خاطر، اور ان چیزوں کی خاطر جن کا حصول ان سے وابستہ

ہے، انسان کو فطری اور طبعی طور پر پھیل کر دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

وَأُخْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّجَّ (النساء : ۱۲۸)

”نفس تنگ دلی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں“

یہ خصلت انسان میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ قرآن میں انسان کی اس خصلت کو

ایک حسین اور اچھوتی مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے :

قُلْ لَّوْ أَنْتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّيَ إِذًا لَّأَمْسِكْتُمْ خَشْيَةَ

الْإِنْفَاقِ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَنُورًا (بنی اسرائیل : ۱۰۰)

”اے محمد ان سے کہو، اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضہ میں

ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشہ سے ان کو بھی ضرور روک رکھتے۔ واقعی

انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے“

یہ نہ بھولیے کہ اللہ کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ ایک طرف اس کی وسعت بے پایاں

اور دوسری طرف انسان کا یہ نخل ! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کتنا تربیت یافتہ چھوڑ دیا

جائے تو اس کا نخل کس حد تک پہنچ جاتا ہے۔

اسلام نظام زندگی کی ترتیب یا قانون سازی اور ہدایات و تلقین میں ایک لمحہ کے لیے

بھی اس فطری حجت ذات اور خود غرضی کو نظر انداز نہیں کرتا۔ جس کی جڑیں فطرت انسانی میں اتنی

گہری ہیں۔ وہ غلط نصیحت اور قانونی پابندیوں کے ذریعہ خود غرضی اور نخل کا علاج کرتا ہے۔ وہ

فرد پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ساتھ ہی جماعت کی فروریات و مصالح کا بھی پورا لحاظ رکھتا ہے۔ اس کے پیش نظر فرد و جماعت دونوں کی زندگی کے وہ بلند مقاصد ہیں جو ہر نسل اور ہر زمانہ کے لیے یکساں ہیں۔

جس طرح فرد کی ترص و ہوس کا مفاد جماعت کو پامال کرنا نامناسب ہی نہیں، کھلی بے انصافی اور مریخ ظلم ہے، اسی طرح یہ بھی ظلم ہے کہ جماعت فرد کی قوت برداشت کا لحاظ نہ کرے اور اس کی طبیعت پر بے جا بوجھ ڈالے۔ ایسا کرنا صرف ایک فرد پر ظلم نہیں بلکہ پوری جماعت پر ظلم ہے۔ مسرد کے رجحانات کو کچلنے اور اس کے میلانات کو دبانے کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ خود جماعت کے لیے اس فرد کی صلاحیتوں اور خدمات سے پوری طرح ناامدہ اٹھانے کے مواقع بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ سماجی نظام کو فرد کی صلاحیتوں اور قوتوں میں سے جماعت کا حق حاصل کرنے کے لیے فرد کی آزادی اور اس کے رجحانات کو کچھ حدود کا پابند کرنا چاہیے، لیکن ساتھ ہی اسے فرد کے حقوق سے بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ انفرادی رجحانات کو اس حد تک پوری آزادی ملنی چاہیے جس حد تک کہ وہ زندگی کے بلند تر مقاصد سے نہ ٹکراتے اور مفاد جماعت کو نہ مجروح کرتے ہوں۔ زندگی اسلام کے نزدیک تعاون و توافق کا نام ہے نہ کہ کش مکش اور جنگ و جدل کا۔ زندگی کاراز انفرادی اور اجتماعی قوتوں کی آزادی اور نشوونما میں مضمر ہے نہ کہ ان پر پابندیوں اور عکڑ بندیوں میں۔ ہر وہ چیز سماج ہے جو حرام نہیں قرار دی گئی اور وہ چیز جسے باطل نہیں ٹھہرایا گیا حق ہے۔ انسان کو اللہ کے دیئے ہوئے ضابطہ حیات اور شریعت کے حدود میں ہر اس عمل اور ہر اس سہ گرمی کا اچھا بدلہ ملتا ہے جس میں وہ اللہ کی مرضی کو اپنا نصب العین بنائے اور زندگی کے ان بلند تر مقاصد کے حصول کی کوشش کرے جن کو اللہ نے پسند فرمایا ہے۔

سماج میں عدل و انصاف اور توازن دہم آہنگی پیدا کرنا اسلام کے لیے نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کے بارے میں اس کا نقطہ جامع بھی ہے اور وسیع بھی۔ وہ مادی اور معاشی قدروں پر آکر ٹک نہیں جاتا بلکہ آگے بڑھ کر ان تمام قدروں کو اپناتا ہے۔ جن سے انسانیت کی فلاح وابستہ ہے۔ اسلام عدل کے اس محدود تصور سے بلند ہے جو اشتراکیت میں ملتا ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک عدل معاوضوں میں ایسی مساوات کا نام ہے کہ معاشی تفاوت اور اونچ نیچ کا خاتمہ

ہو سکے۔ اگرچہ حقائق دنیا میں ملنے والے نہیں تھے مگر اصول پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے انسانی کثرت اپنے سماج میں آتے، مگر اس سے کسی قدر بھی سبکی نہ تھی۔ اس کی نظر میں صرف انسانی مساوات کا نام ہے جس میں تمام قدر میں کی مساوات، نہ ہنگامہ کی مساوات ہے۔ ان قدر میں خاص معاشی قدر میں بھی شامل ہیں۔

جہاں جہاں کے پیش نظر قدر کی مقدار اور باہم بوجھ ہیں جہاں کے بعد سے قدر کی مقدار کا نام سنا کہ یہ زیادہ آسان ہو گیا۔ یہ اسی لیے ہے کہ وہ معاشی مساوات کہ سنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مساوات کا یہ مفہوم انسانی فطرت سے ملتا ہے۔ فانی دہا جیسے ہیں پیدا کنشی طور پر پیدا ہونے والے آسمان کی مٹی کے خدات مساوات ہے۔ یہ اصول اعلیٰ مساویوں کو معمولی اور ادنیٰ مساویوں کے برابر قرار دینے کی منہ سے کہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر معمولی صلاحیتوں کے حامل فرد کو ان صلاحیتوں کو خود اپنی سہولت کے لیے استعمال کر پاتے ہیں۔ خود کی سہولت کے لیے۔ قوم اور پوری اس فطرت ان اندازہ صلاحیتوں کے پیش سے محروم رہ جاتی ہے۔

فطری صلاحیتوں میں عدم مساوات کی ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹکنا نہیں جاسکتا۔ چھپی ہوئی صلاحیتوں کا یہ بھی رعبہ اتفاق و واقعات کی دنیا میں ناممکن ہے لیکن ان سے قطع نظر وہ سماجی خصوصیات کا معائنہ تو بالکل واضح ہے۔ بعض افراد سمجھتے، قوت برداشت اور جسمانی و ذہنی کمالات کے جوہر کے استعداد، پیدائشی طور پر سہولت پاتے ہیں جبکہ کچھ لوگ مفلک و کمزوری اور دوری نامیوں کے برائیم یہ جوئے پیدا ہونے میں۔ تمام صلاحیتوں اور ہر طرح کی استعداد کو برابر کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں کیونکہ کوئی ایسی مستحکم نہیں۔ یہاں ہوگا ہے جو دوسری مصنوعات کی طرح انسانوں کو بھی ایک ہی سطح پر نہیں ڈھال کر پیدا کر سکے۔

غیر معمولی اور بلند ذہنی نفسیاتی اور روحانی صلاحیتوں کے وجود سے انکار محض لغویت ہے ہمیں ان کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھنی چاہیے۔ انہیں اس بات کا پورا حق ملنا چاہیے کہ اپنے اثرات سامنے لاسکیں۔ ان اثرات میں سے اجتماعی مفاد کی خاطر جن چیزوں کی ضرورت ہو انہیں حاصل کیا جاسکتا ہے مگر ان صلاحیتوں کو رک کر ان کے عمل چھل لانے کے امکانات ختم کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اب اگر ان صلاحیتوں پر بھی ظلم ہوگا اور سماج اور انسانیت پر بھی۔

سماجی عدل اور انسانی مساوات کے خطوط واضح کر دینے کے بعد اسلام نے سچی وجہ کے

ذریعہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے کھلے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اس مسابقت میں اقتصادی اقدار کے علاوہ دوسری قدروں کو بھی اہمیت دی گئی ہے اور عمل کی ترازو میں ان کا وزن بھی پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے ۱

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات = ۱۳)

”اللہ کے نزدیک تم میں سے بزرگ ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ شقی ہو۔“
يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (مجادلہ: ۱۱)

”تم میں سے جو لوگ صاحب ایمان ہیں اور جنہیں علم عطا ہوا ہے، اللہ ان کو بلند مراتب سے سرفراز فرمائے گا۔“

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَةُ الصَّالِحَةُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا (کہف: ۴۶)

”یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجہ کے اعتبار سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔“

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ مادی معاشی اقدار کے علاوہ دوسری قدریں بھی اپنا وجود رکھتی ہیں جن کی اہمیت کو اسلام پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے۔ جب لوگوں کے درمیان آمدنی اور مالی وسائل کے اعتبار سے تفاوت پایا جاتا ہے تو اسلام ان غیر معاشی قدروں کو سمجھنے میں مدد و توازن قائم رکھنے کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہاں اس مالی تفاوت کا ذکر ہے جو مختلف فطری استعداد و صلاحیت جیسے عقل اسباب پر مبنی ہو نہ کہ ان مذموم طریقوں پر جن کو اسلام نے یکہ حرام قرار دیا ہے۔ تفصیل آگے اقتصادی پالیسی کے بیان میں ملے گی۔

ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ اسلام محدود معنی میں معاشی مساوات کا فائل نہیں۔ مال و دولت کے کسب ایسی صلاحیتوں پر مبنی ہے جو سب کو برابر نہیں ملی ہیں۔ عدل کا تقاضا ہے کہ لوگوں میں یک گونہ معاشی تفاوت موجود رہے۔ اور کچھ لوگ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مال دار

ہوں۔ البتہ انسانی مساوات کو بہر حال برقرار رہنا چاہیے۔ اس کی ریزی شرط یہ ہے کہ سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں، کسی شخص کی راہ میں حسب و نسب یا سنی و جہد پر پانی پھیر دینے والی کوئی بھی چیز رد نہ بنے۔ بہر حال وہ کو مناسب وزن حاصل ہو۔ اور فحیہ انسانی کو نری مادی اور معاشی قدروں کی اندھی غلامی سے آزاد کر دیا جائے۔ مادی و معاشی قدروں کے صحیح مقام پر رکھنا بہت ضروری ہے۔ ایسے سماج موجود ہیں جن میں غیر مادی اقدار کا شعور اور ان کی اہمیت کا احساس تو ناپید ہے یا بہت ہلکا ہے۔ ان کے نزدیک مادی دولت ہی بنیادی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ مالی اقدار کو غیر معمولی اہمیت دے کر ایک بہت اونچا مقام دے دینا بالکل غیر فطری اور غیر معقول ہے۔

مال و دولت کو قدر اعلیٰ یا قدر کل قرار دینا اسلام کے نزدیک ناقابل تصور ہے۔ اسے یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ زندگی روٹی کے ایک ٹکڑے، چند سکوں یا کسی جہانی خوشی میں گھبرا کر رہ جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فقر و فاقہ و محنت و سستی کا اثر بھی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ ہر فرد کو بنیادی ضروریات کی تکمیل بلکہ بسا اوقات اس سے زیادہ کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام ایسی عیش و عشرت کی راہیں بھی مسدود کر دیتا ہے جس میں شہوات و فحشیات کو کھلی پیش مل جاتی ہے اور ایک دوسرے سے بہت زیادہ فرق و تفاوت رکھنے والے طبقات وجود میں آتے ہیں۔ اسلام دولت کے سلسلہ میں مادی درجہ بندیوں کا ایک حق و واجب سمجھتا ہے۔ اس حق کی مستند ان کی ضروریات و سوسائٹی کے مفادات و مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اس مفاد کے پیش نظر متعین کی جاتی ہے کہ سمات میں بدلنا ہو، ایک حد تک مساوات برپا ہو اور نفرتی اور تشویش کے لیے ماحول کار خف پیدا ہو۔ اس طور پر اسلام زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ مادی و معنوی، اور دینی اور دنیوی، تمام پہلوؤں کو پوری پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ تاکہ یہ سب گھل مل کر ایک ٹکڑے کی شکل اختیار کر لیں۔ ایک ایسا مشابہ اور منضبط اور ان موزوں امتزاج رکھنے والا کل جس کے باہر دیگر پیوستہ عناصر میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہ رہ جائے اور جس کی وحدت و عظیم دو سیت کائنات اور حیات و انسان کی وحدت سے ہم آہنگ ہو جائے۔

باب سوم

اسلام میں اجتماعی عدل کی بنیادیں

اسلام میں اجتماعی عدل کی بنیادیں

اسلام اس اجتماعی عدل کو جس کے مزاج پر گزشتہ ابواب میں کچھ روشنی ڈالی گئی ہے، مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم کرتا ہے۔ اسے ایک اجتماعی دعوت یا مبہم سی بات بنا کر چھوڑ دینے کے بجائے وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے متعین ذرائع و وسائل بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلام ایک عملی دین ہے۔ کوئی ایسا مذہب نہیں جو محض تصورات کی دنیا میں تعلیم و تلقین تک محدود ہو کر رہ جائے۔ یہ بات اتنا سادہ سا منے لانی چاہیگی ہے کہ اسلام کائنات، حیات اور انسان کی بابت ایک بنیادی نظریہ رکھتا ہے۔ اجتماعی عدل کا تصور اسی بنیادی فکر کا پیر تو ہے۔ یہ نظریہ اسلامی عدل کو ایسا وسیع اور جامع انسانی عدل بنا کر پیش کرتا ہے جو مادی امور یا معاشی مسائل تک محدود نہیں۔ اس کے نزدیک زندگی کی حقیقی قدریں بہ یک وقت مادی بھی ہیں اور معنوی بھی۔ دونوں میں تفریق صحیح نہیں۔ انسانیت ایک جامع وحدت ہے جس کے مختلف عناصر باہم مربوط و ہم آہنگ اور ذمہ داریوں میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ یہ باہم نفرت اور دشمنی رکھنے والے مختلف گروہوں کا مجموعہ نہیں۔ کبھی کبھی ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ حقیقت واقعہ اسلام کے اس بنیادی فکر کے خلاف ہے۔ لہذا سب سے پہلے خود حقیقت واقعہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

اسلام جس چیز کو حقیقت واقعہ کا درجہ دیتا ہے وہ کسی ایک فرد، قوم یا نسل کی تاریخ نہیں۔ کیونکہ ایسی تاریخ زمان و مکان کی یا بند ایک محدود سی صورت واقعہ کا نام ہے۔ انسانی انسانوں کا کوتاہ بین فہم ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی انسانی زندگی سے ابھرنے والے عظیم حقائق کو بھول کر انہی تاریخوں کو سب کچھ سمجھ لینا ہے۔ اسلام اس کوتاہ بینی کا قائل نہیں وہ تمام گوشوں پر

نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر طرح کے مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے اور ایسے مقاصد کو اپنا ہدف بناتا ہے جن سے ازل تا ابد ساری انسانیت کو یکساں تعلق ہے۔ چنانچہ ایک بات جو چند مخصوص مساوات میں حقیقت کے خلاف نظر آتی ہے وہی جب ساری انسانی تاریخ اور پوری انسانی زندگی کے اس وسیع پس منظر میں رکھ کر دیکھی جاتی ہے، جو افراد و اقوام یا نسلوں کا پابند نہیں، تو سارے تعرض رنج ہو جاتا ہے۔

یہی دور رس بنیادی اور کلی فکر جو عدل اجتماعی کے اعلیٰ مقاصد کا ضامن ہے اسلام کے تفصیلی احکام و ضوابط کے سمجھنے میں بھی ہماری مدد کرتا ہے۔ جن ضوابط کی علیحدہ علیحدہ توجیہ مشکل نظر آتی ہے وہ اس اصل کی روشنی میں حکمتوں سے پر نظر آنے لگتے ہیں۔ ان جزوی احکام پر ایک گروہ کے کسی فرد، ایک قوم کے کسی گروہ، ایک نسل کی کسی مخصوص قوم یا مختلف نسلوں میں سے کسی نسل کے مفاد و مصالح کی روشنی میں غور کیا جائے تو ان کا صحیح فہم حاصل کرنا مشکل ہو گا۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس بنیادی فکر کی رہنمائی ضروری ہے۔ انفرادی ملکیت کا نظام، وراثت کے قوانین، زکوٰۃ کا ضابطہ عدالتی نظام اور قوانین تجارت، غرض کہ انفرادی یا جماعتی امور سے متعلق سارے اسلامی قوانین و ضوابط کی حقیقت اس بنیادی فکر کی روشنی میں سمجھی جاسکتی ہے۔

اس کتاب میں ان تمام موضوعات پر تفصیلی گفتگو نہیں کرنی ہے۔ اسلام کے کلی فکر کے دائرے میں رہتے ہوئے صرف ان عمومی بنیادوں سے تعارف کرنا ہے جن پر عدل اجتماعی کا اسلامی نظام مبنی ہے۔ ہمارا مطالعہ ہمیں بتائے گا کہ اسلام نے فرد کے اندر جسم و روح اور زندگی میں مادی اور معنوی قدروں کے درمیان وحدت برقرار رکھی ہے، اور اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ فرد اور جماعت کے مقاصد ایک ہوں، ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں کے مفاد و مصالح میں ہم آہنگی رہے اور انسانی برادری کی مختلف قوموں کے درمیان چھوٹے چھوٹے اور محدود مصالح میں اختلاف کے باوجود مقصد کے اعتبار سے اتحاد، یک جہتی برقرار رہے۔

عدل اجتماعی کا اسلامی نظام تین بنیادی اصولوں پر مبنی ہے:

۱۔ مطلق اور مکمل آزادی ضمیمہ۔

۲۔ کامل انسانی مساوات۔

۳۔ محسوس اور پائیدار اجتماعی تکافل۔

آئندہ صفحات میں انہی بنیادوں کے مزاج و مقصد کی وضاحت کی گئی ہے۔

آزادی ضمیر

اجتماعی عدل کا کوئی تصور اس وقت تک پوری طرح شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا نہ اسے اس وقت تک قیام و بقا نصیب ہو سکتا ہے جب تک کہ اس کے پیچھے اس عدل کی اجتماعی ضرورت کا شدید احساس اور انفرادی استحقاق کا جبہ اشعور نہ موجود ہو۔ پھر یہ یقین بھی ضروری ہے کہ اسی طرح ایک اعلیٰ انسانی مقصد تک پہنچنا ممکن ہو سکے گا۔ ساتھ ہی مادی حالات ایسے ہونے چاہئیں کہ فرد اس نظام عدل سے وابستہ رہنے، اس کی حفاظت کرنے اور اس کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ فرد کو اس ضرورت کا احساس نہ ہو اور وہ اس شعور کو ہمیشہ تازہ رکھنے کا عملاً اہتمام نہ کرے تو محض قانون سازی کے ذریعہ اس طرح کا عدل قائم کرنا مشکل ہے۔ ایسی قانون سازی اگر عمل میں بھی آجائے تو سماج ان قوانین کے برقرار رکھنے اور انہیں پوری طرح نافذ کرنے پر قادر نہ ہو سکے گا۔ ضروری ہے کہ افراد کے داخل میں ایسے عقائد موجود ہوں جو اس اجتماعی عدل کی تائید کریں، اور خارجی حالات بھی ایسے ہوں کہ اس کا قیام عملاً ممکن ہو سکے۔ اس نکتہ کو اسلام اول دن سے سمجھتا ہے۔ اور اسے اس نے اپنی قانون سازی اور ہدایت و تلقین دونوں میں ہمیشہ سامنے رکھا ہے۔

کلیسا اور مقدس کائناتوں کی بگڑی ہوئی عبائیت اور اسی طرح بدعت کے نزدیک دنیوی زندگی کے لذائذ و مغرباات سے بے نیازی، اللہ کے کرشموں سے پُر آسمانی دنیا کی طرف توجہ، اور ترک دنیا، انسان کو آزادی عطا کرنے اور فلاح و سعادت سے بہہ و یاب کرنے کے لیے کافی ہے۔ بات چلتی ہے لیکن ایک حد تک، کیونکہ زندگی کے تقاضوں کو ہر حال میں پس پشت ڈال دینا ممکن نہیں جوتا، نہ ہی ضروریات زندگی کو ہمیشہ دبا کر رکھنا ممکن ہے۔ انسان ان ضروریات کا دباؤ محسوس کرنے اور اکثر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہے۔ زندگی کے تقاضوں کو دبانے کا چلنا ہمیشہ اچھا ہی نہیں ہوتا۔ خالق حیات نے انہیں عبث نہیں بنایا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ انسان اس کو معطل رکھ کر ہر طرح کے نشو و ارتقار سے

محروم کر دے۔ ضروریات سے بے نیازی اور بندی کا مطلب یہ نہیں کہ خود زندگی کو ناکارہ بنا کر چھوڑ دیا جائے۔
 موزوں اور معقول صورت وہ ہوگی جس میں انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کے شعور کو لاہر
 موقع ملے اور ساتھ ہی وہ ضروریات کی توہین نہ کرے۔ خدا کی عزت ہے۔ اسلام کا یہی شکل
 مطلوب تھی اور اس نے جسمانی ضرورت، اور دینی مصلحت، دونوں کے لیے ایک ہی خطہ تجویز کیا
 ہے۔ اس نے تیزی ضمیر کی نذر داخل میں شعور و احساس بھی پیدا کیا اور خارجی حالات کو بھی ساکھار بنایا
 اس کے برعکس انسانہ اقلیت کا نظریہ یہ ہے کہ تیزی ضمیر کی صلاحیتیں معاشی تیزی ہے۔ ذوقانی
 قوانین عدل و مساوات کی جو ضمانتیں عموماً دینے ہیں ان سے بھی وہ معاشی دنیا کے سبب متاثر رہتا ہے۔
 یہ نہ کہ ایک حد تک سچی کی۔ اس لیے ممکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشی میں معاشی آزادی کی نسبت
 فکر و شعور کی ایسی آزادی سے بغیر نہیں رہی ہو سکتی جس کی جڑیں قلب و ضمیر میں کڑی تڑپکی ہوں۔ انسان پر
 ضروریات، صلاحیتوں اور رہتی، ت کا جو باہر پڑتا ہے اس کا مقابلہ صرف قانون کے ذریعہ نہیں کیا جاسکتا
 ایک فرد جو پیدائشی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے سیدھے دوست و رشتہ کی دوسروں کے ساتھ
 نہیں مل سکتا کچھ عرصہ تو کئی بھی رہ سکتا ہے لیکن باقاعدہ احساس کمزوری کا نہ کارہ کرے چھوڑ دے جائے گا جو وہ
 اس مساوات کا طالب بھی نہ رہ جائے گا جس کی ضمانت ہمارے قانون نامہ حاصل ہوئی ہے۔ اسی طرح جو
 ذوقانی معمولی قوت کا اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہوگا وہ ایک دن مساوات حقوق کے ضابطے توڑتا ہوا
 آگے نکل جائے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو اپنے دل میں انسانیت کے خلاف پیدا غضب کی پرورش کرے گا
 آخر کار وہ یا تو سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا یا اس کی صلاحیتیں مردہ اور قوت کار مفلوج
 ہو جائے گی اور اس کے نتیجے کا بہت گہرا جائیں گے۔

اگر مساوات کے پیچھے احساس برتری بھی کارفرما ہو اور اسے قانون کی تائید بھی حاصل ہے تو
 اس کا احساس کمزور اور طاقت ور دونوں میں یکساں اُجاگر رہتا ہے۔ کمزور میں مساوات کا یہ تصور
 جذبہ غلو بن کر نمودار ہوتا ہے اور طاقت ور میں انکسار و تواضع بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

مساوات کا یہ تصور انسانی ذہن میں جاگزیں ہوتے ہی دوسرے بنیادی تصورات سے
 ہوتا ہوتا ہے۔ اللہ پر ایمان، امت کی وحدت اور اس کے افراد میں ذمہ داریوں کے اشتراک کا تصور
 اور آگے بڑھ کر ساری انسانیت کی وحدت اور اس میں کفالت باہمی کا اصول اس مساوات سے پوری

طرت مربوط نظر کرنے تک ہے۔ اسلام کو یہی کیفیت مطلوب ہے۔ اسی کی خاطر اس نے پہلے تو داخلی اور خارجی دونوں طرت کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے ہر فرد کو بنیادی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت دی پھر اسے کامل آزادیِ ضمیر بھی عطا کی۔

اسلام اپنے نقطہ آغاز ہی میں ضمیر انسانی کو غیر تکرار کی عبادت اور اعلیٰ عبادت و فرمان برداری سے آزاد کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کو انسان پر کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اسے مارتا، چراتا ہو، کوئی دوسرا نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ آسمان و زمین میں بس وہی ایک ذات ہے جو انسان کو رزق عطا کرتی ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ مائل نہیں رکھتا۔ آسمان و زمین میں بس وہی ایک ذات ہے، اس کے سوا سب بندے ہیں جو نہ خود اپنے لیے کچھ کر سکتے ہیں نہ دوسرے کے لیے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اللّٰهُ الْقَمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَ
لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (الاخلاص : ۱ تا ۴)

”کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ خود جنا گیا اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے“

جب اللہ ایک ہے تو اس کی عبادت بھی یکساں ہوگی۔ سب کے سب لوگ اسی کی طرف متوجہ ہوں گے۔ کسی دوسرے کی عبادت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کچھ کسی انسان کو اس کا بھی حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا رب قرار دے۔ کسی کو کسی پر اگر کوئی برتری حاصل ہو سکتی ہے تو صرف نیک عمل اور تقویٰ کی بنا پر۔

قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ اِلَّا
نَعْبُدُ اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا
مِّنْ دُونِ اللّٰهِ ۚ (آل عمران : ۶۴)

”کہو اے اہل کتاب اگر ایک ایسی بات کی طرف جو تمہارے اور ہمارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے“

اپنی اس تعلیم کو اسلام بڑی ہمت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مختلف امور کے سلسلہ میں اسی اصل کا سہارا لیتا ہے۔ اندیشہ ہو سکتا ہے کہ لوگ انبیاء کرام کی بزرگی کے سبب ان کی عبادت و پرستش کرنے یا اسی قبیل کے کچھ آدمی و مراسم بجالانے کی طرف مائل ہوں۔ ہذا اسلام نے انسانی ضمیر کو اس سے آزاد رکھنے کا خصوصی اہتمام کیا۔

اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت فرماتا ہے۔
وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ
اَوْ قَتَلْتُمْ اَنْفُسَكُمْ عَلٰی اَمْعَا بَكُمْ ۙ (آل عمران: ۱۴۴)

۱۔ محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی
عزیز چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُن کے پادشہ پھر مانو گے؟
اور ان کو مخالف کرتے ہوئے صاف صاف سُنا تا ہے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ أَوْ يُعَذِّبْهُمْ
وَالْعَمَلُ ۙ (آل عمران: ۱۴۵)

۲۔ (اے پیغمبر) فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے،
چاہے انھیں معاف کرے چاہے سزا دے۔

اسی طرح ایک دوسرے واقعہ پر کچھ تنبیہ کے سے انداز میں کہتا ہے،
وَلَوْلَا اَنْ تَشْتَكِيَ لَقَدْ كِدْتُمْ تُزَكُّونَ ۚ لِيُخْرِجَ شَيْئًا قَلِيلًا ۚ
اِذَا لَوْ ذُكِّنْتُمْ بِضَعْفِ الْحَيٰوةِ وَضَعْفِ الْمَمٰتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ
لَكُمْ عَلَيْنَا فَصِيْرًا ۙ (بنی اسرائیل: ۷۵-۷۴)

۳۔ اور بے پروا نہ تھا کہ ہم تجھے مضبوط نہ رکھتے تو تو ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتا۔ لیکن
اگر تو ایسا کرتا تو ہم تجھے دنیا میں بھی دہرے عذاب کا سزا چکھاتے اور آخرت میں بھی
دہرے عذاب کا۔ پھر تو ہمارے مقابلے میں تو کوئی مددگار نہ پاتا۔

وہ ان کو حکم دیتا ہے کہ اپنا حقیقی موقف علانیہ سامنے رکھ دیا۔

قُلْ اِنَّمَا اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَا اَشْرِكُ بِهِ اَحَدًا ۚ قُلْ اِنِّيْ لَا اَمْلِكُ

لَكُمْ صِرَاطٌ وَلاَ رُشْدًا هَـ قُلْ إِنِّي لَنْ يَجْزِيَني مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ
مِنْ دُونِهِ مُلْتَجِدًا هـ (جن ۲۰ تا ۲۲)

”کہو میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو بھی اس کا شریک نہیں ٹھہراتا۔ کہو نہ
تمہیں ضرر پہنچانا میرے ہاتھ میں ہے نہ راہ پر لانا۔ کہو مجھے اللہ سے کوئی نہ بچا سکے گا
اور نہ اس کے سوا مجھے کوئی جائے پناہ مل سکے گی۔“

عیسیٰ ابن مریم کو خدا بنا لینے والوں کا ذکر کرتا ہے تو انہیں ذلت پسندی اور کفر شکاری

کا مجرم گردانتا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ
يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُعَذِّبَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ
وَأُمَّهُ وَفَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا هـ (المائدہ ۱۷۱)

”یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ اے محمد! ان
کہو کہ اگر خدا مسیح کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو
کس کی مجال ہے کہ اس کو اس کے سوا اس ارادے سے باز رکھے۔“

حضرت مسیح کی بابت ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔

إِنَّهُ هُوَ إِلَّا عِبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ هـ
(الزخوف ۵۹)

”وہ صرف ایک بندے ہیں جن پر ہم نے انعام فرمایا اور جنہیں ہم نے بنی اسرائیل
کے لیے ایک مثل بنایا۔“

قیامت کا ایک منظر سامنے لاتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم سے لوگوں کے اس
زعم کے سلسلہ میں جواب طلب فرمائے گا کہ عیسیٰ خدا بن کر آئے تھے اور پھر ایک نہایت مؤثر
زوردار اور دل میں گھر کر جانے والے انداز میں حضرت عیسیٰ کو اس تہمت سے بری فرمائے گا جس سے
ان کا دامن بالکل پاک تھا؛

قِرِاذًا قَالَ اللَّهُ يُعِيسِي ابْنُ مَرْيَمَ هـ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي

وَأَفِي الصَّيْنِ مِنْ دُونِ اللَّهِ ط قَالَ سَعَانُكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ
أَقُولَ مَا يَسِرُّ فِي خَبْرِهِ ط أَلَمْ تَكُنْ قَائِمًا فَقَدْ عَلِمْتَهُ ط تَعْلَمُ مَا فِي
نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ط أَنْتَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ط مَا أَنتَ
لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ ط إِنْ أَعْبُدُ إِلَّا اللَّهَ ذُنُوبِي دَرَسْتُ خَيْرًا وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ
شَهِيدًا ط دُرُفْتُ مِنْهُمْ ط فَلَمْ تَنْفِتْنِي كُنْتُ أَنْتَ الْوَقِيبُ
عَلَيْهِمْ ط وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ط إِنْ تَعَذَّبْهُمْ فَاتَّخِذْ
عِنَاؤَكَ ط وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ أَعَزُّ رَحْمَةً
(المائدہ ۱۱۶ تا ۱۱۹)

”جب اللہ مائے کاکر سے عیسیٰ بن مریم کیا رونے لگوں سے کہا تھا کہ
سوائے درمیدی ماں کو بھی خدا بنو، تو وہ جو اب میں اصر کرے گا، سچا ہے۔“
میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ مان بہت جس کے کہے کا مجھے حق نہ تھا۔ مگر میں یہ بات کہی
جوتی تو آپ کو نور علی مولا۔ آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے، وہ میں نہیں
جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے مالک ہیں۔ میں نے
ان سے اسی کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا۔ کہ قدری سدا کر وہ میری
رب ہے۔ اور نہ ہی رب ہے۔ میں اُسی وقت تک اُن کا انکار نہ کیا کہ میں
”ن کے درمیان تھا جب آپ نے مجھے واپس دیا تو آپ اُن کے انکار سے در آئے تو
ساری ہی چیزوں پر انکار کیا۔ اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے
ہیں۔ اور اگر آپ معاف کر دیں تو آپ غالب اور دانا ہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے بندوں کو الہ بنا لینے کی ایک عملی مثال بھی پیش کی ہے جس میں
عقیدہ کے اعتبار سے الہ نہیں بنایا گیا تھا بلکہ بندوں سے قانون زندگی حاصل کیا گیا تھا
ایسا کرنے کے سبب اللہ نے انہیں رب بنانے کا مجرم گردانا اگرچہ نہ اُن کی اُلوہیت کا عقیدہ
اختیار کیا گیا تھا نہ اُن کے آگے ماسیہ عبودیت بجالائے گئے تھے۔

إِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ

وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَصَالِحِينَ ۚ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ۚ الْحَاقَّةُ
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝ (نوبہ : ۳۱)

”انہوں نے اپنے عمار اور درویشوں کو اللہ کے سوا پناہ بنا لیا اور اسی
طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا
حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان
شکاکہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔“

اسی طرح قرآن اس عقیدہ کو ذہنوں میں جاتا اور اس طرح کی تشبیہ و توضیح کرتا رہتا ہے
تاکہ انسانی ضمیر کو الوہیت اور تقدس میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کی غلطی سے منع کیا کرے۔ شک
ضمیر کہ کچھ اور وجدان کو دیتا ہے اور بالآخر اسے اللہ کے بندوں بنائیں سے کسی کا بندہ بنا کر
رکھ دیتا ہے۔ کوئی اگر خدا کا نبی یا رسول ہو تو بھی وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہی رہتا ہے
خدا نہیں ہو جاتا۔

جب اس بات کی نفی ہو گئی کہ اللہ کے سامنے کوئی بندہ کسی دوسرے بندہ سے بحیثیت
بندہ کے کسی امتیاز کا حامل ہے تو اسی سے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطوں اور
سیلوں کی بھی آپ سے آپ نفی ہو گئی۔ یہ کہانت یا توہل کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ ہر بندہ
اپنے خالق سے براہ راست تعلق جوڑے گا۔ اس کی لازماً روحانی ذات ازل و ہدیٰ ہے یا
قوت سے تعلق جوڑے گی تاکہ اس سے طاقت، عزت اور عزت و بہت حاصل کرے۔ اس کے
رہم و کرم اور لطف و عنایت کی پاشنی پائے اور اس کی روحانیت میں بھی اضافہ ہو۔

اسلام کو اس کی بڑی نکر ہے کہ یہ تعلق مضبوط ہو اور فرد کا یہ احساس دیا جائے کہ وہ
رات کی گھڑیوں اور دن کے اوقات میں، ہر وقت اس عظیم دیے یاں قوت سے مدد چاہ سکتا ہے۔

اللَّهُ نَظِيفٌ بَعْدَ دَعَا (الشوریٰ : ۱۹)

”اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔“

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي سَمِيعٌ ۚ أَعِثُّ دَعْوَا الذَّالِمِينَ

وَإِذَا دَعَاكَ فَلْيَسْتَجِبْ لَهُ ۚ وَلَا يَمْنُنْ بِنِعْمَتِهِ يُرْشِدُ ۚ وَنَه (البقرہ : ۱۸۶)

در اسے ہی میرے بندے اگر میرے متعلق تم سے پوچھیں تو نہیں تلو
 کہ میں اُس کے قریب جا ہوں۔ حیرانہ و بے پناہ ہے تو میں اس کی پارسا
 در جواب دیتا ہوں: ہذا نہیں جائیے کہ وہ میں دعوت پر لبیک کہیں
 و رنجہ بر ایمان رہیں۔ بات نہ انھیں سنا دو شاید کہ وہ رہ راست
 رہیں۔“

وَمَا نَسُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ
 الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ ۝ (یوسف: ۸۰)

مناں رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اس کی رحمت سے تو بس کا رہی، یوس
 ہو رہے ہیں۔“

لَا يُعْبَادِي الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْطُوا مِنْ
 رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۝ (الرعد: ۵۲)
 یہ دیکھئے کہ اے میرے بندو! تمہوں نے اپنے ساتھ ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت
 سے مایوس نہ ہو، اللہ کنہ ہوں کو کٹھا معاف کر دیتا ہے۔“

سہم نے اپنے نامیہ فیاض و اردی میں جن میں بندہ روزانہ چند متعین اوقات میں اپنے
 رب سے مشورہ کرتا ہے، جس میں مخلوق اپنے خالق سے تعلق جوڑتی ہے۔ وہ اوقات اس کے
 علاوہ دنیا میں نہ دس ہفتے یا چارے کہ وہ اپنے آقائے حضور کو ابھو، اس کی طاعت متوجہ ہو، دعا کرے
 ۱۱۔ اس سے ۱۲۔ نماز یا دعا کا مطالب صرف مخصوص الفاظ و ترکات کی ادائیگی نہیں
 بلکہ اصل برکت یہ ہے کہ ایک وقت ان دعاؤں اور جسم سمیت پوری طرہ اللہ کی طاعت متوجہ ہو —
 اس بارے میں کئی اور بنیادوں فکر سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے کہ انسان ساخت و پرداخت میں
 اور خالق کائنات اپنی الوہیت میں ایک ہے۔

لَا يُلَاحِظُونَ إِلَّا لِلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝

(الماعون: ۴-۵)

”نبای ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔“

غیر انسانی بندوں کی غلامی سے آزاد اور تعلق باللہ کے ہمہ دم بیدار شعور سے معمور ہوتے ہی جان و مال اور عزت و جاہ کے سلسلہ میں ہر طرح کے خطرات اور اندیشوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اندیشے اور خطرات بڑے ہی ہلکے ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی خودداری کو مجروح کر دیتے ہیں اور بسا اوقات تو اسے ذلت گوارا کرنے، بہت سے حقوق سے دست بردار ہو جانے اور بڑی حد تک اپنے عزت و شرف سے ہاتھ دھو لینے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ اسلام اس بات کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ لوگوں کی عزت و آبرو اور ان کے شرف و جاہ کے تحفظ کی ضمانت دی جاتے۔ ان میں صحیح قسم کی خودداری اور عزت نفس پرورش پائے اور وہ عدل و انصاف کے قیام کے نگران و محافظ بن کر رہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس طرح قانون کے علاوہ ان باتوں کے ذریعہ بھی وہ ایک مکمل اور مطلق اجتماعی عدل کے قیام کی نیت کرے جس میں کوئی انسان اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔ ان اغراض و مقاصد کے پیش نظر اسلام کو اس بات کی خصوصی فکر ہے کہ انسان اپنی جان، پیٹ بھرنے کے لیے غذا اور زندگی میں اپنی حیثیت ان تمام کے سلسلہ میں ہر طرح کے خوف و خطر سے آزاد رہے۔ زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کسی فلاح میں اتنی قدرت نہیں کہ وہ اس کی مدت عمر میں سے ایک گھڑی یا اس سے کم کے بقدر بھی کمی بیشی کر سکے۔ کوئی مخلوق زندگی میں سے ایک سانس بھی نہیں کم کر سکتا نہ ہی ذرہ برابر نقصان پہنچانے کی سکت رکھتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كَتَبْنَا بِأَمْوَالِهِمْ (سورہ عمرہ: ۱۲۵)

”کوئی ذاتی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔“

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا جِ (التوبہ: ۱۱۱)

”کہو، ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔“

اللہ ہی ہمارا مولا ہے۔“

لَكِنْ أُمَّةٌ أَجَلٌ ۖ إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً

وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (یونس: ۴۹)

”ہر امت کے لیے ہلت کی ایک مدت ہے۔ جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی

بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی۔“

یہاں بزدلی اور بزدلوں کی گنجائش نہیں، کیونکہ زندگی اور موت اور نفع و نقصان سب

جو آسمان وزمین سے تم کو روزی فرماتا رہتا ہے، بجز اس کے کوئی نہ نہیں۔

پھر تم کہاں پہلے جا رہے ہو؟

وَاتَّقُوا اور ڈرنا کہ میں اِمْلَاقُہ نَحْسُ نَزَّاتُكُمْ وَابْتَ هُذ ۛ

والانعام ۱۵۱

”اپنی اور کو نفس کے ڈر سے نسل نہ کرو۔ جتنے بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی

دیں گے۔“

وَلَنْ حَفَّتُمْ غِيۡنَةً مِّنۡ سَوۡفِ نَعۡيۡكُمۡ اَللّٰهُ مِّنۡ فَضۡلِهٖ اِنۡ مَّا ۛ

النور ۲۸۶

”پر ہمیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ سے تو تمہیں بے نقص سے مل کر دے۔“

وہ بتاتا ہے کہ فقر، فاقہ کا خوف دراصل شیطان دوسو کا نتیجہ ہے جو اس کو ہر

ہماری طبیعت کو کمزور بنا کر ہم سے خواہنا، خودداری اور غنا، علی اللہ کی قیمتی صفات چھین

ایسا پاتا ہے۔

الشَّيۡطٰنُ يَعدُّكُمُ الْفَقْرَ وَبِأُمۡرِكُمۡ مَّا لَفُحۡشًا ؕ ۛ اَللّٰهُ يَعۡدُكُمُ

مَغۡفِرَةً ۛ مِّنۡهُ وَفَضۡلًا ؕ وَاللّٰهُ دَاسِعٌ عَلَیۡكُمۡ ؕ ۛ السّٰقِر ۛ ۛ ۛ

”شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور تمہیں ناسا کے زعم کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ

تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا ذات دست اور دانا ہے۔“

اس حقیقت کے پیش نظر یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ حصول معاش لوگوں کو ہر جگہ

پر مجبور کر دے۔ ان کی روزی دراصل عفو اللہ کے ہاتھوں میں ہے۔ بندوں میں سے تقیہ و ضعیف بندوں

میں سے کسی کو اتنی قدرت نہیں ماحصل کر کسی آدمی کو روزی دے یا اس میں کچھ ملکی مال سکے اس بات

سے اسباب و وسائل کی نفی نہیں ہوتی۔ البتہ یہ خیال ال کو مضبوط بنانا ہے نہ کہ قوت بخت و

اور مفلس طالب معاش کو پوری قوت و ہمت کے ساتھ ان سے آنکھیں پکڑنے کے قابل بنانا ہے

جن کے ہاتھوں بظاہر اس کے رزق کی کبھی ہوتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب خط و دائرہ اس کے

اپنی خودداری اور عزت نفس کو قائم رکھنے اور اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے سے نہیں روک سکتے

اور نہ اس بات پر مدد کر سکتے ہیں کہ دوری پر آنی نہ گئے دینے کی خاطر وہ اپنی واقعی اجرت یا اپنی
موت کے اخراجات سے دست بردار ہو جاتے

وقت کی ہریت اور سلام کے وقت کو کسی نماز سے بھٹایا جیسا کہ جہاں تھیں وہاں ہے
یوں ہی ساری اہمیت کے ساتھ یہ سلام کے بنیادی اور عمومی فائدہ سے بہرہ مند
اتحاد و انس کے حین جانے و فوت ہونے اور مصیبت و رفقہ و مدد کے وقت
بہرہ مند ہوتا ہے۔ سلام چاہے کبھی نہ ہو مگر خوف سے نہیں جاتا۔ نہ اس سے کسی
معاشرے میں جتنی بندہ نہیں بدکار نہیں ہو سکتا۔

فَلْيُحَذِّرُوا بَيْنَ يَدَيْكُمْ نَارَ الْخُلَاسِ إِنَّ نَارَ الْخُلَاسِ هِيَ
مَنْعَرَةٌ مِنْ أَعْرَافِ النَّارِ تَلْجُ فِيهَا الْوُجُوهُ وَهُمْ فِيهَا كَالْعِخْلِ
وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهَتِهِمْ كَاذِبُونَ (آل عمران: ۲۶)

”خدا، اللہ کے نام کو جسے یہ بے حکومت دے اور جس سے چاہے
جیسے سے چاہے نہ مانے بچتے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھائی تیرے
خفا رہتا ہے۔ سب کو تو یہ خبر تو یہ ہے۔“

”اس میں سب سے بڑا گناہ ہے کہ سنی و شیعہ متحد ہو کر خدا کے
اس سے بڑے گناہوں سے بچیں اور اللہ کی تسخیر کریں۔“
(المؤمنون: ۵۸-۵۹)

ہو سکتا ہے کہ کس کے ہاتھ میں ہے اور کون ہے جو پناہ دیتا
ہے بہن تم کے بڑے کو پناہ دے دے اور کوئی نہیں۔ اگر تم بہن سے ہو تو اس کا
توبہ دو، وہ جواب دیں گے کہ نہ۔ کہو، پھر کس جادو کے پیچھے (حق سے دور)
پلے جا رہے ہو۔“

اِنْ تَصْرُكْهُ اِنَّكَ فَاِذَا تَصْرُجُ وَاِنْ تَخْذُلْهُ فَاِنَّكَ فَاِذَا تَخْذُلُ
تَصْرُكْهُ فَاِنَّكَ فَاِذَا تَصْرُكْهُ (آل عمران: ۱۶۰)

اگر تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں عبور دے

تو اُس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہے؟

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْغَيْثَ فَلْيَتَّخِذْ الْغَيْثَ حِجِينًا (ماعر : ۷۰)
 جسے غرت کی طلب ہو وہ جان لے کہ غرت ساری کی ساری صرف خدا کے

قبضہ قدرت میں ہے۔

وَلِلَّهِ غَيْثٌ لَا يَرَىٰ سُلَيْمٌ وَلِلَّهِ الْغَيْثُ الْمُنِينُ (المنافعون : ۲)

”غیت اللہ کو سزاوار ہے اور دیکھ اس کے ذریعہ، اس کے رسول اور مومنین

کے لیے۔“

پس اس پہلو سے بھی اندیشہ و خطرہ کا کوئی سوال باقی نہیں رہا کہ قدرت طاقت

صرف اللہ واحد کی ذات کو منحصر ہے اور عزت ساری صرف اُسی کے حقد میں آتی ہے۔

وَهُوَ الْغَايُتُفَوْقُ بِعَادَةٍ ۖ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ

(الانعام : ۱۸)

”وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور

اور باخبر ہے۔“

تقدس سے مرعوبیت یا جان و مال اور مقام و منزلت کے پارے میں اندیشوں و رُغائیں

کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی غلامانہ ذہنیت سے تو انسان جلد آزاد ہو جاتا ہے لیکن ان اہمیت کی

قدروں کی پرستش سے بچنا بڑا مشکل کام و دولت، باہ و شہرت اور حسب و نسب پر مبنی

ہوتی ہیں۔ خواہ وہ انسان کو نہ فائدہ پہنچا سکتی ہوں نہ نقصان۔ پناہیہیب و بدان ان اقدار

میں سے کسی سے محبوب و متاثر ہو جاتا ہے تو اسی تار کی حد تک اس کی آزادی بھی تھیں جاتی ہے

اور بہن لوگوں کو یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان کے سامنے وہ حقیقی مسادات کے شعور سے محروم

ہو جاتا ہے۔ یہاں اسلام آگے بڑھتا ہے اور ہر کسی کو اپنے تفریط کے ان تمام اذکار کے اس

مقام پر رکھتا ہے جو انہیں زندگی میں واقعہ حاصل ہونا چاہیے وہ حقیقی قدر ان کو ان معنوی

اور قائم بالذات مطلق اور غیر اضافی معیاروں پر کھتا ہے جو وہیں انسان کے اندر اس کے

ذہن کے کسی گوشے میں مستور ہوتے ہیں یا اس کے عمل میں نمایاں اور ظاہر ہوتے ہیں۔ اُس کے

نفس نہایت اس سے آگے بڑھ کر ان کو ان قدروں میں سے نہیں شمار کیا جاسکتا جو انسان کی بندگی
وہستی کا اصل معیار ہیں۔ "وَابْقِيَتْ صَلَاحُ خَيْرٍ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرًا مِّنْهُ"
رہا تو رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجہ کے ہی طے سے بہتر ہیں اور ان ہی سے اچھی امیدیں وابستہ
کی جاسکتی ہیں۔ (الکہف: ۳۶)

قرآن نے مادی اور معنوی قدروں کی حقیقت دو آدمیوں کی نفسیات کی عکاسی کر کے
اس طرح واضح کر دی ہے کہ اس کے بعد اس بارے میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں باقی رہتی کہ ان قدروں
میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح حاصل ہے۔ اس نے ایک مؤمن کی نفسیات اور اس کے ذہن میں
مختلف اقدار کو جو مقام حاصل ہوتا ہے اس کی پوری پوری تصویر کشی کر رکھی ہے۔

وَأَضْرِبْ لَّحْمَ مَنْ لَدَ الْجَنَّةِ جَمْعًا لَا يَخُدُّ هِمًّا جَنَّتِينَ مِّنْ أَعْنَابٍ
وَحَفَافًا هَمًّا مَّخْلُوجًا وَجَعَلْنَا لِيُفْهِمًا زُرْعًا كَثِيرًا مِّنَ الْجَنَّتَيْنِ
أَلْتَأْكُلُوا لَمْ نَطْعِمْ مِنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا خِلْفَهَا نَهْرًا هَٰذَا وَكَانَ لَدَى
نَهْرِهِ نَقَالٍ بِصَاحِبِهِ هُوَ بِحَادٍ هَٰذَا أَكْثَرُ مِنْكُمْ مَا لَا تَعْمُرُونَ نَهْرَهُ
وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذَا
أَبَدًا هَٰذَا وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ وَآتِيَةً هَٰذَا وَلَئِن رُّدِّدْتَ إِلَىٰ رَبِّكَ لَاحِدَّتْ
خَيْرًا مِّنْهَا مُقَلَّبًا هَٰذَا قَالَ لِيُفْهِمًا هَٰذَا وَهُوَ يُفْهِمًا هَٰذَا أَكْفَرْتَ مَا لِي
خَلَقْتُكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّيْتُكَ رَجُلًا هَٰذَا بَلَّغْتُ هَٰذَا لَدَىٰ
رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا هَٰذَا وَلَوْ أَدْرَاكَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا سَاءَ اللَّهُ
لَا مَوْءَاةَ إِلَّا بِأَلْفِ اللَّهِ هَٰذَا تَرَىٰ أَن أَلْفَ مِنْكَ مَا لَا وَءَاةَ لَدَا هَٰذَا فَعَسَىٰ رَبِّي
أَن يُؤْتِيَنِي خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلْ عَلَيْهَا حِصْبًا مِّنَ السَّمَاءِ نِطْحًا
صَعِيدًا زَلَقًا هَٰذَا وَبُصِيعًا مَّا هَٰذَا غَوْرًا فَلَن تَسْتَطِيعَ لَدَىٰ طَلَبَاهُ
وَأُحِيطَ بِشَمْرِهِ هَٰذَا فَاصْنَعْ بَقِيَّتَ كَفَّيْنِ عَلَىٰ مَا أَلْفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَادِيَةٌ
عَلَىٰ عُرْوَتِهَا وَيَقُولُ يَلِينِي لِمَ أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا هَٰذَا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ
فِيهِ يَتَصَوَّرُونَ هَٰذَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِرًا هَٰذَا (الکہف: ۳۲-۳۳)

”اے محمد! ان کے سامنے یک شل پیش کر دو۔ مجھ سے نہیں۔ میں سے ایک کو بہرے
 انگور کے دو دانہ دیے۔ درخت سے گرنے لگے۔ کھجور کے، حسوں کی، زیتون کی اور اس کے درمیان
 کاشت کی زمین بھی۔ وہ خوب، شاخ خوب سے بھروسے اور زرخیز بننے میں خاص
 در اسی کسر بھی نہ چھوڑی۔ اس باغ کے درختوں سے ایک بہ جاری کر دی اور اسے خوب
 نفع حاصل ہو۔ یہ کھجور ایک دن ۱۰۰۰۰ روپے ہمارے سے مانگ کر لئے ہوئے ہوا۔
 ”میں سمجھ سے زیادہ ہوا۔“ میں نے
 درخت سے زیادہ ہوا۔

نفس و کفایت ہوں: یہ وہ اپنے باغ میں حاصل ہو۔ درختوں سے کس کے حق میں
 خاتم ہر کر کہنے لگا۔ میں نہیں سمجھا کہ۔ دست بھی تھا ہوتا ہے کی درختوں سے
 نہیں کرتا۔ من کی کھڑی کھیلتے گی۔ یہ کھجور بھی کبھی اپنے رب کے حضور پیش بھی گیا
 تو خدا درمیان سے بھی زیادہ دست دراز ہو گیا۔ اس کے ہمارے یہ تصور کرنے ہوئے
 اس سے کیا کیا ہو کہ کرتا ہے۔ اس ذات سے جس نے مجھے مٹی سے اور پانی سے
 پیدا کیا۔ اور تجھے جب حور آملی سے کرکٹ کیا، اور اس میں وہ رب ہی خدا ہے
 اور میں اس کے ساتھ کسی کوشش میں کیا۔ اور جب وہ جنت میں داخل ہو رہا
 تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں۔ ”خدا کہ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ“
 اگر وہ مجھے مال دے، یہ یہ ہے کہ نہ پورا ہے۔ یہ عید نہیں کہ میرے رب مجھے تیری جنت
 سے بہتہ عطا فرمادے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ
 صاف مہلت سے نہ رہ سکے۔ یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے۔ دیکھ تو اسے کسی دن
 نکال سکے۔ ”آذکار ہو اب کہ“ میں کا سا رٹا رہا، اور وہ اپنے انگور کے باغ کو
 لٹکیوں پر اٹھا کر ادیکھ کر اپنی سگائی ہوئی رگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ
 ”کاشت میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کوشش میں نہ کیا۔“

وہ ہوا اللہ کو

اسے یعنی جو کچھ اللہ چاہے گا وہی ہوگا۔ یہ اور کسی کا کچھ زور نہیں۔ ہمارا اگر کچھ پس میں سکتا ہے تو شہر کی توفیق
 و تائید سے چل سکتا ہے۔

کے لیے نہ کوئی گروہ تھا جو اس کے کام آسکتا نہ وہ کہیں اور سے کسی طرح کی مدد حاصل کر سکتا۔ کل جن لوگوں نے اس کی یوزریشن کی تساہی یہ کی تھی وہ کہنے لگے: آہ (بے یار تلخ حقیقت سامنے آئی کہ) درحقیقت اُمید ہی اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے رازوں میں کشادگی عطا کرتا ہے اور (جس کے پیٹ سب بھگتا ہے) تنگی پیدا کرتا ہے۔ اُمید نے اگر بہر پر کرم نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیا ہوتا۔

”وہ حقیقت یہی ہے کہ کفر کی روش اختیار کرنے والے فلاح نہیں پا سکتے۔“

اسلام اپنے اس فکر پر مختلف نتائج ترتیب دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حساب برآب مال و منال کو کسی قدر وقیمت کا حامل قرار دینے سے منع کرتا ہے جو بعض لوگوں کے لیے مایہ ناز اور باعث افتخار ہے، کیونکہ وہ آزمائش اور امتحان کے لیے دی جاتی ہے۔

وَمَا مَنَعَكَ إِلَىٰ مَا مَلَغَتْهُ أَبْوَابُ الْأَرْجَاءِ مَنَعَهُ
 زُخْرُهُ ۖ أَلَمْ يَكُن لَّهُ الْيُسُورُ ۚ
 وَأَلْقَىٰ ۝ (طہ ۱۳۱)

”اے سوچوں والے دنیا کو ہم نے جو دروازے دے رکھا ہے اس کی طرف سےپائی نظر نہ آئے۔ یہ دنیاوی زندگی کی آس و تاب ہے جس کے در بعد ہم اُن لوگوں کو زما تے ہیں۔ یہ سے رب کے پاس جو رزق ہے وہ ستر بھی ہے اور پاندر بھی۔“

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اور اس طرک کی آیتیں غریبوں کو اپنی حالت پر قناعت کرنے اور امداد کو ان کی امارت و ثروت میں مست چھوڑ دینے کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ سہ اصل استنباط ہے۔ اس آیت کی یہ تفسیر اسلام کی روح سے کوئی منہ بست نہیں رکھتی۔ دراصل یہ اُن پیشہ ور دنیاداروں کی تفسیر ہے جن کی غرض ہی یہ رہی ہے کہ ملوکیت اور استبداد کے دور میں عوام کے شعور و احساس کو مردہ و بے جان کر کے انہیں اجتماعی عدل کے مطالبہ سے باز رکھیں۔ اُن کا مجرم اُن کے سر ہے۔ اسلام اُن کی اس توڑ مروڑ سے بری ہے۔ فی الحقیقت یہ اور اس طرح کی دوسری آیات اس لیے آئی ہیں کہ انسانی قدروں کو اُن کا کھویا ہوا مقام واپس لائیں اور غریبوں کے ذہن

سورہ میں کمزوری اور بے جہت سے نکالیں۔ میں وہاں مبتلا جیسی شخصیات کی قدروں سے مرعوب ہو کر مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔

ہم نے اس توجیہ کی تائید اس بات سے بھی جوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو متعین فرمائی کہ ان قدروں کو کوئی اہمیت نہ دیں اور نہ ہی ان کو معیار بن کر لوگوں کا معیار متعین کر دیں:

وَضَرَبْنَا عَلَى قُلُوبِهِمُ الْغَمَامَ وَالنَّاسُ عَنْهَا مُعْمِئُونَ
وَالَّذِينَ يَدْعُونَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ
وَالَّذِينَ يَدْعُونَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ
وَالَّذِينَ يَدْعُونَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ
فَرُطَاهُ (الکہف: ۲۸)

”وہ بے درجہ لوگوں کی معیت پر معین ہو جو اپنے رب کی رضا کے حصول پر کوشش کر رہے ہیں۔“
”میں نے ان کے دلوں پر غما کر دیا اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیر دی۔ کیا تم یہی کہہ رہے ہو کہ یہ لوگ اپنے رب سے بے رغبت ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیر دی۔ کیا تم یہی کہہ رہے ہو کہ یہ لوگ اپنے رب سے بے رغبت ہیں اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیر دی۔“

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ النَّاسُ لِيُفْتِنَهُمْ ۚ
بِمَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَتَرْهَقُهُمْ ذُنُوبُهُمْ ۚ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْهُمْ ۚ

التوبة: ۵۵

”ان کے مال و دولت اور ان کی کتیتیں اور اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے دربار سے ان کو دنیا کی زندگی میں مبتلا سے عذاب کرنے والا ہے اور یہ جہنم میں آئیں گے۔“
”تو انکار حق ہی کی حالت میں دیں گے۔“

اس سلسلہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن ابی مکتوم نامی، بیت اور سردار قوم دلیہ بن مغیرہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ قابل ذکر ہے۔ وہ واقعہ جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر عتاب فرمایا:

فَبَسَّ وَتَوَلَّى ۚ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهِ يَزْكَا ۚ أَوْ
يَذْكُرُ فَتَنْفَعَهُ الْبَصَرُ ۚ أَمْ مَا مِنْ شَفَعَى ۚ فَأَنْتَ لَكَ تَصَدَّقُ ۚ

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزْكِيَهُ ۖ وَآمَّا مِنْ جَاءَكَ يُسْعَى ۖ وَهُوَ يُخْشَى ۖ فَأَنْتَ
عِنْدَهُ تَلْهَى ۖ كَلَّا ۖ إِنَّا نَسْتَدْرِكُ ۖ فَنُشَاءُ ذِكْرَهُ ۖ (عیسٰی ۱۰۴)
”اندرمے کے آنے پر پیہری چڑھاؤ درمذہب سے یا۔ تجھے کیا معلوم کہ وہ نزیک حاصل کرتا
یہ تیرے تذکرہ ہوتا اور یہ یاد دہانی اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوتی۔ جو استغنا برتنا ہے
تو تو اس کے پیچھے پڑتا ہے۔ اور تجھ پر گناہ نہیں کہ وہ نہیں سنوتا، اور جو خود سے دور کر
تبدیل سے پاس آتا ہے اور اس کے نزدیکی میں رہتی ہے تو اس سے تیرے لیے نفعی
برنستے ہو۔ مگر نہیں دیکھو یہ غلط ہے، یہ ذکر ہے پس جو چاہے اس سے یاد دہانی
حاصل کرے۔“

یہ لمحہ انسانی درس کا ایک لمحہ تھا جو محمد ﷺ پر آپ کی اس فکر
میں گہرا گیا کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ ولید کو اسلام کی طرف مائل کر دے۔ چنانچہ جب ابن ام مکتوم کچھ
قرآن سیکھنے آپ کے پاس آئے تو آپ ولید کے گفتگو میں مصروف تھے، اب یہ آپ کو پکارے
ہمارے ہیں اور آپ ہی کہ ولید ہی کے سلسلہ میں مصروف رہے اور ان کی اس بات کو برا مانا یہاں تک
کہ نبی ﷺ کے چہرہ پر شکن آگئی۔ اس پر نبی نے اتنا شدید عتاب فرمایا جو جھڑکی کی سرحدیں
چھو رہا ہے۔ یہ کیوں؟ تاکہ جن قدروں پر اسلام کی عزت و بلندی کا مدار ہے وہ اپنی صیغہ اہمیت کے
ساتھ دامنچ ہو جائیں اور آزادیِ ضمیر کے سلسلہ میں اس کا موزوں رجحان اور مناسب طریقہ عمل متحقق
ہو سکے۔

انسان تقدس اور بزرگی سے معویت اور اس کی پرستش کے پھندے سے جلد نکل آتا ہے
اور اللہ شاہد اللہ بڑی حد تک ہمت سے مصائب نقدِ فاقہ اور ذلت و خواری کے خوف سے
بھی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ وہ دوسری سماجی قدروں اور تمام خارجی معیاروں کے دباؤ سے بھی
آزاد ہو جاتا ہے۔ لیکن نفس کے لیے خود اپنی غلامی سے نکلتا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی مطلوبات اور
خواہشات کا غلام بنا رہتا ہے، اپنی اغراض و ابوا کے پکڑے نہیں نکل پاتا۔ خارج سے آزادی یا نہ
کے بعد انسان داخل کے بندھنوں میں بندھ جاتا ہے اور ایسی شکل میں وہ شعور و وجدان کی اس مکمل آزادی
تک نہیں پہنچ سکتا جس تک اسلام اس کو عظیم الشان اور ہمگیر انسانی عدلیہ اجتماعی کے قیام کی خاطر پہنچانا

توڑ چکا ہو۔ وہ دعوت دیتا ہے کہ نفس کو اس سانچہ میں ڈھالا جائے، اگر وہ تھیں ضروریات سے ہنس
 بیوسا ہے۔ آپ اپنے قابو میں رہے اور رضی و رقیہ مرغوبات کی بجائے ان چیزوں کی طرف پکے
 جو ہنتر و وسیع تر ہوں۔ اسی طرح اسلام کہتا ہے کہ:

ذُرِّبَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ
 الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْبِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْعَاقِ
 وَالْخُرْثِ ۚ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ مُنْتَقِلُ
 الْمَنَاقِبِ ۗ قُلْ أَزُنبُكُمْ بِمَا تُحِبُّونَ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
 قُلُوبَكُمْ ۗ قُلْ أَزُنبُكُمْ بِمَا تُحِبُّونَ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ
 قُلُوبَكُمْ ۗ قُلْ أَزُنبُكُمْ بِمَا تُحِبُّونَ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ (آل عمران ۱۴۱-۱۴۵)

”لوگوں کے لیے مرغوبات، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے
 موسیقی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آمد بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب جہنم و زرہ زندگی
 کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہت شگنائے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو
 میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو بگ تقویٰ کی روش اختیار
 کریں ان کے لیے ان کے رب کے پاس پاشا ہیں، جس کے نیچے بہت سی بہتیاں ہوں گی۔
 وہاں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ سیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور
 اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ نے بندوں کے روتے یہ گہری نظر رکھتا
 ہے۔“

یہ یقین نہ تو غفلت و جمود میں مبتلا رکھے کی کوشش ہے نہ ہی ترکِ دنیا اور پاکیزہ اعمال
 جیسے دوسرے پریشانی کی دعوت، جیسا کہ بعض مفسرین نے اپنے ذوقِ لی مناسبت سے سمجھا ہے، جیسا کہ
 نبی لہیں، اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اس کے ساتھ تپتے ہیں۔ یہ تو طبیعت اور خواہش کی تلاوی سے
 نجات حاصل کرنے کی دعوت ہے۔ اگر انسان زندگی اور اس کی مسترتوں اور لذتوں کا غلام بننے کی
 بجائے انہیں قابو میں رکھے رہے تو ان سے لطف اندوز ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ ۖ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ

الْوُزْقُ مَا (اعزوفہ : ۳۲)

”کیسے اشد نے جو ریت اپنے ہمدرد کے لیے پید کی اس کو اور کھانے پینے کی اشیاء

میں سے پاکیزہ چیزوں کو کس نے حرام ٹھہرایا؟“

وَلَا تُنْسِ صَيْبِلُ مِنْ الذَّنْبِ - رخصت : ۱۱۱

”دنیا میں اپنا حصہ حاصل کرنا، نہ بھول جانا“

اس سلسلہ کی ایک کڑی روزہ کی فضیلت بھی ہے تاکہ کچھ مفسد نفس طبیعت کے شہ

تقاظوں اور بنیادی مذہبوں سے بھی بلند رہے اور نتیجتاً اس کے رادہ میں مزید قوت اور

بلندی پیدا ہو اور اس رت اپنی مذہبیات سے بلند ہونے کے بعد اسی نفس کو بے ہوش

انسان اپنی ذات سے بھی بلند ہو جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اس میں مختلف طریقے اختیار کرتا ہے اور ان طریقوں میں سے

ایک یہ فتنہ مٹانے والی توفیق سے تاکہ اس کی توفیق ہوگی۔

لَا تَكُنْ كَالَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (۱)

ہمارے ہمارے اور ہماری اور اس میں ہمارے ہے مہم سوا کرنا جس میں

اس میں اور دنیوی زندگی میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں اس میں

کو گود میں لیے نکلے اور آپ کی زبان پر یہ حملہ تھا:

إِنكُمْ لَتُبْخِلُونَ وَلَتَجْبَنُونَ وَتُجْحِلُونَ۔ (ترمذی)

وہ (وہ) کو مخاطب کر کے فرمایا، تم بہ بخیل بناتے ہو اور نیردل بھی اور تم ہی جہالت میں

مبتدل کر دیتے ہو۔

آدمی ان تمام چیزوں سے چٹپکارا حاصل کر لیتا ہے جو اس کے عز، شرف پر کھلے بندوں
حملہ آور ہوتی ہوں۔ لیکن یہی انسان کبھی حاجت مند بھی ہوتا ہے۔۔۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ وہ ایک لقمہ کا محتاج ہے۔۔۔ بس یہاں آکر وہ ذلیل ہو جاتا ہے۔ اس لیے نہ ذلت و خواری کی
دھن لے جانے میں ضرورت سب سے آگے آگے ہے۔ خالی پیٹ کو دھپی باتیں نہیں سوجھتیں۔
انسان کبھی دست سوال دراز کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے اور یہ چیز اس کی عزت نفس کو خاک میں ملا کر
رکھ دیتی ہے۔ یہاں اسلام آگے بڑھتا ہے اور معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو قوانین
بن کر حل کرتا ہے جو ایک طرف تو فقر و محتاجی پیدا کرنے والے اسباب کا سد باب کرتے ہیں۔ دوسری
طرف اگر یہ خرابی پیدا ہو جائے تو اس کا ازالہ کرتے ہیں۔ خیر خیر قوم کے ذی استطاعت
لوگوں کو ریاست پر فرد کا حق بقدر کفایت لازم قرار دیا گیا ہے اور اسے ایک ایسا فرض قرار دیا گیا
ہے جس سے ترک کرنے پر ترک کرنے والے سے دنیا میں جنگ کی بجائے کی اور آخرت میں اس کے نئے شدید
عذاب ہو گا۔ انہیں آئے "اسلام کی اقتصادی پالیسی" میں آتی ہے، پھر اسلام دست سوال
دراز کرنے سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ مسلموں کے ایسے یک گروہ کی تعریف کرتے ہوئے جو زندگی رہ
کے کاموں میں کچھ ایسا مشغول ہو گئے ہیں کہ حیل یہ کر رہے ہیں کہ ان سے فائدہ ہے، ان لوگوں سے بہت کر
نہیں مانگتے۔ (يَسْأَلُونَ النَّاسَ اَلْحَقَّ)۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک سائل کو ایک
درہم عنایت فرماتے ہیں اور پھر اسناد فرماتے ہیں کہ یہ بات کہ تم میں سے کوئی تمہیں اپنی رسی سنبھالے
درہم جلانے کی کمیوں کا ایک گٹھا پن کے اسے اپنی بیٹی یہ اٹھالے اور فروخت کرے اور اس طرح
انہیں اس کی آبرو سلامت رکھے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے کہ لوگوں کا پیٹ
تو اسے کچھ دیں ورنہ نہ دیں (لَا يَأْخُذُ أَحَدُكُمْ حِمْلًا نَبَاتًا بِحِزْمَةِ خَطْبٍ عَلَى ظَهْرٍ
فَيُبَيْعُهَا، فَيَكُفُّ اللَّهُ بِهَا وَجْهَهُ خَيْرٌ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ النَّاسَ، أَمْطُوا أَعْمُوهُ۔
(بخاری و مسلم)

اہم بنیاد ہے۔ بلکہ یہی وہ اولین بنیاد ہے جس پر دوسری بنیادیں قائم ہیں۔

انسانی مساوات

حقیقی مساوات کے سارے لوازم یک ایک کر کے اکتفا ہو گئے۔ انسان کا ضمیر و وجدان پرریخت آزاد ہو گیا اور غلامانہ ذہنیت کے تشائبہ سے بری ہو گیا انسان غبت و انت بتکلیف و مصیبت اور موت کے اندیشوں سے یہ سمجھ کر بے نیاز ہو گیا کہ کوئی بات اذن خداوندی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ سب ہی اور اقتصادان فندروس کے دباؤ سے بھی کھل آیا اور دست سوال دراز کرنے کی ذلت سے بھی بچ گیا خود اپنی خواہشات و امیال سے بھی بلند ہو کر اس یکتا اور منفرد خالق کی طرف متوجہ ہوا جس کی مامیت بلا تیز بندہ و آقا سارے انسان رت کرتے ہیں۔ ان باتوں کے پہلو پر پہلو ہر فرد کو بقدر کفایت نہاد ریا زندگی بھی مینہ آگئیں۔ اب حقیقی مساوات کے سارے لوازم بھی ہو گئے اور مساوات انسان کی رگ پے میں سہایت کر گئی۔ انسانی ضمیر اب اس کا محتاج نہیں رہا کہ کوئی اس کے لیے مساوات کے لفظی نعرے بھی بلند کرے۔ کیوں کہ یہ مزاج بن جانے کے بعد اب وہ ان امتیازات کو برداشت کرنے سے کھار کر دے کا جو صرف معاشقہ اور معاشی بنیادوں پر قائم ہیں۔ مساوات کے اس تصور کے تحت اب وہ اپنے حقوق کا سب بن کر مچھے کا ارباب بن حقوق کو حاصل کرے گا نوٹ کے تحفظ میں کوئی کس نہاد ریا رکھے گا۔ اسے یہ حقوق عارضی ہوں گے۔ وہ ان کے لیے قربانیاں دے گا، مصیبتیں سہے گا اور اس حملے کا تذکرہ مقابلہ کرے گا جو اس کے حقوق پر کیا جا رہا ہے۔

اس مساوات کا تصور یہ ہے کہ میں گھر کر چکا ہو گا۔ اس کی رشت پر ہر فرد کو بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی قانولی ضمانت بھی حاصل ہوگی۔ اس لیے اس کے طالب و حامی صرف کمزور و درخیز لوگ نہ ہوں گے بلکہ وہ اصحاب ثروت بھی اس کی پشت پناہی کریں گے جن کے دل اسلامی تعلیمات سے منور ہوں۔ چودہ صدی قبل مسیح میں سماج میں عمل یہی ہوا تھا۔ اس کی تحصیل آئندہ مناسب موقع پر سامنے آئے گی۔

ان باتوں کے باوجود اسلام نے آزادی ضمیر سے ضمنی طور پر مستنبط ہونے والے مقبومات پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ اصول مساوات کی لفظاً اور منصوص طور پر صاحت کر دی تاکہ بات بالکل متعین

دَعَا إِلَىٰ خُبْرٍ وَلَدَاةٌ وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۚ إِنَّ
 كُلُّ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا أَتَىٰ الرَّحْمَنَ عَبْدًا ۚ لَقَدْ أَحْضَضْنَاهُمْ
 عَنْهُمْ عَذَابًا ۚ وَكَلَّمَهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا ۝ (مريم: ۶۴-۶۵)
 .. وہ کہتے ہیں رحمن نے کسی کو بیٹا بنایا ہے، سخت یہودہ بات ہے جو تم لوگ سمجھ لے
 ہو۔ قریب ہے کہ آسمان میٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں۔ اس
 بات پر کہ لوگوں نے رحمن کے لیے اوماد ہونے کا دعویٰ کیا، رحمن کی یہ شان نہیں
 کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ زمین و آسمان کے اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں
 کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے اور اس نے اُن کا شمار کر
 رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرد فرد اُس کے سامنے حاضر ہوں گے :-

شاید خون کا دعویٰ بھی باطل ہے۔ شاید خون اور مائی خون کی قسم محض ایک
 نسانہ ہے اور اسی طنائے بات کہ کسی کو س سے پیدا کیا اور کسی کو پیر سے ۔

أَلَمْ تَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۚ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ إِلَىٰ
 قَدَرٍ مَّعْلُومٍ فَقَدَرُوا فُتُوحَ الْقُدْرَةِ ۚ ۝ (المرسلات: ۲۱-۲۲)
 ”کیا ہم نے تم سب کو ایک حقیر پانی سے نہیں بنایا؟ پھر ہم نے اسے ایک جائے قرار
 میں ایک تعین مدت تک رکھا۔ پھر ہم نے (مزید) تعین کی اور ہم بہت صحیح تعین کرنے
 والے ہیں“

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّا خُلِقَ ۚ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ۚ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ
 الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝ (الطارق: ۱-۲)

”انسان کو چاہیے کہ وہ غور کرے کہ اس کی تخلیق کس چیز سے ہوئی ہے، وہ ایک
 اچھلتے ہوئے پانی سے بنایا گیا جو پسلیوں اور ریرہ کی تہی کے درمیان سے جاتا ہے“
 وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُفُثٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَرْوَاجًا ۚ
 وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَنْحِلُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ
 وَلَا يَنْقُصُ مِنْ عُمرَةٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ (فاطر: ۱۱)

مذہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر صفہ کے ذریعہ تخلیق کو تکمیل تک پہنچایا، پھر اس نے
 تم کو جوڑے جوڑے بنایا، ایک سلسلہ نسل آگے چل سکے، دیکھو، مادہ، تارکے
 مرد کے غیوض میں جاتی ہے، بچہ جنم لے لیتا ہے۔ کوئی ذی حیات نہ تو ایک خاص عمر پاتا ہے
 ورنہ اس عمر میں ہی موت ہے مگر یہ کہ ساری باتیں یک جہٹ میں درج ہیں۔ یہ
 سب کچھ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔

عَنْ حَقِّ بْنِ الْوَيْلَانِ عَنْ سُلَيْمِ بْنِ طَيْفٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ سُلَيْمٌ يَطْفِئُ
 فِي قَرَارِ مَدِينَةٍ ۝ ثُمَّ خَشَعَتِ النَّفْطَةُ عِلْمَهُ فَخَلَفَتْ أَعْلَقَتُهُ
 مَصْفَعًا مَحْبَسًا ۝ مَصْفَعًا مَعْطَمًا فَكَبَّرْنَا السُّعْطَرُ لِحَمْدِهِ ثُمَّ
 انْتَانَهُ خُلْفًا ۝ أَحْرًا فَتَبَرَّكَ اللَّهُ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ ۝

(موصنون : ۱۲-۱۳)

”میر نے سارا کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک مضمون بنا دیا، جو کہ ہمیں
 تبدیل کیا۔ پھر میں جو مذہب توڑے کی شکل دی، پھر وہ توڑے کو بڑا کر دیا
 پھر بڑی کی بڑیاں بنائیں۔ پھر بڑیوں پر گوشت بڑھا دیا، پھر اسے کب دیا
 ہی موقوف بنا کر آیا، پس بڑا، کت ہے۔ سب کار گیروں سے تھا ہرگز
 کہ اس بات کو بار بار کہتا رہا، کہ ہر ذی حیاتی انسان مٹی سے بنی ہے اور بلا استثناء
 ہر ذی حیات پانی سے، جو میں آیا ہے۔ منشاء یہ ہے کہ سارے انسانوں کے ایک ہی اصل
 سے ہونے، ایک طہ سے پیدا ہونے اور ایک ہی طہ نشوونما پانے کی حقیقت دونوں میں جاگزیں
 ہو جائے۔ یہی کہ یہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ارشادات کے ذریعہ یہ بات کھول کھول کر سمجھا دی
 ہے، فرمایا کہ ”تم سب آدم کی نسل سے ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔“ انتہر بنو آدم و
 آدم من تراب و مسلم ابو داؤد)

جب یہ واضح ہو گیا کہ کوئی فرد بالذات کسی دوسرے فرد سے افضل نہیں تو کسی قوم یا نسل
 کا اپنے نسب و نسب کے اعتبار سے دوسری نسلوں اور قوموں پر فضیلت کا دعویٰ بھی باطل ٹھہرا۔
 ————— یہ دعویٰ وہی ہے جس کا آج بھی بعض اقوام نکلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کر رہی ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ
وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجًا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ

(النساء: ۱)

”لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی جان سے
سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کر کے دنیا
میں پھیلا دیئے۔“

ایک ہی جان تھی اور اسی جیسا اس کا ایک جوڑا تھا۔ تمام مرد اور عورتیں انہی دونوں سے
پیدا ہو کر پھیلی ہیں۔ سب ایک ہی نسل سے ہیں۔ سارے افراد انسانی نفسی طور پر سبائی بپائی اور
حسب کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا
وَأَسْبَاقًا لِّتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ ط

(الحجرات: ۱۳)

”اے انسانو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف
گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا، کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک
تم میں برتر وہی لوگ ہیں جو زیادہ تقویٰ شعار ہوں۔“

تمہوں اور قبیلوں کا یہ اختلاف اس لئے نہیں تھا کہ ایک ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر
کریں اور ایک دوسرے پر کچھڑ چھالیں۔ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ باہمی تعارف میں آسانی ہو
اور لوگ ایک دوسرے سے ربط و تعلق پیدا کریں۔ اللہ کے نزدیک یہ ساری قومیں اور قبائل برابر
ہیں۔ کسی کو کسی سے برتر قرار دیا جاسکتا ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر اور یہ ایک ایسی صفت ہے جسے
حسب و نسب سے کوئی تعلق نہیں۔ نیز یہ کہ تقویٰ کا اجر میں مرحلہ اللہ واحد کی کامل اطاعت ہے۔ یہ
نہ ہو تو نہ تقویٰ ہوگا نہ کوئی سبلائی۔

اب اس حقیقت سے کہے انکار ہوگا کہ اسلام قبیلہ و نسل اور مذہب و مسلک ہر طرح کے
تبعیبات سے بری ہے اور اس سلسلہ میں اتنے بلند مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں پہنچنا منع بی

بہذیب کو آٹھک میں نصیب ہو سکا۔ اس تہذیب کو بہذیب کہیں گے۔ یہی فقیر اس بات کو جان سکتا ہے کہ
 علی الاعلان ریڈائنگ میں نسل کو شادینے کی فتنہ کو شش کرے اور گورنر اور کالوں کے درمیان مذہب
 تفریق کو روکے اور کالوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرے۔ یہ تہذیب جنوبی افریقہ کی حکومت کے لیے
 رنگین نسل والوں کے خلاف علی الاعلان تیار قوانین بنانا بڑا ذرا دیتی ہے اور روس، چین، ہندوستان
 جیسے اریو کسڈ، یہودیہ کے یہ مسلمانوں کا قتل و مسمات کر دیتی ہے
 میں بڑی بڑی جہاں میں بھی پایا جاسکتا ہے اس میں کافر، مسلمان، اور مسلمانوں کے
 کے درمیان ہو جاتا ہے۔ اس میں بڑی بڑی جہاں میں بھی دھوکا اور مل سناج ہو۔ یہی سب سے
 کی مثال کے لیے۔ قرآن بار بار اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ وہ بھی مومن سے سناج کی تہ
 ایک انسان ہیں۔ خداوند علیہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی سناج کو بار بار دہرائے رہتے ہیں۔ آپ ہی
 تھے۔ قوم کے جیتے تھے اور قوم کے دین میں آپ کی عزت، مسرت، جائز نہیں تھی۔ اندیشہ تھا کہ یہ عہد و
 عظیم خدیموں، فضیلت و بزرگی دے دینے کی تسکین نہ اختیار کرے۔ اسی اندیشہ کے تحت آپؐ کو وصیت
 فرماتے ہیں

لا تظرونی، اذارت المصاری عیسیٰ بن مریم فی سما انا عبد

اللہ ورسولہ (بخاری)

ہ میری تعریف میں اس طعن کا غور نہ کرنا جس کا غور مصاری نے حضرت عیسیٰ کی تعریف میں
 کیا تھا۔ کمزور میں صرف خدا کا بندہ اور پیغمبر ہوں۔

ایک دفعہ آپؐ کی روک کے پاس گئے۔ وہ غصہ کھڑے ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا:
 مَنْ سَتَرَهُ انْ تَمْتَلِ لَهُ الرَّجَالُ فَبِئْسَ مَا فَلَیْسُوا مَقْعِدًا مِنَ النَّارِ
 (ابوداؤد، ترمذی)

جسے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ لوگ اس کے احترام میں سرفراز ہو جائیں گے۔
 جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالے۔

اسی طرح چونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کا حد سے
 زیادہ احترام کرنے لگیں۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صاف طور پر آگاہ کر دیا کہ وہ اللہ

کے آگے ان کی حمایت کرنے نہیں کھڑے ہو سکیں گے :

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ لَا اَغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا يَا بَنِي عَبْدِ مَنَا
لَا اَغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا يَا عَبَّاسُ ابْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا
اَغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَيَا صَفِيَّةَ عَمَّةَ رَسُولِ اللّٰهِ لَا
اَغْنِي عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (متفق علیہ)

”اے اہل قریش! میں خدا کے آگے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے بنی عبدمناف!
میں خدا کے آگے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں خدا کے
آگے تیرے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے اللہ کے رسول کی چھوٹی صفیہ! میں اللہ کے
آگے تیرے کچھ کام نہ آسکوں گا۔“

جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسا لمحہ نذر آ کر آپ میں (اپنے مقصد کی ترویج کی خاطر
ایک طرح کی حرص سی اُبھ آئی) کہ آپ بھی انسان تھے۔ اور آپ بجا سے غیب
نہ مکتوم کے سردار قوم دلیہ بن مغیرہ کی طرف ہی متوجہ رہے تو اللہ نے ان پر ایسا شدید عتاب
دیا جو جہنم کی سزا بنتا ہے۔ کیوں؟ ہمیشہ اس لیے کہ مساوات مطلق اپنے مکمل اور حقیقی معیار
کے ساتھ متحقق ہو سکے۔

اسی طرح بعض صاحب ثروت اور اعلیٰ حسب نسب کے لوگ چونکہ غریب مردوں اور عورتوں
سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنا اپنی کسر شان سمجھتے تھے لہذا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا :
ذَٰلِكُمْ اَلَا يَأْتِيَنَّكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَاٰتِكُمْ
اِنْ يَكُونُوْا فُقَرَاءَ يُغْنِيْهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

(النور: ۳۳)

”اپنی بیوہ عورتوں اور صالح غلام اور لڑکیوں کا نکاح کرو۔ اگر یہ لوگ مفلس ہوں تو
اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی بنا دے گا۔ اللہ صاحب علم اور بڑی وسعتوں کا مالک ہے۔“
جہاں تک دونوں صنفوں کا تعلق ہے، اسلام نے عورت کو بحیثیت ایک صنف کے
پوری طرح مردوں کی صنف کے مساوی قرار دیا ہے۔ اس نے صرف ایسی برتری کو رد کر رکھا ہے۔

ان کی بنا فکری استعداد، سنی عت، راز، ری، عمارت ہے۔ دینی ہے کہ اس کا فیفسہ
جیسی مشلات سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں بھی نقد و استعداد، ذہنی، ری، عمارت، عیساں ہو، جہاں
دونوں کو مادی مقام دیا گیا ہے۔ ذق صرف وہاں اور اسی حد تک پیدا ہوتا ہے جہاں ان میں سے
وہ چیز کسی حد تک مختلف ہو۔ یہ نیچے روئی درازی عتبہ سے دونوں۔

وَمَنْ تَغْمِسْ مِنْ الصَّالِحِينَ مِنْ ذُرِّيَةِ أَهْلِ النَّبِيِّ كَهَيْئَةِ مَنْ لَمْ يَلِدْ
يَلِدْ وَلَوْ لَمْ يَلِدْ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ (سورہ نساء: ۱۳۴)
جو ایک عمل کرے گا تو وہ دوسری عمارت سے طبعاً ہوسکتا ہے۔ یہی ایک حد تک
میں داخل ہوں گے اور ان کی ذہنی عت میں۔ جو نیچے کی:

مَنْ عَمِلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ (سورہ ابراہیم: ۷)
وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (سورہ نحل: ۹۷)
جو شخص بھی نیچے عمل کرے گا تو وہ دوسری عمارت سے طبعاً ہوسکتا ہے۔ یہی ایک حد تک
دنیا میں پایہ و زمرہ کی چیزیں گے۔ در (آیت میں) یہی وہاں کو ان کے بڑوں کے
بہترین اعمال کے مدد سے ہوتی ہیں۔

فَأَسْتَجِبْ لَهُمْ أَنِّي أَسْمِعُ عَمَلَهُمْ غَمَلًا مِمَّنْ كَرِهُوا
أَنِّي سَأُفْعِلُّهُمْ مِنْ نَفْسِي (سورہ نساء: ۹۵)

جو اب میں ان کے رب کے فرمایا میں ان میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں
خواہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب ایک دوسرے کے ہم خاص ہو۔

اسی طرح حق ملکیت کی اہمیت و زمانہ تصرفات کا مجبوز ہونے کے عتبہ سے بھی دونوں
برابر ہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ
مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ (النساء: ۷)

مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے
اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے۔

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

(النساء ۳۲: ۴)

”جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا

ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے“

ربا مرد کو میراث میں عورت کا دو گن حصہ دیا جانا تو اس کی وجہ ذمہ داریوں کا وہ بوجھ اور ہمتیہ ہیں جو مرد کو میدانِ حیات میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ وہ کسی عورت سے شادی کرتا پھر اس کی اور اس سے پیدا ہونے والے بچوں کی کفالت کا بار برداشت کرتا ہے۔ خاندان کے پورے نفل کا بار بھی اسی پر ہوتا ہے۔ یہی ایک وجہ اسے اس بات کا حق درقراردینے کے لیے کافی ہے کہ اس کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو، خاص کر اس شکل میں کہ عورت کے لیے شادی کرنے یا بیوہ بننے پر تنگی میں شورا رک درگنج فوریات کی کفالت کو اٹھانا پڑتا ہے۔ شادی کرنے کی ناکامی میں تو مرد اس کے نفقہ کا ذمہ در ہے، اور اگر رہتی رہتی ہے یا بیوہ ہو جاتی ہے تو ورثہ میں ملا ہوا مال کا حصہ ہے۔ ہذا اہل مسئلہ ذمہ داریوں کے فرق کا بے جوہر اشت میں فرق کا باعث بنتا ہے۔

رہی یہ بات کہ مرد کو عورت پر قوام بنایا گیا ہے۔

اتَّزَجَانُ تَمُّ مَوْنٌ عَلَى الْبَسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا آفَقُوا

مَنْ أَمْوَالُهُمْ (النساء ۳۲: ۱۰)

”مرد عورتوں پر قوام ہیں جس بنا پر کہ تم نے اس میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت

دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں“

تو اس بزرگی کی وجہ وہ استعداد اور بہارت ہے جو کار تو اہلیت کے لیے درکار ہے۔ چنانچہ مرد کا ذمہ داریوں سے زیادہ ہونے کی وجہ سے سماجی کاموں میں نسبتاً زیادہ عرصہ صرف کرتا ہے۔ اس میں اپنی پوری قوت فکری لگاتا ہے جب کہ یہ ذمہ داریاں ایک معتد بہ عرصہ کے لیے عورت کی راہ رو کے رہتی ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ مادرانہ ذمہ داریاں عورت کے انفعالی اور جذباتی عنصر کو زیادہ ابھارتی رہتی ہیں جبکہ مردوں میں غور و فکر اور تامل و تدبیر کا پہلو زیادہ غالب رہتا ہے۔ اب اگر کسی عورت

یہ قوام بنایا گیا ہے تو اسی لیے کہ وہ اس منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری صلاحیتوں کا حامل ہے اور نہ تو یہ کو چور کرتا ہے جو اس زمرہ درجی کے سونپے جانے کے لیے درکار ہیں۔ یہ کہ یہ کہ وہی خیریت پر اشد رکنے کا قہار ہے۔ اور وہی چلو کا قوائیت سے توجہ رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس طرح یہ ایک نفس کے مناسبت میں ملے دار ایک حق ہوا جو اپنی نسل کے غبار سے میدان حیات میں دونوں صفتوں کے مابین حقوق و فرائض کی کامل مساوت پر مستحکم ہوا ہے۔

عملی ذمہ داریوں سے مٹ کر کرتے ہوئے نہ اعلیٰ انسانیت پرست نہیں جائے نہ طوالت کو مرد سے کہیں زیادہ اس بات کو حق ہے کہ اس کی انحرافی دنیا پرست کی جائے۔ یہ حق مرد کے حق قوائیت کا مقابل ہے۔ ایک آدمی نے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا: اے رسول خدا! میرے جس سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں! اس نے لوہا ہونے کے بعد کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں! اس نے سائل نے پھر دریافت کیا: اس کے بعد کس کا ہے؟ آپ نے جواب دیا: تیری ماں! اس نے پھر پوچھا: کون؟ آپ نے فرمایا: تیرا باپ!

پتھار یہ معصوم ہوتا ہے۔ کوئی کے مسئلہ میں بھی ایک صنف کو دوسری پر ترجیح دیں گے ہے،
 وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ
 وَأَعْلَمُ أَنَّ الْمَوْلَى مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ
 أَخْلَصْتُ لَهَا الْآخِرَى ۝ (البقرة: ۲۸۴)

”اے اللہ! میں شہادت دیتا ہوں کہ تو ہی اس پر گواہی کراؤ۔ اور اگر دوسرا مرد نہ ہوں تو ایک

مرد، اور میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے رسول ہیں۔“

لوگوں میں سے جو اسے جانتے ہیں وہی اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ مقبول ہے۔“

ہمارے ہمارے اس کا سبب آیت کے اندر خود ہی موجود ہے۔ یعنی جیسا کہ ہم اوپر بیان ہی کر چکے ہیں، وظائفِ ماضیت کے فطرت کے عین تقاضے کے طور پر عورت کے اندر خیر باقی و انفعالی کیفیت اتنی ہی زوردار رہتی ہے جتنی کہ مرد کے اندر فکر و تامل کی عادت۔ اس لیے اس کا ہتھم

کیا گیا کہ اگر ایک عورت پر نسیان جاری ہو جائے یا وہ انفعال کی شکار ہو جائے تو دوسری اس کو یاد دلانے کے لیے موجود رہے۔ پس یہاں بھی اصل مسئلہ زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت کا سامنا کرنے اور اُس سے نمونہ برآیونے کا مسئلہ ہے۔

سرم کے لیے یہ کارنامے کیا کم ہیں کہ اُس نے عورت کو دین کے معاملہ میں برابر کا درجہ دیا۔ کسبِ مال اور ملکیت میں اُسے مساوات عطا فرمائی۔ پھر اُس نے اس کو سب بات کی ضمانت دی کہ نکاح اس کے اذن اور اس کی مرضی ہی سے ہو سکے گا نہ تو اُسے مجبور کیا جاسکے گا نہ نظر انداز۔

لَا سَکَاحَ الشَّيْبِ حَتَّى تَسْتَأْذِنَ وَلَا تَنْكِحَ الْبُكَرَ حَتَّى تَسْتَأْذِنَ وَادْفَعَا

الصَّغِيرَاتِ وَالْمُتَوَسِّطَاتِ (بخاری و مسلم)

بیوہ کا نکاح بلا اس سے صاف اجازت حاصل کیے نہ کیا جائے اور کمزاری کا نکاح

بھی اس کا اذن حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے، اس کا اذن خاموشی ہے۔

سویح اس نے بہ اور نکاح میں یا طلاق کے بعد پیدا ہونے والے دوسرے حقوقِ زوجیت

کا تحفظ کیا۔

وَلَا تَنْهَوْنِ عَنْ مَخْرَجِهَا (النساء: ۲۳)

ان کے بہ بطور فرض کے روکنا

وَلَا تَنْهَوْنِ عَنْ مَخْرَجِهَا (النساء: ۲۳)

معدودات (البقرہ: ۲۳۱)

انہوں نے بھلائی سے روکنا کہ وہ بھلائی سے روک کر دوسرے بھلائی کے خلاف

انہیں نہ روکے رہنا کہ یہ زیادتی ہوگی۔

وَعَايَشُوا بِهَا بِالْمَعْرُوفِ (النساء: ۱۰)

ان کے ساتھ بھلائی سے زندگی بسر کرنا

وضیح یہ کہ سلام نے عورت کو تمام حقوق اور ضمانتیں خالص انسانی ہذب کے

تحت سہاکی ہیں۔ اس نے ایسا کسی طرہ کے مادی یا معاشی دباؤ کے تحت نہیں کیا ہے۔ اس نے

اس ذہنیت کے خلاف اعلان جنگ کیا کہ عورت ایک معاشی بوجھ ہے جس کے پیدا ہوتے ہی

اس سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ رُکھوں کو زندہ، فتنہ بردینے کا یہ رات جو۔ ب کے بعض قبائل کی زندگی میں مدون کا وجہ اس طرح تھا کہ اس کے خلاف جہاد میں سروسے کی حالت کی رہی نہیں برنی اس نے اس روج کو بھی اس سنہ سے اس کے تحت تھا جس کی رہائی میں وہ انسان کو بھیتا ہے۔ جب بچہ اس نے پیہ تو ہا کسی سنہ سے اس جس سے متع یہا ہے

وَرَفَعُوا الْعِصَىٰ سِ حُزْمِ اللّٰهِ اَنْ يَّهْدُوْهُمُ (الاعراف: ۵)

اور کسی جان کو جسے نہ رہے جو ہر چھوڑا ہو رہے۔ اور مدون کے ساتھ۔

یہ خاص طور سے سال اولہ سے روکا۔ یہ واضح رہے کہ موت بڑی سب کے قتل کا وقت تھا۔
بڑکوں کا ہیں۔

وَرَفَعُوا الْعِصَىٰ سِ حُزْمِ اللّٰهِ اَنْ يَّهْدُوْهُمُ (الاعراف: ۵)

اور بڑکوں کا ہیں۔ اور مدون کے ساتھ۔

دیکھیے اس آیت میں اولاد کو روزی، نے کا ذکر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہی مسئلہ ناقہ کش اور مغلسی کے اندیشے پیدا کرنے کا باعث بنتا تھا۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ باپ کا دل اس اعتماد سے بھر جائے کہ میری روزی رسالت ہے۔ رُکھوں کے رکنوں میں سے اس نے اسے بپ کے خود اپنے سر لے لی ہے۔ پھر قیامت کا بیان کرتے ہوئے بدل اور رحمت کے خبر بات کو یوں بھرا گیا ہے:

اِذَا الْمَوْءِدَةُ صَلَاةٌ سَاقِيَةً اَتَتْ حَامِلًا حَمْلًا مُّكْتَبًا (سجود: ۱۰)

جب زندہ فتنہ کی جوں جوں سے جو جیوں سے وہ وہاں سے کہہ رہے ہیں

تھی تھی

گویا اس بات کو اس ہونٹ اور مہیب، منہ میں طور پر جو ب لپی کے داخل ہو گیا ہے پس واضح رہے کہ اسلام عورت کو اس کے باطن و روحانی غفون عفا کرتے وقت... دراصل اس کے انسان ہونے کی صفت کو سامنے رکھتا ہے اور کسی طرح وہ اپنے، وحدت انسان کے نظریہ کا یورپورا حق ادا کرتا ہے:

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمِمَّا تَخْتَلَفُ فِيهِ اُولُوْا اَعْيُنٍ (النساء: ۱)

اور اولا عمل ف: ۱۸۹

”اللہ نے تمہیں ایک جان بھر پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے
پس سکون حاصل کرے“

اسلام کا منشاء درحقیقت عورت کے درجہ کو اس مرتبہ تک بلند کر دیتا ہے کہ وہ ”نفس
واحدہ“ کا نصف بن کر رہے۔

اسلام کے حق میں یہ باتیں سامنے لانے کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ مادہ پرست مغرب نے
عورت کو جو آزادی دی ہے اس کا پشیم خالص اور پاک انسانی منبع ہے نہیں چھوٹتا اور نہ اُس کی
پشت پر وہ بے لوث اور مخلصانہ محرکات رہے ہیں جو اسلام میں حریت و مساوات عطا کرنے کے
باعث بنے۔ ہمیں نہ تو تاریخ کو سہولنا ہے نہ خفایاں اور واقعات پر آج جو نظر فریب نول پڑ گئے ہیں
اُن سے دھوکا کھانا ہے۔ اچھی طرح یاد رہے کہ مغرب نے عورت کو گھر سے اس لیے نکالا کہ وہ محنت و مزدوری
کے کسب معاش کرے کیونکہ وہاں پر مرد نے عورت کی کفالت اور پرورش سے انکار کر دیا تھا۔ آٹا
یہ کہ وہ عورت سے اس کا معاوضہ اس کی عصمت و عفت کی شکل میں وصول کر لے۔ ایسی صورت حال تھی
جس کے باعث بے چاری عورت کسب معاش کے لیے محنت کرنے پر مجبور ہوئی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب عورت مجبور ہو کر محنت مزدوری کرنے کے لیے گھر سے باہر
نکلی تو مادہ پرست مذہب نے اس کی مذہبی کو غنیمت ٹھہرا کیا اور جنس محبت کی فراوانی کو
مغنیبت اجرت کا بھانا بنالیا تاکہ مستاجرین کم اجرت والی عورتوں کو مزدور رکھ کر ان مزدوروں سے
مستغنی ہو جائیں جو اب سہ اٹھانے لگے تھے۔ اور مناسب معاوضہ ”کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اب اگر عورت نے وہاں مساوات کا مطالبہ کیا تو اس کا مطلب اجرتوں میں مساوات کا
مطالبہ تھا۔ تاکہ پیٹ بھرنے اور زندگی گزارنے کا بندوبست ہو سکے۔ جب اُسے یہ مساوات نہ مل سکی
تو اس نے دھڑ دینے کا حق طلب کیا تاکہ اُسے حق بتانے اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے آواز
اٹھانے کا موقع مل سکے۔ پھر اس نے پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق چاہا تاکہ وہ اس مساوات کو
بجائیت کرنے اور اسے تسلیم کرانے کے لیے مثبت طور پر آواز بلند کر سکے۔ کیوں کہ سماج میں جو قوانین
نافذ ہوتے تھے انہیں صرف مرد بناتے تھے۔ اسلام کی طرح وہاں قوانین اللہ کے دیے ہوئے نہیں
ہیں جو اپنے بندوں میں مردوں اور عورتوں سب کے ساتھ عدل و انصاف برتتا ہے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد چوتھی جمہوریہ تک ڈانس میں عورت کو اپنے سر پرست کی جہازت کے بغیر اپنے پاس میں سٹاف کا تعلق نہیں حاصل تھا: بیساکہ سڑ میں حاصل ہے۔ وہ جب حالیکہ اس نے عورت کو بے حیائی و رمی شہ کا پورا حق دے رکھا ہے، ملدنیہ اور غیبہ: طریقہ سے۔ بس ہی تہذیبی 'حق' وہ و حد' حق' ہے جس سے اس نے عورت کو محروم رکھا ہے اس سے کہ اس نے محروم بھی اس سے محروم رکھا ہے۔ انسان کے شعور، حساس، اس کی عزت نفس و اس کی شرافت کے مین تقاضے کے طور پر۔ اور اس لیے بھی جنسی تعلقات کو اس سطح سے بلند کیا جائے کہ وہ محض دو مبہوں کا اتصال ہو کر رہ جائیں جس کو نہ خاندان بنانے سے تعلق ہو نہ گھبرانے سے، سہ۔ یہ جو بہرہ دیکھتے ہیں کہ مادہ پرست مغرب بعض کاموں کے سلسلہ میں عورتوں کو مردوں پر ترجیح دینا ہے، اس میں کئی بڑی ادلائ، سفارت خانوں، نو فصل خانوں، خبر سانی و مصافحت وغیرہ میں تو ہمیں ہے: اس لیے کہ وہ دراندازی ذہنیت کو نظر انداز کرنا چاہیے جو اس ترجیح کی پشت پر کھڑا ہے یہ بجز خبیثہ و ناہن کی دو شبہوں اور فیون کی ہیک سے بس ہوئی فضا میں غلامی و بندگی کی ایک شکل کے سوا اور کچھ نہیں۔

تہذیبی سادہ نوحوں کی جنسی حس سے ناہانزادہ اٹھانے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے: نہج کا ردیاری ادارہ کا ملک یا وہ ریاست جو کہ عورت کو سفارت خانوں اور نو فصل خانوں میں بندھے دیتی ہے، اور اس طرز کا ملک اخبار جو عورت کو خبر میں مانے و نامہ نگاری کرنے پر مامور کرتا ہے ان میں سے ہر ایک خوب اچھی طرح بھٹتا ہے کہ وہ عورت کو درحقیقت کس فرض کے لیے استعمال کر رہا ہے اور عورت ان میدانوں میں کس طرح آسانی کا میابی حاصل کر لیتی ہے۔ اور یہ کہ وہ اس کا میابی کی خاطر کیا کچھ قربانی کرنی ہے۔ بغرض مجال گروہ خود سے کچھ نہ قربان کرے تو بھی یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بھوکے تھوئیں و حریص نکاح میں اس کی بات چیت اور اس کے جسم کے گرد جمع ہو کر رہیں گی۔ یہ لوگ اپنی نفع اندازی اور معمولی سی کامیابی کی خاطر اس بھوک سے ناچار مزائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے کہ اعلیٰ انسانی تصورات ان سے دور ہیں، بہت دور۔

اثنائے اکہیت کے پاس مساوات مرد و زن کے سلسلہ میں بڑے بلند و بانگ دعوے ہیں مگر اس کی مساوات صرف محنت اور اجرت کی مساوات تک محدود ہے۔ محنت اور اجرت کی مساوات

کے بعد عورت پوری طرح آزاد ہے اور اسے بھی مرد کی طرح اپاحتیت شعاری کی کھلی جھٹی حاصل ہے۔ اشتراکیت کی نظر میں اصل مسئلہ پیسے کا ہے، اس کے ماوراء کچھ بھی نہیں۔ سارے انسانی محرکات اور تمام انسانی تصورات زندگی مختلف عناصر میں سے کھینچ کر بس اسی ایک عنصر کے اندر سما گئے ہیں۔

تب۔ میں اترے تو اس کا اصل سبب بھی یہی نظر آئے گا کہ عورت کی کفالت سے بچایا جاتا ہے۔ لہذا عورت مجبور ہے کہ اپنے گھارے کے لیے مرد ہی کی کٹ بکڑ اسی کے حملتہ کار میں کام کرے۔ کیونکہ مرد اصل مادہ پرست مغربی طرز فکر کا نقطہء ارتقا ہے جو نیکی کے محرکات اور احسان کے دواعی سے خالی اور انسانی زندگی میں روحانی تصورات سے عاری ہے۔

یہ ہیں وہ باتیں جن کو سامنے رکھے بغیر سب ری نظریں اس جھوٹی چمک دمک سے دھوکا کھا سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلام نے آج چودہ سو سال پہلے سے عورت کو وہ حقوق دے رکھے ہیں جو مغربی تہذیب نے آج تک نہیں دے سکے۔ نیز اس نے عورت کو بوقت ضرورت محنت مزدوری اور کسب معاش کا حق بھی دے رکھا ہے، لیکن ساتھ ہی سلام نے اس کے لیے خاندان میں نگہداشت و رہ پرستی کا حق بھی بدستور باقی رکھا ہے۔ اس لیے کہ اس کی نظر میں زندگی جان و مال سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور اس کے مقصد بخش کھانے پینے سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ وہ زندگی برائے مختلف زاویوں سے نظر ڈالتا ہے۔ اس کے نزدیک مختلف افراد کے لیے جدا جدا کام تو ہیں لیکن سب ایک دوسرے کے جبارے ہی انجام پذیر ہو سکتے ہیں، سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ و مربوط ہیں۔ اسی نظر سے وہ عورت کو مرد کے ذرائع کو بھی دیکھتا ہے اور سب سے پہلے دونوں پر اپنے اصل کام کی انجام دہی لازم قرار دیتا ہے تاکہ زندگی پہلے بھولے اور بھرتی کر سکے۔ وہ دونوں میں سے ہر ایک کو وہ حقوق عطا کرتا ہے جو اس مشترکہ انسانی مقصد تک پہنچانے کے ضامن ہیں۔

پوری نوع انسانیت کو ایک نہ مصلحت کا شرف نبھا گیا ہے جس کو پامال کرنا صحیح نہیں

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوُجُوهِ وَالْأَنْفِ وَرَزَقْنَاهُمْ

مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَنَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَعْلِيمًا ۝

(یعنی ۲۱ سرائین: ۷۰)

”ہم نے بنی آدم کو بزرگ دی اور انہیں خشکی و تیزی میں سواریاں عطا کیں اور ان کو

یہیہ تجربہ اس سے رزق آیا اور انہی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

”ہم نے انھیں عزیز ٹھہرایا۔ پوری نوع کو بحیثیت نوع کے، نہ کہ افراد، قبائل یا نسلوں کو۔ ان کی خدادادی حیثیتوں میں یہ عزت و بزرگی تھی، عداوت سب کے لیے مساوی طور پر ہے۔ سب کے سب آدمی ہیں جو کہ تفریق سے تیار ہیں۔ ورنہ انہی کو معزز ٹھہرایا گیا تھا۔ ہند ان کے بیٹے سب برابر ہیں۔ یہاں بھی اور وہاں آخرت میں بھی۔“

تو اس لوگ مذہب و شرف کے، ملک میں اور یہ کسی طرح روا نہیں کہ اس مذہب و شرف کو بدین تعریف بنایا جائے یا کوئی اس کا مذاق اڑائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرُوا مِن مَّوَدِّعٍ عَسَىٰ أَنْ تَكُونُوا هَٰؤُلَاءِ
مِنْهُمْ وَلَا تَسَاءَلُوا عَنْ أَلْفَاظٍ عَسَىٰ أَنْ تَكُونَ حَٰزِلًا مِّمَّنْ لَا تَعْلَمُونَ
الْفُسْكَ وَلَا تَسَاءَلُوا سَالًا لِّغَابٍ مَّا تُسْأَلُونَ فَيَسْأَلَكُمْ عَنِ الْغَيْبِ الْغَيْبُ
وَمَنْ لَّمْ يَنْتَهِ مَا وَكَلَكُمْ اللَّهُ مِنَ الظُّلُمَاتِ ۚ فَإِنَّهَا لَكُم بِهَا

”اے اہل ایمان! نہ ہنسنا سب سے نہ کچھ لوگ دوسروں کا مذاق اڑائیں عین ممکن ہے کہ وہ اس سے بہت ہوں۔ اسی طرح کسی عورت کو بھی کسی عورت کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے جو سنا ہے کہ وہ عورتیں ان (مذاق اڑانے والیوں) سے بہتر ہوں۔ اپنے آپ کو بدین تعریف نہ بناؤ، نہ ان کو بُرے ناموں سے پکارو، یہاں لڑنے کے بعد بُرا کلمہ بہت ہی بُری بات ہے۔ اب جو لوگ ایسی حرکتوں سے تائب نہ ہوں وہ صحیح معنی میں ظالم ہیں۔“

یہ نگہ ہی اور حسین تعبیر کہ اپنے آپ کو بدین تعریف نہ بناؤ، ایک لطیف اشارہ کی حامل ہے اور وہ یہ کہ انسان کا دوسرے انسان کو بدین تعریف بنانا دراصل خود اپنے کو بدین تعریف بنانا ہے کیونکہ تمام انسان ایک ہی جان سے ہیں۔

ہر ایک صاحب عزت و ناموس ہے اور اس کا ناموس واجب الاتمّام ہے۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْذِنُوا
وَتَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تُدْرِكُونَ ۚ فَإِن

لَمْ تَجِدُوا فَيْضًا أَخَذَ فَلَا تَدَّ خُلُوصًا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ بِهِ وَإِنْ
يُنْزِلَ لَكُمْ أَرْجَعُوا فَا رَجِعُوا هُوَ أَرْكَى لَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ

(سورہ نور : ۲۴-۲۸)

”اے اہل ایمان! اپنے ذاتی گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں بلا اجازت لیے
اور گھروالوں پر سلام بھیجے نہ داخل ہو۔ اگر تم میں نصیحت حاصل کرنے کی صلاحیت ہو تو
دیکھ لو گے کہ یہی طریقہ تیسرا ہے لیے بہتری کا ضامن ہے۔ اگر تم کو گھر میں کوئی نظر نہ آئے
تو بھی اس وقت تک نہ داخل ہو جب تک اجازت نہ دی جائے۔ اگر تم سے دائیں چلے
جائے کو کہا جائے تو واپس ہو جاؤ۔ یہ روش تیسرا ہے لیے زیادہ پاکیزہ ہوگی۔ جو کچھ تم
سرتے ہو اللہ اس سے بخوبی واقف رہتا ہے۔“

وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْنَبُ بَعْضُكُمُ بَعْضًا (۲۱) (نور : ۱۲)

”ایک دوسرے کی برائیوں کا کھوج نہ لگاؤ اور نہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے

کی غیبت کرے۔“

اس قرارداد کی قیمت اس میں مضمر ہے کہ یہ ہر فرد میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ
صاحب عزت و آبرو ہے اور ایک طرفت کا ناموس رکھتا ہے جس پر حملہ کرنا دوسروں کے لیے جائز
نہیں۔ نہ کسی فرد کی قیمت دوسرے فرد سے کم تر ہے۔ سب اس معاملہ میں برابر ہیں اور سب کے
سب ایک دوسرے کی طرف سے امن میں ہیں۔

اسی طرح اسلام زندگی کے ہر پہلو کو لیتا ہے، اجتماعی شعبوں کو بھی اور فرد و جہان کے
گوشوں کو بھی، اور ہر جگہ پوری پوری مساوات قائم کرتا ہے۔ فقیر انسانی کو ہر طرح کی احتیاج،
ضامی خولی منطاب اور مصنوعی سماجی اقدار کے دباؤ سے آزاد کر کے مساوات کو اصولی طور پر متحقق
کر دینے کے بعد اس امر کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اسلام الفاظ میں اور ظاہری شکلوں
کی تعبیر کے ساتھ بھی مساوات کا اعلان کرے۔ لیکن اس نے یہ بھی کیا، کیونکہ مساوات اسے بہت
مزین ہے۔ وہ ۱۲۰۰ سے نسل و قبیلہ اور خاندان و مقام کی تنگیوں سے آزاد، مکمل انسانی شکل میں قائم
دیکھنا چاہتا ہے کہ مغرب کے مادہ پرست، سائنٹیفک، نظاموں کی طرح اس مساوات کا دائرہ

صرف اقتصادی امور تک محدود نہ ہو جائے بلکہ زیادہ وسیع درمیانگے ہو۔

اجتماعی کفالت باہمی

ایسی زندگی بھی کامیابی کا منہ نہیں، کچھ سکتی ہیں یہ فرد بے قید آزادی کے ساتھ ساتھ
 • معاصریت آزادی و سہولت جیسی کے نتیجے میں رہا ہے اور یہی اس آزادی کے پچھلے مساوات مطلق ماحول
 بھی موجود ہوتا ہے۔ درمیانگے ہوں گے، رزق و سماج دونوں تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔ یہ
 سہولت کی ایک نئی صورت ترقی ہے جسے "فردی آزادی" کی حد تک پہنچا چاہیے۔ خود فرد کی اپنی سہولت بھی
 اس میں مضمر ہوتی ہے۔ یہ آزادی سے فائدہ اٹھانے میں وہ بعض حدود پر آکر رک جائے اور ان سے
 تجاوز نہ کرے۔ وہ نہ سہولت پسندی اور آسائش و خواہشات اسے بلاکت کے گھاٹ اتار دیں گے، یا اس کی
 آزادی اس سے ذرا کی آزادی سے اسے ایسا ہی کرے کہ در ایسے ایسے جھڑے اٹھ کھڑے ہوں گے جو پچھ
 نظم ہونے کا نام نہ ہیں گے۔ یہ آزادی ایک "بہ جان بن کر رہ جائے گی۔ زندگی کی ترقی اور پسندی
 • سماج کی بہت ساری ضرورتیں اور ترقی ذاتی مفادات کی حدود پر آکر رک جائے گا۔ سرمایہ دار
 نظام کی "آزادی" میں یہی ہوا اور ساتھ ہی آزاد سہولت رانی کے حیوانی نظریات نے بھی جنم لیا۔

اسلام انفرادی آزادی کو اس کی جتنی شکل میں عطا کرتا اور اعلیٰ ترین معنی میں انسانی مساوات
 برپا کرتا ہے۔ لیکن نہ انہوں کو بے قید رہنے کا کام نہیں چھوڑتا۔ ایک طرف سماج کا مفاد اور اس کا
 حق ہے۔ دوسری طرف انسانیت کے مفادات اور اس کے تقاضوں کا پاس و لحاظ ہے اور ساتھ ہی
 دین کے بلند ترین مفاد کی قدر و قیمت بھی سامنے ہے۔ اس لیے اسلام انفرادی آزادی کے باقی بل
 انفرادی ذمہ داری کا اصول پیش کرتا ہے اور اس کے پہلو میں اجتماعی ذمہ داری کو جگہ دیتا ہے جس کا بار
 فرد اور جماعت دونوں پر ہے۔ اسی ذمہ داری کو ہم "اجتماعی تکافل" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اسلام نے اجتماعی تکافل کا اصول پوری تفصیل کے ساتھ سامنے رکھا ہے۔ فرد اور اس کی
 ذات، فرد اور اس کا قریبی خاندان، فرد اور جماعت، ایک قوم اور دوسری قوموں، ایک نسل اور
 آگے آنے والی نسلوں سب کے مابین اجتماعی تکافل کا یہ اصول کار فرما ہے۔

ذمہ داریوں کا یہ اشتراک فرد اور اس کی اپنی ذات کے درمیان بھی مطلوب ہے، فرد اس

بات کا مکلف ہے رُفْس کو اس کی بے لگام خواہشات سے باز رکھے۔ اسے ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر کے اس کا تزکیہ کرے۔ اسے لے کر صلاح و کامرانی اور نجات کی راہ پر پیش قدمی کرے اور اسے ہلاکت کے منہ میں نہ جھونک دے۔

فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ ۖ وَآثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۖ فَإِنَّ أُجْرَهُ هِيَ السَّادَىٰ ۖ وَ
 أَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ مِنَ الْحَوٰى ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ
 هِيَ السَّادَىٰ ۖ (النازعات ۱، ۲ تا ۴)

”جس نے سرکشی کی روش اختیار کی اور حیات دنیا کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جو اپنے رب کے حضور عاجزی (اور جواب دی) سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو جواہر سے باز رکھا اس کا سکُن جنت ہے۔“

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۖ فَأَلْصَقًا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۖ قَدْ أَفْلَحَ
 مَن رَّكَاهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ۖ (التيس ۱، ۲ تا ۱۰)

”قسم ہے نفس کی اور اس بات کی کہ اسے درست بنایا گیا اور اس میں فجور و تقویٰ کی عیان پیدا کی گئی۔ جس نے اس نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گندگیوں سے آلودہ کیا وہ ناکام رہا۔“

وَلَا تُنْفِقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى الْهٰٓسٰٓكَةِ ۚ (اسفرہ ۱۹۵)

”اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔“

ساتھ ہی وہ اس بات کا بھی مکلف ہے کہ نفس کو اس حد تک اس کے غوبات و زہم پہنچائے جہاں تک کہ اس کی فطرت پر بُرے اثرات پڑنے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے لیے اس کے حق کے بموجب کام اور آرام دونوں کے مواقع فراہم کرے نہ یہ کہ کام کا بوجھ ڈال کے اسے گھلاما کرے۔
 وَابْتَغِ فِيمَا آتٰكَ اللّٰهُ الذَّارِ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نِعْمَتَكَ مِنَ
 الدُّنْيَا ۖ (القبض ۱، ۲)

”اللہ نے تجھے جو کچھ عطا کیا ہے اُس میں آخری زندگی کو اپنا مصلح نظر بنا اور دنیا میں

سے اپنا حق نہ بھول جا۔“

يَبْنِي أَدْعُمُكُمْ وَأَرْزُقْكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا

تَسْرِبُوا ۖ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝ (الاعراف: ۳۱)

• اس آیت کے مہو، پتی زینتیں، نماز کے وقت پر استعمال رکھو۔ گناہوں اور

مذہب سے آگے نہ بڑھو۔ اللہ صدمے سے ڈرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ انفرادی ذمہ داری ہے۔ جو انسان کا سابقہ اپنے عمل سے ہے، انجیل بڑا نیک

• جو کچھ بھی وہ کرے گا اس کا اثر کسی پر نہ پڑتا ہے۔ دنیا یہ یا آخرت کہیں بھی اس سلسلہ میں کوئی

اس کے کام نہ آ سکے گا۔

قُلْ نَفْسٌ مِّمَّا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۖ (الذہر: ۴۰)

”میرا اپنے اعمال میں گرفتار و مقید ہے۔“

اِنَّ لَمْ يَكُنْ نَفْسٌ مِّمَّا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۖ (الذہر: ۴۰)

در کا ذرا آخری • دہر کا نفس انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

سب سے بڑا • نہ خیر نہ شر نہ آ، نہ دینی • (البقرہ: ۱۷۷)

• کیا اس سے بڑا نہیں ہے کہ وہ کسی اور چیز کے صحیفوں میں کیا نہ کرے۔ وہ اپنے

منہ میں نے اپنے دل کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ یہ کہ کوئی فرد کسی دوسرے کا بوجھ نہ ہو سکے گا

اور یہ کہ انسان کے کام آنے والی چیزیں ہیں وہی ہے جس کی وہ کوشش کرے، نیکیاں، کر

مزے اور یہ کہ اس کی کوششوں کا ثمرہ جلد ہی اس کے سامنے لایا جائے گا اور پھر

اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

لِحَاثِمَا كَسَبَتْ عَلَيْهِمَا مَا اَكْتَسَبَتَا ۖ (البقرہ: ۲۸۶)

• جو شخص نے جو نیکی کی ہے اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی کی ہے اس کا

وہی اسی پر ہے۔

فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَلْيَجْزِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَلْيُضِلَّهُ ۚ (الزمر: ۳۴)

اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِذِكْرِكَ ۖ (الزمر: ۳۴)

• اب جو راہ یاب ہوتا ہے تو اس کا اپنا فائدہ ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ گمراہ ہو کر

اپنا ہی بُرا کرتا ہے۔ آپ ان سب کے شہیکہ دار نہیں ۛ

وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَى نَفْسِهِ ۚ (النساء: ۱۱۱)

”اور جو شخص کوئی برائی کما سے تو اس کی یہ کما ہی اسی کے لیے وبال ہوگی ۛ

ان اصولوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے نفس کا آپ ہی نگراں بن جاتا ہے۔ نفس گری کی ذمہ داری تو یہی اس کو راہِ راست پر لانا ہے اور ساتھ ہی اس کے واجبی حقوق ہمیشہ ادا کرتا رہتا ہے۔ نفس سے لغزش ہو تو اس کا مناسب کرتا ہے اور اگر خود غفلت برتے تو اس کا خیازہ بھی خود ہی بگھٹتا ہے۔

اس ماحِ ذمہ کو مکمل آزادیِ ضمیر اور کامل انسانی مساوات عطا کرنے کے ساتھ ہی اسلام : ذمہ میں دو شخصیتیں پیدا کر دیتا ہے جو ہمہ دم ایک دوسرے پر نظر رکھتی ہیں، اور عبادتِ بُرائی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے یا ہاتھ پیرنے کا فرض بھی ادا کرتی ہیں۔ پس آزادی اور ذمہ داری دونوں برابر ہیں اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔

ذمہ اور اس کے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے مابین بھی تکافل کا اصول کارفرما ہے۔

وَبِأَنوَاعِهِ إِحْسَانًا ۖ إِنَّمَا بُنِيتُمْ بِمِدَّةٍ الْكِبَرِ أَخَذُوا هَٰذَا
كُلُّهُمْ فَلَا يَصُلُّ لَهُمْ أُنْثَىٰ ۖ وَلَا يَتَمَرُّ هَٰذَا ۖ كُلُّ تَصْمَعًا قَوْلًا كَرِيمًا
وَأَخْفِضْ لَهُمَ جَنَاحَ الدَّلِيلِ ۖ إِنَّهُمْ حَمْدٌ ۖ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْنَاهُمْ

کما در تنبانی صغیرا ۛ (بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

”و امین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُن تک نہ کہو، نہ انہیں جھٹاک کر جواب دو بلکہ اُن سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو: پروردگار ان پر رحم فرما جس طرت انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بھیجیں میں پالا تھا“

وَوَضَّيْنَاهُ إِلَّا نَشَانِ يَوَالِدَيْهِ ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ ۖ وَهْنًا عَلَىٰ

وَهْنٍ ۖ وَفَضَّلَهُ ۖ فِي عَمَلَيْنِ ۖ أَنْ أَشْكُرَ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ (لقمان: ۱۴)

ابہ نے سارا سارا پیسہ سونپ کر دیا۔ اس کی رائے کا رونا
سنی۔ وہ کوٹھائے رچی اور سچے دو سارے سارے کا دودھ پیٹا باغیاں بند
میں اور اپنے والدین کا شکر گزار ہوا۔

اور انہوں نے (حکام لغضہ) اور معصومی کتب اللہ اور عرب
اور نئی روایت رکھنے والوں میں سے بعض ائمہ کے فرمان میں بعض سے زیادہ قیام
اور مقدم قرار دیتے گئے ہیں۔

والوالدات یزعمون اولادھن حولہن وامن من اولادانکہ اریستہ
دلیل اللہ واللہ مصنف دلسہ مکتبہ مکتبہ وفتہ الصرہ ۲۳
”جو پاپا پتے ہیں ان کی والدہ کی نسبت رضاعت تک دودھ سے دور ہیں
اپنے بچوں کو کہ دو سارے دودھ پیاں۔ اس صورت میں بچے کے باپ کو بدعت
طریقے سے انھیں کما کیٹ دینا ہوگا۔“

نمائندہ میں خالفتہ باہمی کی اہمیت کے بارے میں ہمیں یہی کہنا پڑتا ہے کہ اس دور کی
شہسازہ ہندی رنے والے اصول ہے۔ نمائندہ سماج کی اس کی مابین ایسٹ ہے۔ اسکی
قدرو قیمت کے اعتراف سے مغربیوں۔ یہ ادارہ فہمیت انسانی میں کمی کی جڑیں رکھنے والے سیلابات
درجہات، رحمت و مروت کے پاکیزہ جذبات اور ضرورت وہ عصمت کے تقاضوں کی تکمیل پر قائم
ہے۔ پھر یہی وہ ہوا رہے جس میں اخلاق و ادب پرورش پاتے ہیں جو انسانیت کا خاتمہ ہیں اور
درحقیقت یہی اس سماج کے سب سے جو جوانوروں کی سببانیات مطلقہ اور وحشیانہ انارکی سے
بند ہو چکا ہو۔

کیونکہ ہم نے یہاں تھا کہ نظام خاندان کو کیسے ختم کر دے۔ دلیل یہ تھی کہ خاندان انفرادی
ملکیت اور ترجیح ذات کے جذبات کی پرورش کرتا اور دولت کی اجتماعی ملکیت نیز افراد کے ریاست
کی تحویل میں لے لے جانے کی راہ میں روڑا بنتا ہے۔ لیکن ہنگامہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ
میں کمیونزم کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس لیے کہ آج کا روسی سماج خاندانی نظام پر ہی مبنی ہے اور اس کے ذہن
اور اس کی تاریخ میں خاندان کا ادارہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ مزید برآں ایک حقیقت یہ بھی ہے

کہ خاندان صرف ایک اجتماعی ادارہ نہیں بلکہ ایک نفسیاتی اور حیاتیاتی نظام بھی ہے۔ چنانچہ ایک عورت کو ایک ہی مرد کے لیے خاص کر دینا حیاتیاتی اعتبار سے زیادہ موزوں اور اچھی اولاد پیدا کرنے کی زیادہ کامیاب شکل ہے۔ یہ بات مشاہدہ کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہے کہ جو عورت بچے بعد دیگرے کئی مردوں کے تحت رہتی ہے وہ ایک متعین عرصہ بعد بانجھ ہو جاتی ہے۔ یا بچہ اس کے بچے صحت مند نہیں رہتے۔ یہ معاملہ کا نفسیاتی پہلو تو محبت و رحمت کے جذبات کسی دوسرے نظام کی بہ نسبت خاندان نظام میں زیادہ بہتر طور پر نشوونما پاتے ہیں۔ اس طرح شخصیت کی تعمیر بھی اس ادارہ میں دوسرے نظاموں کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور مکمل طور پر ہوتی ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم میں پردریش اطفال کے مرکز میں پردریش پانے والے بچوں پر کیے گئے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ جس بچے کی پردریش بچے بعد دیگرے کئی دایاں کرتی ہیں اس کی شخصیت اضطراب و انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر محبت اور تعاون کے جذبات کو پورا نشوونما نہیں نصیب ہوتا۔ اسی طرح بلا باپ کا بچہ احساس کمتری میں بھی مبتلا رہتا ہے اور ایک ایسا خیالی باپ گھر گھر اس حقیقت سے فرار کی شکل نکالتا ہے جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہوتا۔ وہ بس عالم خیال میں اس سے متعلق جوڑے رہتا ہے اور اس کی خیالی آرمیاں اسے طرہ طرہ کی تسکین دیتی رہتی ہیں۔

نظام خاندانی کو وجود و استحکام بخشنے میں صرف حیاتیاتی اور نفسیاتی عوامل ہی کو دخل نہیں، ضرورت اور مصلحت کے بھی کچھ تقاضے ہیں جو ایک مرد و ایک عورت کے درمیان تعلق پیدا کر کے ایک گھرانے کی تشکیل کرتے اور بچوں کی نگہداشت کا ایک نظام بناتے ہیں۔ اس کے بعد ان رشتوں اور تعلقات کا نمبر آتا ہے جو ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کو باہم جوڑتے اور ان سب کو ملا کر ایک وحدت بناتے ہیں جو نسل بعد نسل اچھے برے میں ایک دوسرے کے ساتھی اور جو کچھ آن پڑے یا باتھ لگے اس میں یک دوسرے کے شریک رہتے چلے آتے ہیں۔

اسلام میں خاندانی کفالت بابی کے مظاہر میں سے ایک اہم مظہر دولت کا وہ قوارث

ہے۔ اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا۔ اگر وہ بے اولاد ہوں ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جب کہ وصیت جو انہوں نے کی پوری کر دیا جائے اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے، اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی مقدار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں اُن کا حصہ آٹھواں ہوگا بعد اس کے کہ جو وصیت تمہنے کی ہو وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

يَسْتَفْتُونَكَ ۚ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكُلَّةِ ۚ اِنْ امْرَاٌ هَلَكَ
لَيِّنٌ لَهُ وَلَدٌ فَلَهُ اُخْتُ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ
يَرِثُهَا اِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الشُّلُّانِ
مِمَّا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانُوا اِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلَّذَكَرِ مِثْلُ حَقِّ
الْاُنثٰى ۚ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَصَلُّوْا ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ۝ وَالنِّسَاءُ : ۱۷۶

”لوگ تم سے کلام کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں فتویٰ دینا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی، اور اگر بہن بے اولاد مرے تو سہیلی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکہ میں سے دو تہائی کی حوزہ دار بن جائیں گی، اور اگر کسی سہیلی جن ہوں تو عورت کا ایک اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم جھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔“

اوپر کی آیات میں جس وصیت کا ذکر آیا ہے اس کی نسبت یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ذریعہ فرمادی ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدُكُمْ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا
۝ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبٰىنَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلٰى

زندگی کی بقا اور اس کا تسلسل نظر آتا ہے۔

یہ عین تقاضے انصاف ہے کہ اولاد اپنے ماں باپ کی مساعی سے مستفید ہو، کیونکہ اگر مالی وراثت کا رشتہ کاٹ دیا جلتے تو بھی والدین اور اولاد کا تعلق ختم نہیں ہو جاتا۔ ماں باپ اولاد کی ذہنی اور جسمانی ساخت میں وراثت کے ذریعہ بہت سی صفات و استعدادات منتقل کرنے ہیں جو زندگی بھر ان سے جُدا نہیں ہوتیں اور ان کے آئندہ حالات کو بُری حد تک متعین کر دیتی ہیں یہ حالات اچھے ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ یہ بات اولاد کے بس سے باہر ہے کہ مرد و نہ صفات ہر کسی کو قبول کرنے سے انکار کر دے یا ان میں کچھ رد و بدل کر سکے۔ ریاست یا سناٹ کشاں جیڑی چوٹی کا زریعہ دے لیکن جس بچے کو اس کے ماں باپ نے ایک بد صورت چہرہ کا وارث بنا دیا ہے اُسے ایک حسن و جمیل چہرہ نہیں عطا کر سکتے۔ نہ اس کو مزاج کا اعتدال اور اعصاب کی محنت و سلامتی بخش سکتے ہیں جب کہ اس کے ورثہ میں غیر مستقل مزاجی اور بے ہنگم پن ہی مد ہو، اسی طائے اگر ماں باپ نے اُمّ الدین ربیعہ اور جابر بوڑھے اور ناکارہ ہو جانے کا مواد منتقل کیا ہو تو بوس کو لمبی عمر اور فراوان صحت کبھی نہیں دے سکتے۔ جب اس کو یہ سب کچھ بالاکسی ارادہ و اختیار کے ممبرا ہی قبول کر لیا تھا تو اجتماعی عدل کا عین تقاضا ٹھہرا کہ اسے اپنے ماں باپ کی خستوں کے ماذ و ثمرات بھی ملیں تاکہ نفع نقصان کسی حد تک برابر ہو جائے۔

قرآن نے اولاد اور آباء کے درمیان تکافل کو نبی علیہ السلام اور اس بندہ خدا کے قصہ میں ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے جس کو بقولہ تعالیٰ ”ہم نے اپنے جناب خاص سے رحمت عطا فرمائی تھی اور ایک مخصوص علم سکھایا تھا: ذَاتِیْنٰہُ رَحْمَۃٌ مِّنْ عِندِیْ نَادِعِلْمَہٗاۤ اِذَا عَلِمَہٗاۤ اَنْ یُّدٰیْہَا عَلِمَہٗاۤ“

فَاَنْطَلَقَاۤ اٰتٰیہَا اَهْلَیْہَا فَاٰتٰیہَا فَاٰتٰیہَا فَاٰتٰیہَا فَاٰتٰیہَا فَاٰتٰیہَا فَاٰتٰیہَا فَاٰتٰیہَا فَاٰتٰیہَا فَاٰتٰیہَا

اَنْ یُّضِیْقُوْہَا فَاَوْحٰدًا فِیْہَا جِدَّ اِذَا یُرٰیہَا اَنْ یُّنْقِضَ مَا قَامَہَا

(کہف : ۷۷)

”پھر وہ آئے چلے، یہاں تک کہ کبھی میں پیچھے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا۔ مگر

انھوں نے ان دونوں کی سیاف سے انکار کر دیا۔ وہاں انھوں نے ایک دیوار دیکھی جو

عراپا بنی تھی۔ اس شخص نے اُس دیوار کو پھر قائم کر دیا۔“

اس پر حضرت عائشہؓ کو یہ اعتراض تھا کہ جب تک بستی والے ان کو کھانا کھانے سے نکالی
 رہیں یہ ان سے اس کی اجرت طلب کر سکتے تھے۔ اَلْوَيْبُنْتُ لَتُحْذِثَ غُلَيْلًا خَرَاهُ، اس پر
 انھوں نے اس دینار کی قیمت کرنے کی نسل وجہ کائنات ان الفاظ میں کیا:

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ
 كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّهُ أَنْ يَأْتِيَهُمَا
 مَنَاسِكٌ فَسَخَّرَ لَهُمَا وَكَانَ غُلَامٌ مِنْ أَهْلِهَا يَأْتِيهِمَا

ترجمہ: ۱۸۲

اور اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ وہ قیہ لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں۔
 ۱۸۲ کے نیچے لڑکوں کے لیے ایک خزانہ ہے اور اس کا ایک ایک حصہ
 اس لیے ہمارے رب نے دیا ہے کہ وہ دونوں بچے ہوں اور ان کا خزانہ نکال لیں۔ یہ
 ہمارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ میں نے بنی رے سے نہیں کیا۔

اس طور پر دونوں لڑکوں کو باپ کی ٹیپ چھٹی سے فائدہ پہنچا، جو مال و دولت اور
 وسعت و اُن کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے یہ اس کے وارث ہوئے۔ اس کا بی بی برحق و انصاف
 ہونا بالکل واضح ہے۔

اس کے باوجود بھی جب دولت کے دن۔ ص ۱۸۲ میں گورہ کر رہ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے
 انہی کے مطابق حکمرانی کرنے والے مسلمان حاکم امت کے حال کے لیے مناسب اقدامات کا مجاز
 ہے۔ سلام اس بات کی صحت دیتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص ذرائع سے کام لے کر اصلاح مال کر رہا
 جیسا کہ آگے اقتصاد پالیسی کے باب میں آیا ہے۔ فرد جماعت اور جماعت فرد کے درمیان
 بھی تکافل کا یہ اصول کام کرتا ہے۔ یہ اصول ان دونوں پر کچھ ذمہ داریاں ڈالتا ہے اور دونوں
 کو کچھ حقوق سطا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلام دونوں کے مصالح کو باہم ایک دوسرے سے جوڑ کر
 ایک کر دیتا ہے اور دونوں میں سے جو بھی زندگی کے مادی یا اصولی اور معنوی کسی بھی پہلو سے متعلق

فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اس کو سزا دیتا ہے۔

چنانچہ یہ فرد سب سے پہلے اس بات کا مکلف ہے کہ اس کے ذمہ جو کام ہے اُسے کبھی نہ چھوٹی
انہی مددے۔ کیونکہ اس کی محنت کا پھل حقیقت جماعت کی مسکیت ہے اور ہر آنکھ اس کا اچھا بھلا اثر
جماعت ہی پر مرتب ہوتا ہے۔

وَقُلْ اَعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۝ (سورہ ۱۰۵)

”اے نبی! ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مومنین سب

دیکھیں گے کہ تم بار بار عمل کیا رہتے ہو۔“

یہ شخص کو جماعت کے مصالح کی نگرانی اس قدر ملحوظ رکھنی ہے کہ جیسے اُس کو اُن کا محافظ اور
نہجراں بنادیا گیا ہو۔ کیونکہ زندگی سمندر میں روار کشتی ہے جس کی سہارا تن کے بارے میں اس کا ہر سہارا
ہے اور کسی کو انفرادی آزادی کے نام پر اپنی سبک پر سوراخ کر دینے کا حق نہیں۔

مَنْ الْقَامُ عَلَى حَدِّهِ وَاللّٰهُ وَالْوَلٰٓئِقُ فَيُحَاكِمُ قَوْمًا اسْتَحْمَرُوْا

فِي سَفِيْنَةٍ ۚ فَاَصَابَ بَعْضُهُمْ اَمْلَاحًا وَبَعْضُهُمْ اَسْفَلًا فَاَنَّ

الَّذِيْنَ فِيْ اَسْفَلٍ اِذَا اسْفَقُوا مَرَدُّوْا عَلٰٓى مَن فَوْقَهُمْ فَمَا قَالُوْا لَا

خَرَقْنَا فِى نَصِيْبِنَا خَرَقًا وَلَمَّا نُوْثِقُ مَن فَوْقُنَا فَاَن تَرَكُوْهُمْ وَمَا اَزْدَرٰٓ

مَلِكُوْا وَاِنۡ اَعٰذُوْهُمْ عَلٰٓى اٰيٰتِنَا لَمَجْرٰٓ ۚ (نجم ۱۰۰)

(بخاری و الترمذی، واللفظ البخاری)

”اللہ کی کھینچی ہوئی مدد کا پاس رکھنے والے اور اُن سے نبی و رسول کے لئے کی مثال ایسی

ہی ہے جیسے کچھ ٹوٹ تھے جنہوں نے بہ مستریک جو کہ یک شتی حاصل کی کچھ ٹوٹوں

کو اوپر کا حصہ ملا اور کچھ کو نیچے کا۔ جو ٹوٹ نیچے کے حصہ میں رہے تھے ان کو یہ کہنے کے

لیے اوپر دیئے گئے کہ یہ اس سے جو کہ گدردن میں تھا۔ انہوں نے سوچا کہ کیا یہاں ہونا کہ اگر

ہم اپنے ہی حصہ میں (یعنی ٹکڑے) حاصل کرنے کے لیے ایک سوراخ کر لیں اور دیر دلوں

کو تکلیف دے دیں گے پھر جائیں۔ اگر لوگ ان (نیچے والوں) کو اُن کا ردہ چور کرنے دیں تو

خود بھی ہلاک ہوں اور اگر اُن کا ہاتھ پکڑ لیں تو وہ بھی نیچے جائیں اور سب کے سب نجات

یہ ہیں۔

فرمان کے مطابق "معاذ کے ساتھ جو ایک دوسرے سے منہ نہ ہونے کی۔ بڑی
چھوٹی تصویر بنے ہوئے۔ یہ سینڈ نہ طرز فکر کے متبادر میں پیش کی جاتے۔ جو معمولات
کے مطابق وراثتی ہیں کہ یہ ہیں۔ علمی حقائق کو یہ ان میں نے در وقت کے ملنے سے بچا رہا۔
سے نہ ہی ہے۔ یہ تو ہی بہت بڑی ہے۔ ایک میں کے ساتھ ہیں یہ بھی نہ ہی کہ فرد درجہ امت
انوں کے لیے۔ یہ ساری بات میں کیا تھا۔ یہی یہی ہے۔

معاذ کے متعلق ساری بات کو نہ دیکھیں۔ یہی ہے کہ کوئی فرد بھلا ہی نہیں کہ معاذ میں ہے
نہ ایک وقت میں ہی ہے۔ یہ یہ نہ ہی ہے۔

کلکم راع د کلکم مسئول عن رعیتہ۔ (مسلم بخاری)
ہم میں ہر ایک نگراں ہے۔ ہر جس سے اس کی نگراں ہے۔ یہ ہونے والوں کی بابت باز پرس
کی ہوتی ہے۔

سماج کے افراد کے درمیان نیکی اور معاونت کی حدود میں رہتے ہوئے باہم تعاون سماج
کی مصلحت کا عین تقاضا ہے۔ ایک مادی فریضہ ہے۔

وَتَعَاذُنَا عَلَى الْبُرِّ وَالشَّقْوَىٰ وَآلِ شَأْنٍ وَأَلِ شَأْنٍ وَالْعُذُوبِ

رمضانہ ۱۲:۱۲

ہر کام میں اور مدد دہی کے میں اس سب سے عاقل کرو۔ اور جو گناہ کے کام
ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

وَلَسٰكُنْ مِنْكُمْ اَمْلَهُ بِنَا نَحْوَ اِلَى الْخَيْرِ وَتَأْمُرُكَ بِالْمَعْرُوفِ وَ

يَنْهَوْنِ عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ (آل عمران: ۱۰۴)

ہم میں کچھ لوگ تو ایسے نہ رہیں جو آپ سے کسی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم
دیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔

اور بالمعروف کے سلسلہ میں ہر شخص سے الگ الگ پرسش ہوگی اور اگر اس نے یہ

فریضہ انجام نہ دیا ہو گا تو مجرم قرار پائے گا اور اسے اس جرم کی سزا ملے گی۔

تَخَذُوا مَقَلَّتَهُ ۖ ثُمَّ الْحَجِيمَ صَلَوَةً ۖ ثُمَّ فِي سُلْسَلَةٍ ذَمَّهَا
 سَبْعُونَ ذُرْعًا فَاَسْلُكُوهُ ۖ اِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ
 وَلَا يَخْشَىٰ عَلَىٰ طَعَامِ اَيُّسِكُمْ ۖ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَمًّا جَبِيًّا ۖ وَ
 لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غَنَائِي ۖ لَا بَأْسَ كَلَدًا اِلَّا الْخَاطِئُونَ ۖ (الحمد: ۲۰۳)
 اس کو پکڑو اور اس کے گلے میں ٹونڈ لو۔ سید، اس کو بیسہم میں نہ من کرو۔ دیر پڑے
 ستر گز لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ بیشک یہ وہ ہے جو خدا سے عظیم وجہیں پر بیان نہ کیا
 تھا اور نہ یہ تمنا جوں کو کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔ تو اب یہاں کوئی اس کا دست نہیں
 دے نہ اس کے لیے یہاں کوئی غذا ہے نہ خوش کے دھوون کے سوا۔ یہ غذا انہیں لوگوں
 کے لیے ہے جو شہنشاہ ہیں۔

مسکین کو کھانا کھلانے پر دوسروں کو نہ ابھارنا بھی کفر اور تکذیب دین کی نریح علامت
 شمار کی جاتی ہے۔

اَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالْبَدِينِ ۖ فَذٰلِكَ الَّذِي يُدْعَىٰ
 اَلْيَتِيْمَ ۖ وَلَا يَخْشَىٰ عَلَىٰ طَعَامِ اَلْيَتِيْمِيْنَ ۖ (الماعون: ۱۳)
 تم نے اس شخص کو دیکھا جو جزا و سزا کا منکر ہے؟ یہی ہے جو یتیموں کو دھکتے
 دے کر نکال دیتا ہے۔ مسکین کو کھانا کھلانے کی تسفین نہیں کرتا۔

ہر فرد اس بات کا مکلف ہے کہ جو منکر بھی دیکھے اُسے مٹا دے۔

مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ ۖ بَيِّنٌ لَا فَنَنْ لَّهِ يَسْتَلِيعُ فَبِلِسَانِهِ
 فَنَنْ لَّهِ يَسْتَلِيعُ فَبِقَلْبِهِ وَهُوَ اَضْعَفُ اَلَا بَمَكَتْ۔

(مسلم ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

”تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اُسے چاہیے کہ اُسے نادر بار و مٹا دے،

جس سے یہ نہ ہو سکے وہ زبان سے ہی اُس کو دور کرنے کی کوشش کرے، جس سے

یہ بھی نہ بن پڑے وہ دل ہی میں اس کے خلاف جذبہ رکھے، اور یہ ایمان کا سب

سے بچاؤ ہے۔“

اس طور پر فردوس منکر کے بارے میں جو بات وہ قرار پاتا ہے جو جماعت میں
روتھا ہو، خواہ وہ اس میں خود نہ شریک رہا ہو۔ کیونکہ جماعت ایک اکائی ہے جس کے لیے
منکر بڑا ذینِ ناک ہے۔ جماعت کو منکرات سے محفوظ رکھنا ہر فرد کا فرض ہے۔ اسی طرح
جماعت میں کہ اپنے ذائقے سے منکر کے صبر و پختیم بانی سے کام لے تو اس سے مؤخرہ
ہوگا اور اس کی سزا وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ بھگے گی۔ کیا تکذیب کی پرہیزگار سنت ذلت
میں، غفلت ہے کہ اپنے فرد کی کارن، پرست بن رہے

وَإِذَا أَدُّنَا أَنْ نَحْيِكَ فَإِنْ مَرَّ مِنْكَ مَظْهَرٌ مِنْهُ
فَعَلِّمْهُ سَلَامًا أَوْ مَعْرُوفًا مَعْرُوفًا ۚ
اور جب ہم کسی کو دکھائیں کہ اس سے دور رہو تو اس سے سلام یا موعظہ
دے دو۔ یہ ہیں ارادہ اس میں، اور اس کے لئے ہر نبی و رسول کا ہمسفر
سی رہیں۔ موعظہ ہے، اور ہر نبی و رسول کے لئے یہ ہے۔

یہ ہے اس میں بہت سے نکتے، فسق سے دور رہے ہوں۔ نگرانِ کاسِ فسق کے جو
کوٹھڑے ٹھنڈے، درخت، پتے رہنا ہی نہ کہتے، و ہر باد کیے جانے کے لائق نہیں ہے
وَتَقُوا أَنْفُسَكُمْ وَآلَكُمْ بِالنَّارِ ۚ إِنَّهَا خَالِدَةٌ لِمَنْ هَمَزَ فِيهَا
الْأَفْئَالُ ۚ (۱۲۵)

”بھوکے پیٹ سے تمہاری شامت مخصوص طور پر ہر فرد ہی دلوں تک محدود نہ رہے گی
جنہوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو“

اور اس میں غلغلہ کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ ہم قوم میں فواریش پھیل رہے ہوں
اور منکر کا ارتکاب علیٰ اعدائے جہنم ہو لیکن وہ اسے مٹانے کی طرف توجہ نہ کرے اس قوم
کا تیرا ہجہ کر رہتا ہے، وہ دوزگرتی اور زوال سے دوچار ہوتی ہے۔ جو تباہی اُسے یوں نصیب
ہوتی رہے ایک قدرتی اور لازمی نتیجہ ہے اس روش کا جو اس نے اختیار کی۔

منکر سے باز نہ آنے اور اُسے مٹانے کی کوشش نہ کرنے کے سبب ہی بنی اسے اس کی اپنے
انبیاء کی زبان سے لعنت سننی پڑی، ان کی ہوا کھٹ گئی، دورانِ کاعروج زوال سے بدل گیا۔

لَعْنَةُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ
مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ
عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ ۝ لَا يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۝ وَلَا لَئِيذًا ۝ (۹۹-۱۰۰)
”بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر دود و عیسیٰ ابن مریم
کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکشی ہوئے تھے درزیہ دنیا کرتے تھے۔
انھوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے تذکاب سے روکا چھوڑ دیا تھا جو
انھوں نے اختیار کیا۔“

حدیث میں آیا ہے کہ:

لَمَّا وَقَعَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ فِي الْعَامِ نَهْتَهُمْ عَلَاءُ هَمْ فَلَمْ
يَنْتَهُوا ۖ فَنَالَسُوهُمْ فِي مَجَالِسِهِمْ وَأَكَلُوهُمْ وَشَارِبُوهُمْ
فَضْرَبَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ وَلَعَنَهُمْ عَلَى لِسَانِ
دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ۔

”جب بنی اسرائیل میں گناہوں کا بازار گرم ہوا تو ان کے علماء نے انھیں روکا
لیکن وہ نہیں رُکے، اُن کے علماء نے مجالس میں ان کے ساتھ اُٹنا بیٹنا اور کھانے
ساتھ کھانا پینا، سب کچھ جاری رکھا اس پر اللہ نے ان میں سے بعض دُعا علماء کے
دلوں کو بعض دوسری (یعنی عوام) کے دلوں کے مانند کر دیا اور ان پر عیسیٰ بن مریم
اور داؤد کی زبان سے لعنت بھی۔“

آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے، اب سیدھے ٹیپے گئے۔ اور فرمایا:
لَا وَاللَّهِ نَفْسِي بَيِّدٌ لَا حَتَّى تَأْطِرَ وَهَمَّ عَلَى الْحَقِّ أَطْرًا۔

(ابوداؤد، ترمذی)

”نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جب تک ایسے لوگوں کو
بزرور بازو ٹیک طریقہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کر دوں گے (فلاح نہ پاؤ گے)۔“
رہے سچے مسلمان تو یہی لوگ ہیں جن کی بابت قرآن یہ فرماتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ لِبَعْضٍ يَتَذَكَّرُونَ
فِي الْغُحُوفِ وَالْشَّجَرِ الْمُنْتَشِرِ ۚ (التوبہ: ۱۶)

مومن و مومنہوں میں سے ایک دوسرے کے رفیق و مساز ہیں۔ جلال کا حکم، یہ رُتیرق سے روکنے میں۔
ایک پارچہ ہوگا ان کے آیت:

رَبَّنَا الَّذِینَ آمَنُوا غَنَبْنَاكَ أَنْفُسُكُمْ ۚ لَا یُبْصِرُكَ مِنْ مَّوَدِّ
أَذْنَانِ هَٰؤُلَاءِ نِیْمٌ ۚ (المائدہ: ۱۵)

”اے ایمان والے! وہ جو ہم نے تم پر ایمان لایا، تم نے ان کی آنکھوں سے تمہارے کچھ نہیں دیکھا۔
اگر تم خود راہِ راست پر ہو“

یہ فیوضِ سماویہ بہ نکر کو مٹانے اور مردود قرار دینے کی طرف سے خاموشی اختیار کر رہے ہیں۔
ہانزدہ راتیں بے خوابی پر حضرت بو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی کوتاہ فہمی پر بہ کرداشت کی:

بَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّكُمْ لَقَرُّوْنَ هٰذِهِ الْاَسَہُ وَاِنَّكُمْ لَتَسْمَعُوْنَ عَلٰی
عَلٰی صَوْعٍ ۚ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم یَقُوْلُ
”اِنَّ النَّاسَ اِذَا سَرَوْا الطَّالِمَ فَلَمْ یَاْحِدُوا عَلٰی سَدِّ اَوْتَانِکَ
اِنْ یَعْمَحُ اللّٰہُ عَلٰی عِقَابٍ“ وَاِیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلٰی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَاٰلِہٖ وَسَلَّم یَقُوْلُ مَا مِنْ قَوْمٍ یَعْمَلُ فِیْہُمْ شَاْیْءًا یَعْمَحُ لَمْ یَعْمَحْ رُوْی
عَنْ اَبِی بَعِیْرٍ وَاَنْہَ یَقُوْلُ اِلَّا بِوَسْطِکَ اِنْ یَعْمَحُ اللّٰہُ عِقَابَ۔
(ابوداؤد۔ الترمذی)

”اگر کوئی تم میں آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ لوگوں کا حال جب یہ ہو رہا ہے کہ وہ ظالم کو دیکھیں۔
مگر اس کا بڑھاپہ نہ ہو سکیں تو پھر اللہ کو ان پر عام عذاب بھیجے دیر نہیں لگتی۔ اور
میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ کوئی قوم ایسی ہو جس میں
سنا ہوں کا ارتکاب ہوتا ہو اور لوگ اس حالت کے بہ لئے پرنا درگاہی ہوں لیکن پھر بھی

نہ بدلیں توں پر اندرون سے سزائے عام نازل ہوتے دیر نہیں سکتی۔

در اصل یہی اس آیت کی وہ صحیح تفسیر ہے جو اسلام کے مقاصد سے میل کھاتی ہے۔
آیت میں تو مومن ذوق کی ذمہ داری کو بین ہے اور یہ کہ ایسی منفی کماہی جس کا مثبت طور پر کوئی اثر
میتا ہے۔ جو اس شخص کو اپنا معاملہ ہے۔ وہ اس پر صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ اسے رہبر ست
پر اس نے اپنی ہی کوشش کر دیکھیں۔ لیکن اگر وہ نہیں مانتا تو وہ جانے اور اس کا عمل اپنے کیے کا
پہل اُسے مل ہی جائے گا۔

جماعت اپنے کمزوروں کی حفاظت اور ان کے مسائل کی دیکھ بھال کے بارے میں جواب
ہے۔ چنانچہ اگر ناگزیر ہو تو ان کی حفاظت کی یہ طریقہ کرنا بھی ضروری ہے:
وَمَا كُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ أَغْفِيْنَ مِنَ الزَّهَابِ
وَالنِّسَاءِ وَالْوُلْدَانِ..... (النساء: ۵۵)
آخر کہا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، عورتوں اور بچوں کی خاطر۔ اور
جو کمزور یا کردار بے عیب ہیں۔.....

اسی طرح یہ ذمہ داری بھی اسی پر ہے کہ جب تک وہ سن و شد کو نہ پہنچیں ان کے اموال
کی حفاظت کرے۔

وَأَسْأَلُوكُمُ الْفَيْسُ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَإِنْ أَنْتُمْ مَغْفِرُونَ
فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَكْنُهَا أَزْوَاجًا
وَأَنْتُمْ كُفْرًا ۚ وَأَنْ تَكْبُرُوا مَا وَرَقَ كَانَ مِثْلًا فَلَيْسَتْ عَلَيْكُمْ
بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا (النسب: ۶۰)

”تیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان کے
اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال کے حوالے کر دو۔ ایسا بھی نہ کرنا کہ میرا نصیب
میں تجاوز کر کے اس خوف سے ان کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق
کا مطالبہ کریں گے۔ تیم کا جوہر پرست مال دار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور

خود میں جو وہ معدودہ طریقے سے کھائے۔ بھج کر جس کے ہاں کے جوئے کئے

جو ۱۰۰۰ روپیہ ہو گا۔ در حساب ہونے کے لیے سہ ماہی ہے۔

حدیث میں ہے کہ :

اسباغی علی الارمدی والمسکین کا لمحاہد فی سبیل اللہ

و کا سدنی بظہر اللیل • صومہ الھاد • زید عاری • زید عاری • سانی

یہ وہ مسکین تھے جو روزہ صومہ کرتے • (یہ کارنامہ کے اعتبار سے) بھج

فی سبیل اللہ کے • یہ وہ مسکین تھے جو روزہ صومہ کرتے •

نماز پڑھتا ہوتا

جماعت پنہاں پر • فقہاء کی ضروریات چنی کر نے کی ذمہ دار ہے • وہ زکوٰۃ دینا

کر کے • سب سے بھین مندرجہ میں فرما کرے گی • اگر یہ سب کے لیے نفایت نہ کرے تو

ذو استطاعت لوگوں پر • مسکینوں کا کیا جائے • ان سے ضرورت مندوں کی ضروریات

پوری ہو سکیں • ضرورت کی تکمیل کے ساتھ میں نے میں کوئی • سب سے پہلی میں نے نہیں کہ

کسی رعایت اس کی • ایک سیر کیونکہ اگر قوم کو ایک ذمہ کسی شب بھوکا رہا • نو ساری قوم بھر

گندہ ہمارے ہمارے کی • آگے لوگ ایک دوسرے کو بھوکوں کے کھانا کھانے پر نہ ابھاریں •

کَلَّا لَ تَكُونُونَ لِنَفْسِكُمْ ؕ لَا تَحْقُقُونَ حَتَّى تَعْلَمُوا مَسْكِينٌ ؕ وَ

مَا تَكُونُونَ لِنَفْسِكُمْ ؕ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ ؕ اَلَمْ تَرَ حَتَّى تَكَلَّمَ

اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

اَلَمْ تَرَ حَتَّى تَكَلَّمَ اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

اَلَمْ تَرَ حَتَّى تَكَلَّمَ اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

اَلَمْ تَرَ حَتَّى تَكَلَّمَ اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

اَلَمْ تَرَ حَتَّى تَكَلَّمَ اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

اَلَمْ تَرَ حَتَّى تَكَلَّمَ اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

اَلَمْ تَرَ حَتَّى تَكَلَّمَ اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

اَلَمْ تَرَ حَتَّى تَكَلَّمَ اِذَا رَكِبَ رَاكِبٌ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ وَكَانَ دَاوُدَ ؕ

کو کھانا کھلانے پر ابھارتے ہو، تم مُردے کی میراث سمیٹ کر ساری کی ساری خود کھا جاتے ہو اور مال سے انتہائی غبت کرتے ہو، ہر گز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر بیت کردی جائے درنہ رب اور فرشتے قطار در قطار آئیں اور میں دن جہنم کو دیکھ رہا ہوں، یہ بھائے۔ اس دن انسان کی فطرت کو یاد کرے گا اور اب سوچنے بچنے کا سوچ ہی کہا رہا۔ وہ کہہ گا کاش میں نے یہ زندگی میں آج کے لیے کچھ بھیجا ہوتا۔ پھر اس دن خدا کی طرح نہ کوئی عذاب دے گا اور نہ اس کی طرح کوئی تیر میں ڈے گا۔ اسے وہ روح جو اپنی دنیاوی زندگی میں مطمئن ہو گئی تھی اب اپنے رب کی طرف رجوع کر باقی حال کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے خوش تو میرے بندوں میں شامل ہو اور میری جنت میں داخل ہو جاۓ۔

حدیث میں آتا ہے :

ایما اهل عرصۃ اصبح فیہم امرؤ جائعاً فقد برئت منہم ذمۃ اللہ تبارک وتعالیٰ۔ (مسند امام احمد بن حنبل، نشہ کردہ امت ذمہ محمد شاہ کز حدیث نمبر ۴۸۸۰)

جس بستی میں کوئی شخص صبح کو اس حال میں اُٹھے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو تو یہ اللہ تبارک و تعالیٰ پر اس بستی کے بقا، و تحفظ کی کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی :

من کان معہ فضل فلم یعد بہ علی من لا ظہر لہ۔ ومن کان بہ فضل زاد فلیعد بہ من لا زاد لہ (مسلم۔ ابوداؤد)

”جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اُسے اُس کو دیرے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس زائد زادیرہ ہو وہ اُسے اُس کے حوالہ کر دے جس کے پاس زادیرہ نہ ہو“

من کان عندہ طعام اثنتین فلیذہب بشالث۔ ... فان اربع فخاصیں اور سادس (متفق علیہ)

”جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے آدمی کو درمیان بنا کر لے جائے۔ ... اور اگر چار کا ہو تو پانچویں یا چھٹے کو“

اقت اسلامیہ جسد واحد کے ہے۔ یہاں سے 'ہاں' تک ایک ہی سانس ہے۔
 ہے۔ ایک مضمون جو تعلیم بخشتی ہے۔ مضمون سے لے کر ایک نہیں ٹھوس رہے ہیں اس سلسلہ
 کی یہ تعبیر بڑی ہی دلکش اور موثر ہے۔ 'ہاں' یہی سلسلہ مسلم نے اس تصویر سی ان الفاظ میں
 کی ہے۔

میں نے اس میں سے دیکھا کہ جسم و اعضا کمال احسان
 اور انسانی مسد غصہ و غلیظہ کی دیکھ کر خدا کا لہجہ غنی
 و معنی ہے۔

اس وقت اگر وہ اس وقت میں اس کو جس طرح کہہ رہے ہیں
 غصہ و غلیظہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ مضمون غصہ و غلیظہ کے ذریعہ اس کا
 یہ سانس ہے۔

اسی کے لئے یہ سانس اور اس کے ذریعہ اس کا کمال کی ایک
 لطیف اور معنی سے مضمون ہے۔

انہوں میں سے کمال احسان پسند غصہ و غلیظہ (مسلم بخاری)
 یہ سانس دوسرے دوسرے کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے اس کے لئے
 ہر ایک دوسرے کو تھامے اور سنبھالے رہتی ہے۔

تعاون و تکافل کا یہ وہی ذریعہ ہے جس تک ہمارا تخیل پرواز کر سکتا ہے۔
 یہی انہوں جس کے تحت ان کی ہر سانس کے لئے سانس کی گنتی ہے اور انہیں سخت
 رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک یہ زندگی جان و ہاں اس کی عزت و آبرو کو محفوظ نہ کر دیتا ہے
 تعاون باہمی کا اصول عملہ متحقق نہیں ہو سکتا۔

کمال المسلم علی المسلم حرام دم و عذر و مال و دین (مسلم بخاری)
 یہ ایک سلسلہ کا سب سے پہلا سلسلہ ہے۔ اس کا خون اس کی عزت
 و آبرو اس کا مال ہے۔

اسی لیے اسلام نے قتل اور زخمیوں کے معاملہ میں برابر کے بدلے کا قانون بنایا اور قتل کے

جرم کو سزا کے معاملہ میں کفر کے برابر قرار دیا:

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِدًا فجزاءُہٗ لَا یُخَفَّفُ عَنْہُ مَا لَدَافِہُا۔

(النساء: ۹۳)

”اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔“

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللَّهُ ۖ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ وَمَنْ قَتَلَ مَظْلُومًا

فَقَدْ جَعَلْنَا لَوِیْلَہٗ سُلْطٰنًا ۚ (بنی اسرائیل: ۳۳)

”قتل جس کو زہم نہ کرو جسے اللہ نے حرم کیا ہے مگر حق کے سانچے، اور جو شخص

مظلوم کو قتل کیا یہ ہر مرنے والے کو مجرم نے قصاص کے مطابق ہے کا حق عطا کیا ہے۔“

وَكَسَبَ عَلَیْہُمْ فِیہَا اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ

وَالْاُذُنُ بِالْاُذُنِ وَالْاَدْبُکَ بِالْاَدْبِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرْحَ

بِالسَّیْرِ (سائدہ: ۴۵)

”جو زخمی ہونے سے بچو چپا پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے

بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت

اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ ہے۔“

اور قصاص پر ابھارتے ہوئے ’سمنے‘ اس کو حیانت کے یہ جہات بخش کر دیا:

وَلَكُمْ فِی الْفِصَاحِ حِیوۃٌ بَآرِئٌ لِّی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(البقرة: ۱۷۹)

”عقل و غرور رکھے دو اور نبرہ سے یہ قصاص میں زندگی ہے، مہربانہ کہ تم میں مانو

کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے۔“

بلشبہ اس میں زندگی ہے کیونکہ قتل سے روک کر گویا زندگی کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔

کے وجود و بقائے اس کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے بچانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ زن کی سزا بہت

سخت رکھی گئی ہے کیونکہ یہ مرتدہ و آبرو پر حملہ ہے مہربانہ اور عصمت و عفت کی بے ترستی ہے۔ اس سے

جہ سن میں فحشی کی اشاعت بھی ہوتی ہے جس کے ذریعہ تھوڑے ہی عرصہ میں نظم و ضبط کا پارہ پارہ ہو جاتا یقینی ہے۔ پھر اس سے رشتے غمناک بڑھ جاتے ہیں اور یہی بناوٹی ولایت کے ذریعہ بیوی کے رحم و کرم اور ان کی شفقت کی چوٹی کا باعث بنتا ہے۔

اسلام نے اس سزا کو سخت رکھا ہے۔ مگر اس نے شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے جتنی موت سنساری اور غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے کوڑے لگانے کی سزا مقرر کی ہے جو اکثر مہلت ثابت ہوتے ہیں۔

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةً

وَلَا مَآخِذَ لَهُمَا فِي دِينِ النَّبِيِّ (النور: ۲۰)

”مرد کے ساتھ ہونے والے مرد و عورت ہر ایک کو سو سٹون کوڑے مار دو اور

دووں پر سزا کاںوں سے نذر کرنے میں نہ ہو۔ یہی مطلق کام نہایت“

جو لوگ بھولی بہن و شادی شدہ عورت پر زانیہ پر زانیہ کرتے ہوئے زانیہ کی تہمت

لگاتے ہیں اور اس طرح ہر گھٹیا کی سزا دیتے ہیں اور حرف رکھتے ہیں ان کی سزا اس نے

جتنی کوڑے رکھی ہے۔ اس سے کہ تہمت طرز کی گائیہ جو نہایت نامی اور آبرو پر حملہ ہے یا اور بعض

دعویٰ کی بڑھانے کے باعث زانیہ کا ہر چہ ہے۔ پھر اس کے ہر چہ سے فحاشی و زانیہ کی پھیلتی ہے

وَالَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَا يَأْتُوا بِأَدْعَاءٍ نَّصِيحَةٍ

فَاجْلِدُوا لَهُمْ عَشْرًا وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً

أَبَدًا (النور: ۴)

”جو لوگ شادی شدہ عورت پر زانیہ کی تہمت لگائیں اور پھر

اس پر چار گواہ نہ پیش کر سکیں ان کو انسی کوڑوں کی سزا دو اور ان کے گواہوں

کی گواہی نہ قبول کرو“

چوری پر نہ دو سزے کی ملکیت پر بے جا زیادتی ہے۔ لہذا اسلام نے یہاں بھی سختی

بڑھائی اور اس کی سزا قطعید قرار دی اور دوبارہ چوری کرنے پر دوسرا ہاتھ بھی کاٹ لینے کا حکم دیا

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً مُّبِينًا

نَكَالًا مِّنَ الشُّرَاطِ (المائدہ: ۳۸)

اور جو خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ اُن کی کمائی کا بدلہ

ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔“

آج بعض حضرات جب اس سزا کا ایک شخص کے کچھ مال کی چوری سے مقابلہ کرتے ہیں تو انہیں یہ بہت سخت اور بے رحمانہ نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سزا کے تعین میں اسلام نے جماعت کے امن و تحفظ اور اس کی سلامتی کو سامنے رکھا ہے۔ نیز اس کے پیش نظر اس جرم کی مخصوص نوعیت بھی رہی ہے۔ یہ چوری چھپے کیا جانے والا ہرم ہے اور چھپا کر کیے جانے والے جرائم اپنی عین فطرت کے اعتبار سے سخت سزائیں چاہتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُن سے باز رہیں یہ سزا سخت سزا کے خوف اور اس کے اندیشے میں ڈری ہونے والی ہو کہ سلاہٹ کے نتیجہ میں کوئی نہ کوئی علامت چھوڑ جائیں یا کوئی ایسی حرکت کر جائیں جو اُن کا سراغ لگانے میں مدد دے سکے۔

واضح رہے کہ اگر چور نے خود اپنی یا اپنی والد کی ٹھوک کی شدت سے تنگ آکر مجبوراً چوری کی ہو تو ایسے حالات میں یہ سخت سزا، فہم نہیں کی جائے گی کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ ”مجبور پر کوئی تنگی نہیں“

فَمَن أَضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَ لَا اِنْمَاٍ فَلَا اَلْحَقَّ عَلَيْهِ ۚ (البقرہ: ۱۷۳)

”جو شخص مجبوری کی حالت میں مجبورہ ن میں سے کوئی چیز کھائے بغیر اس کے کہ وہ قانون

کا ردہ رکھتا ہو با ضرورت کی حد سے تجاوز کرے تو اس پر کچھ سزا نہیں“

اور شبہ پڑ جائے تو حد نہیں جاری کی جائے گی۔

ادْرُوا الْحُدُودَ بِالشَّبَاهَاتِ ۖ

”شبہات کی بناء پر حد و ساقط کرو“

جیسا کہ آگے آتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خدمت میں اسی اصول پر عمل کیا تھا۔

۱۔ عبد اللہ بن عباسؓ راوی ہیں کتاب الکامل لابن عدی۔ اور مسند ابو حنیفہ للہارثی۔

۲۔ استاذ محمد قطب کی کتاب انسان میں المآئید و الامام کا باب جرم اور سزا، ملاحظہ ہو۔

باب چہارم

اسلام میں اجتماعی عدل کے
قیام کے ذرائع

اسلام میں اجتماعی عدل کے قیام کے ذرائع

اسلام اپنے کام کا آغاز خارج سے نہیں داخل سے کرتا ہے اور اپنی صلاحیتوں کو سطح تک محدود رکھنے کے بجائے قلب و ضمیر کی گہرائیوں کو ان کا اصلی ہدف قرار دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ کبھی بھی زندگی کی واقعی صورتِ حار سے غفلت نہیں برتتا۔ وہ نہ تو نفسِ انسانی کی حقیقت اور اس پر طاری ہونے والے تدویر و قبض و بسط کی مختلف کیفیات کو نظر انداز کرتا ہے نہ اس حقیقت کو کہ ایک طرف بلند پروازی، نیک ارادے و جذباتِ عالیہ ہیں تو دوسری طرف پاؤں میں ضروریات کی زنجیر بھی ہے۔ انسان کی پرواز کتنی ہی بلند ہو، یہ جان ناتوں کساں مطلق تک پہنچنے سے قاصر ہی رہتی ہے۔

نفسِ انسانی کی گہرائیوں کی بابت اپنے تمام علم کی رہنمائی میں اسلام قانون ہی بناتا ہے اور ترغیب و تنبیہ کا فرض ہی انجام دیتا ہے۔ اسی کے مطابق وہ کچھ کاموں کا حکم دیتا اور کچھ چیزوں سے روکتا ہے۔ انسانی نفسیات کے اسی علم کی روشنی میں وہ حدود وضع کرتا اور ان کو نافذ کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے جاوہِ ضمیر انسانی کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ قوانین و ضوابط کی حدود تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اور بھی جنب بند ہو سکے اور جتنا اونچا معیار قائم کر سکے کرے۔

اس دین میں جو فرائض عائد کئے گئے ہیں ان کو نافذ کر دینے سے بھی زندگی کی کاڑی نہ صرف بہرہ چم پڑتی ہے بلکہ انسانی زندگی میں موزونیت و ہمہ جہت بھی آجاتی ہے۔ لیکن طبیعت کے علو، غلب و خطر کی سخت اور نیچی کے کاموں کی مسابقت کی اس اسپرٹ کو اپنایا جائے جس کے لئے اسلام انسانی ضمیر کو ابھارتا ہے تو مسلمان کی شخصیت کمال کے مدارق بھی طے کر سکتی ہے۔

اس دین میں قلب و ضمیر کو مخاطب کرنے والی تلقینات اور ہدایات ہی وہ چیزیں ہیں جو لازم قرار دی

وَالَّذِينَ يَزْمُونَ الْمُحْسَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَدِلَّةٍ شَهَادَةٍ فَاجِلِدُوهُمْ
تِسْعِينَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ
(النور: ۴)

”جو لوگ شریف عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور پھر اپنے اس دعوے پر چار گواہ نہ
لا سکیں تو ان کو اسی کوڑے مارو اور ہمیشہ کے لئے ان کی گواہی قبول کرنا جھوٹا دہ لوگ کہتے
فاسق ہیں“

وَالَّذِينَ يَزْمُونَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شَهَادَةٌ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ
اَحَدٍ مِنْهُمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهُ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنْ
لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ۝ وَيَذَرُ عَنْهَا الْعَذَابَ اِنْ
تَشْهَدُ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّكَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنْ غَضِبَ
اللّٰهُ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (نور: ۲۶)

”جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس اپنے دعوے کے دو گواہ
نہ ہوں تو ایسے افراد میں کسی ایک فرد کی شہادت اس طور پر لی جائے گی کہ وہ چار بار اللہ کو گواہ
بنا کر یہ بیان دے کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر
اللہ کی عتاب کا پڑے جس عورت پر یہ الزم لگایا گیا ہے اس کے سر سے سزا مل جائے گی اگر
وہ چار بار اللہ کو گواہ بنا کر یہ بیان دے کہ مرد اپنے دعوے میں جھوٹا ہے پانچویں بار اسے
یہ کہنا ہوگا کہ اگر مرد سچا ہو تو خود مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو“

یہاں تک کہ جن امور میں وہ دستاویز لکھنے کا حکم دیتا ہے وہاں ہی گواہی کو ضروری قرار دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَيْتُمْ بِدِينٍ اَوْ اٰجَلٍ مَّا بَيْنَ يَدَيْكُمْ فَكُتِبْهُ ۚ وَتَكْتَبُ
بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَيَكْتُبُ ۚ
وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ وَلَا يَخْشَ مِنْهُ تَبِيْءًا ۚ فَاِنْ
كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيعُ اَنْ يَمْلِكَ هُوَ
فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاَسْتَشْهِدُوا شَٰهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ

اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے :

مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَاسِعُهُمْ وَلَا خُمْسَهُ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ
وَلَا أَدْنَىٰ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا ثُمَّ يَنْتَبِهُم بِمَا عَمِلُوا
يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (مجادلہ: ۷)

”کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی جی نہیں ہوتی جہاں چوتھا اللہ خود نہ ہو۔ ورنہ ہی یہ ہوتا ہے
کہ پانچ آدمی محو سرگوشی ہوں، اور چھٹا اللہ خود نہ ہو۔ اسی طرح جب جی س سے کم یا زیادہ تعداد
میں جمع ہو کر وہ سرگوشیاں کرتے ہیں تو اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ خواہ وہ کہیں پر ہی ہوں۔
پھر قیامت کے دن اللہ ان سب کو ان کے کرتوت سے آگاہ کرے گا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ
ہر بہ بات کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔“

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۚ وَكُنَّ أَقْرَبَ إِلَيْهِ
مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۚ إِذْ يَنْتَقِي الْمُنْتَفِعِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ
قَعِيدُهُ ۚ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۚ (ذی: ۱۶ تا ۱۸)

”ہم نے ہی تو انسان کو بنایا ہے، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کیا سکھاتا
پڑھاتا رہتا ہے۔ اور ہم اس سے اس کی شر و گ کی بہ نسبت بھی زیادہ قریب ہیں۔ جب کہ اس
کے دائیں اور بائیں بیٹھے دو نوٹ کرتے دے س کی ساری باتیں سوٹ کرتے رہتے ہیں وہ
مذ سے کوئی بھی لفظ نہیں نکالتا۔ مگر یہ کہ ایک نگران کا مستعد و نیا۔ اس کے پاس دس بات
کو نوٹ کرنے کے لئے، کھڑا رہتا ہے۔“

فَإِنَّهُ يَعْلَمُ السِّرَّ وَالْخَفَىٰ ۚ (ہود: ۷۰)

”وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے۔“

غرض یہ کہ اسلام نے انسان کو حسن عمل پر حسن انجام کی بشارت بھی دی، اسے بد اعمالیوں کے انجام بد
سے ڈرایا بھی، اور اس پر اچھی طرح واضح کر دیا کہ اُسے اپنے عمل کا دنیا و آخرت میں حساب دینا ہو گا وہ نہ تو اپنے
اعمال کے نتائج سے بچ سکتا ہے اور نہ جزا و سزا سے۔

وَلَنُصِغَ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ

اسلام نے زکوٰۃ کو صاحب استطاعت لوگوں کے مال میں ضرورت مند لوگوں کے حق کے طور پر فرض قرار دیا ہے۔ اس نے اس حق کو شرعاً واجب و اصول قرار دیا ہے جسے اسلامی ریاست بھی وصول کر سکتی ہے۔ یہیں سے فقہی اس نے اس حق کی ادائیگی پر انسانی شعور و وجدان کو بھی ابھارا اور دُعا میں یہ تحریک پیدا کی کہ صاحب استطاعت خود ہی ہر ضا و رغبت اس کی ادائیگی میں پیش قدمی کریں۔

چنانچہ اس نے واضح کیا کہ زکوٰۃ عمارت اسلام کے ستونوں میں سے ایک اہم ستون اور ضروریاتِ ایمان میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِزَكَاةٍ فَعِلُّونَ ۝
(المؤمنون: ۱-۴)

”ایسے مؤمنین کی کامیابی یقینی ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ عداوتوں سے دور رہتے۔ اور زکوٰۃ دے رہتے ہیں۔“

تِلْكَ آيَاتُ الْغُرَابِ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝ هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝
(الغزل: ۱-۴)

”یہ آیت کی بات میں جو ایک واضح کتاب ہے اور ان مؤمنین کے لئے ہدایت و بشارت جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔“

وَرَبِّكَ زَكَاةً ذُرِّيَّةً ۝ سَلَامٌ مِّنَ رَبِّكَ ۝ وَبَشِيرٌ لِّمَن يَخْشَىٰ ۝
وَقِيلَ لِلْمُتَشَكِّكِينَ ۝ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝
(الاحقاف: ۱-۴)

”تو فرمایا کہ زکوٰۃ دینا اور جو اللہ کے خوف میں ہے۔“

پھر یہ کہ زکوٰۃ دینا اللہ کی رضا کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاتَّبِعُوا الرُّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

عطا کیا۔ ان سب کو ہم نے صالح اور نیکو کار بنایا اور ہم نے ان کو ہادی اور رہنما بنایا کہ یہ جہاد
حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ ہم نے انکو پہلے کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا
کرنے کی تلقین کی اور یہ سب ہمارے عبادت گزار بندے ہیں۔
پس ہر ہونٹ کا جو اس رزمی فریضہ کو نہیں ادا کرتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
مَنْ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَهُوَ يُوَكِّدُ زَكَوٰتُهُ مِثْلَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَيْءٌ عَافٍ لَهُ
رَبِّينَا يَطْوِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَمْرِيَا خَذَ بِلَهْزَمِيَةٍ يَعْنِي بِشَدَقِيَةٍ
ثُمَّ يَقُولُ: اِنَّمَا مِلْكُ اِنَّا كُنَّا كُنَّا (بخاری و نسائی)

”جیسے کہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے مال کی زکوٰۃ دینے کی توقیامت کے دن اللہ
اس مال کو ایک خوفناک سانپ کی شکل میں ظاہر کرے گا جس کے سر پر کھڑے ہوں گے
اور جس کی ساقوں کے درمیان دھننے ہوں گے۔ یہ سانپ اس کے گچے کا بارہا بیا جائے گا۔ اور سانپ
اس کے دونوں جڑوں کو پکڑ رکھے گا چرکتے گا۔ میں ہوں تیرا مال میں ہوں تیرا خزانہ“
کھانا ہونا ک در ہونا ک ہو کا وہ منظر۔

زکوٰۃ ایک شرعی فریضہ ہے جو ایک متعین شرح کے مطابق مال پر عائد ہوتا ہے۔ اس کے ہلو پہلو صدقہ ہے
جس کی کوئی حد یا شرح نہیں مقرر کی گئی ہے۔ بلکہ یہ فرد کے ضمیر پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ فی الحقیقت وجدان و شعور
کی قوت سے، اور اس خوف اور باہم رحم و کرم کا تیر ہے جس کی تعلیم پر اس دم سے بہت زور دیا ہے۔ فرقہ کا احساس در
اور رحم و کرم کی طرف اس کا غلبہ یا مبینہ دونوں ہی اس کا ذریعہ ہیں اور اس طرح ایک وقت دو اہم مقاصد
پورے ہوتے ہیں۔ وہ بدن کی گہری تربیت بھی ہوتی ہے اور فی الحال انسانی مرج رکھے والے ٹھوس اور پائدار اجتماعی
تکافؤ بھی وجود میں آتا ہے۔ سلام باہم رحم و کرم کی اس صفت کو خاص انسانی نیا دونوں پر استوار کرتا ہے۔ اور اسے
اخوت و فی کا پابند بھی نہیں بناتا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

لَا يَسْأَلُكُمْ اللَّهُ عَنِ الدِّينِ لَمْ يُقَاتِلُكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُكُمْ
مِّنْ دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ أُولَٰئِكَ

آپ نے یہ بھی بتایا کہ :

دَحَلَتْ امْرَأَةٌ فِي اِمْرَةٍ رُبِطْنَهَا . فَلَمْ تَطْعَمْهَا . وَلَمْ تَدْعُهَا
تَاكُلْ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ . (بخاری)

”ایک عورت دوزخ میں اس لئے رجم ہوئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھے رکھا، تو
خود اسے کچھ دیا نہ چھوڑ دیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر پیٹ بھر لے“

پس اسلام میں رحم و کرم بہان کی بنیاد و رس کی پہچان ہے۔ کیونکہ یہ ضمیر کے دین سے مناسبت ہونے ضمیر
میں دینی روت کے ساتھ ساتھ دنیوی روت کی دلیل ہے۔ ورنہ سادہ ہی یہ آدمی میں انسانیت کی اس روت کے وجود کی
علامت نہ ہوتی ہو تو اسلام کے نزدیک دین ہی مقصود سمجھا جائے گا۔

اسلام اسی مباد پر انسان کو صدق و حسن سوک کی ترغیب دیتا ہے۔ اور انفاق سے اس کے لئے محبوب
بنادیتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ طب اچھی سے دنیا میں خوشنودی رب اور اچھے ہمسے کی خاطر انفاق کیا
جائے۔ ورنہ کسی کے ذریعہ آخرت میں ثواب کا حصول اور اللہ کے عذاب سے نجات چاہی جائے۔

”ان غلام پکے، مطیع اور فرمانبردار بندوں کے لئے جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنے مال صرف کرتے
ہیں، اسلام ایک عظیم شوقین ہی دیتا ہے۔“

وَبَشِّرِ الصَّالِحِينَ ۚ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرُوا اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ
وَالْمُسْلِمِينَ ۖ اَعْلٰوہ وَاَعْلٰوہ وَاَعْلٰوہ ۚ رَاجِعْ ص ۵۰

”مخبرین رسد فکدہ گوئوں، گوشتات دے دیجئے۔ ان گوگوں کو جن کا حال یہ ہے کہ
جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے تو فوری خشیت سے ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور
جب کوئی مسیبت ان پر آن پڑتی ہے تو اس پر صبر کرتے ہیں یہ نہ زقائم کرنے والے
لوگ ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں“
وہ جان پر کتنا گہرا اثر چھوڑ جائے وہ ان تصور ہے! قرآن اسی نقش کو ایک بار پھر دوسرے
انداز میں تازہ کرتا ہے:

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰتِیَاتِ الدِّیْنِ اِذَا ذُكِرُوا بِهَا خَوْفًا وَتَضَعًا ۚ اَوْ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّہُمْ
وَهُمْ لَا یُسْکِرُوْنَ ۚ تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضٰجِیْۃِ یَدْعُوْنَ رَبَّہُمْ

بر علی ترین انسانیت کی ستر میں اور سب سے اچھوتی تصویر سے کچھ اور بندہ گمان خدا کی ایک تصویر اور
 بھی ہے جو حسن و دلکشی میں دنیا میں اس سے کم نہیں۔ بعض روایات کے مطابق یہ لوگ حضرت علیؑ آپ
 کی سوی فاعل بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے گھر والے ہیں۔ رضی اللہ عنہم ورضوانہ
 مَوْفُونَ بِمَنْذُورٍ وَبِخَافَتِ مَوْتِكَ نَزَّاهُ مُسْتَظَرَّاهُ وَطُغَمُونَ أَضْعَافَ
 مِنْ حُبِّهِ مَسْكِبًا وَنَمِيبًا وَاسْبِرَّاهُ إِنَّهُ لَطُغَمُهُ لَوْجِدِ اللّٰهِ لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ
 خَوَآءَ وَلَا تَسْكُورَاهُ رَبَّ نَحْنُ مِنْ رَبِّكَ يَوْمَ عُبُو سَافِطَرِ بَرَّاهُ فَوْقَهُمْ
 مَنُذِرُ دَائِكَ مَوْبُورَافَهُمْ نَصْرَهُ وَفَرَّوْزَهُ وَجَرَهُ بِمَا تَمَرُّوْاجَتَهُ
 وَخَرِبَرَّاهُ مُسْكِبَسَ وَبِهِ عَلَى لَرَاتِكَ لَا تَبْرُونَ فِيهَا سَمْسَا وَلَا رَمَزَهُ
 وَدَائِدَ عَلَيْهِمْ طِبَسَ دَائِدَ قَطُوفَتِ تَدَائِدَهِ وَنَطُوفَ عَلَيْهِمْ بِنَبِ
 مِنْ قِصْدٍ وَشَوْبٍ مَتُ فَوَارِوَرَهُ فَوَارِوَرٍ مِنْ قِصْدٍ قَدَرُهَا تَقْدِيرُ
 وَتُسْفُونَ فِيهَا كَأَسَاكَاتٍ بِرَاحَتِ رَحْمَتِهِ عِبَّ فِيهَا نَمِي سَلَسْبِدَهُ
 وَخُوفَ عَلَيْهِ وَدَائِدَ مُخْتَدُونَ : إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبَهُمْ لَوْ لَوْ
 مَسْكَوْرَاهُ وَادَارَاتِ تَدَائِدَ لَعِبْنًا وَمُلْكًا كَبَرَّاهُ حَلِيَّهُمْ بِنَاتِ
 سَدَسِ حَضَرٍ وَاسْتَرْفَ وَخُفَّوْا سَاوَرِ مِنْ قِصْدٍ : وَتَسْمَعُهُمْ
 رَبُّهُمْ سَرَاتًا ظَهْرَاهُ نَحْنُ هَدَانِ كُنْ خَوَآءَ وَكَانَ سَعْلَكُمْ
 مَسْكَوْرَاهُ - (الدہر: ۲۲ تا ۲۳)

یہ وہ لوگ ہوں گے (جو) یہاں نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں
 جس کی آفت ہر طرف پھیل ہوئی ہوگی۔ دراندہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو
 کہنا نامکملاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ تم ہمیں اللہ کی خاطر حصار ہے ہیں ہم تم سے
 نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق

اللہ نذر کے معنی میں خدا سے یہ عہد کرنا کہ آدمی اس کی رضا کے لیے دھن سے زائد نیک کام

کرے گا۔

ہے جو سخت مصیبت کا نشانہ بن گئیں ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے ثواب سے
 سزا دے گا اور انہیں برکت اور سزا دے گا۔ ان کے صبر کے بدلے میں انہیں جنت
 اور رستہ کی لباس عطا کرے گا۔ وہ وہ دیکھیں مسندوں پر بیٹھے، گائے بیٹھے، بکری
 نہیں، حساب کی گری ستارے کی نہ جڑے کی شہرت کی چھانک تپا پھیل ہوئی مایہ
 کر دی ہوگی، اور اس کے چلنے والے وقت کی بس میں ہوں گے۔ انہیں انہیں یہاں بھی دیکھیں
 ان کے آگے پانڈی کے ہیں در شیشے کے پیالے گردش کرتے ہوتے ہیں۔ جیسے کسی وہ
 جو چاندنی کی صوفیے ہوں گے، اور ان کو منتقلی منتقلی ٹھیک نہ کر سکے مطابق ہوا
 ان کو دباں ایسی شرب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سوٹھ کی آمیزش ہوگی، یہ سنت ایک
 چتر ہوا جسے مسلسل کہا جاتا ہے۔ ان کی خدمت کے لیے ایسے لڑکے ہوتے ہیں جو ہر لمحہ جیتے رہتے
 ہیں، یہ گئے نہ انہیں دیکھو تو بچہ مرقی میں تو کچھ بچے گئے ہیں، وہاں جہد بھی تم نکاح
 انہیں نعتیں سنائیں، در یک ہر سہنت کا وہاں انہیں نظر آئے گا ان کے دیر یک
 رتہ کے بند ہیں، در جس دیر کے پڑے ہوں گے، ان کو چاندنی کے ٹنگں پہنائے جائیں گے
 اور ان کا بے ن کو ہدایت، گیزہ شرب پلائے گا۔ یہ بے بہاری جزا در تہاری کارگزاری قابل قدر
 ٹھیکری ہے۔

صدق اللہ کو دبا جانے والا قرص ہے جس کی ادائیگی کی ضمانت دی گئی ہے۔

فَنَذَرْنِي فَرَقًا وَآسَافًا وَمَا كُنَّا بِمُعَظَّمِي مَالٍ (المجادید: ۱۱)

میں صبر کا انکسار ہوں میں معنی میں نہیں کیا یہ ہے کہ یہ ان کے جہد کرتے دم تک خدا کے حکام کی پابندی کرنے رہے اور
 اس کی نافرمانی سے پرہیز کرتے رہے۔

لے سورۃ زمر آیت ۱۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ ان کے آگے سونے کے برتن گردش کرتے رہے ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ
 کبھی وہاں سونے کے برتن استعمال ہوں گے اور کبھی چاندنی کے۔ اسے یعنی وہ ہوگی تو بے دریغ تیری کی طرف تعاون ہوگی
 لے اہل بیت چونکہ شہید کے ساتھ سوٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے، اس لیے وہاں لگایا گیا کہ وہاں ان کو وہ شرب
 پلائی جائے گی جس میں سوٹھ کی آمیزش ہوگی۔

لے سورۃ حج آیت ۲۳ در سورۃ فاطر آیت ۲۲ میں بیان ہوا ہے کہ انہیں وہاں سونے کے ٹنگن پہنائے جائیں گے۔ اس سے
 معلوم ہوا کہ اسی مرض اور پسند کے مطابق جو بچہ چاہیں گے سونے کے ٹنگن پہنیں گے۔ جب چاہیں گے چاندنی کے ٹنگن پہنیں گے
 اور جب چاہیں گے دونوں کو ملا کر استعمال کریں گے۔

”کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دے تو پھر اللہ اس کو کئی گنا کر کے لوٹائے اور مزید برآں اسے معقول بدلہ بھی دے۔“

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْقُرْصُونَ وَاللَّهُ قَرِصًا خَسِيًّا يُضْعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ
أُخْرُ لِرَبِّهِمْ راجدہ ۲۸

”صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں جنہوں نے صدقہ کو قرضِ حسن دیا، اس کو وہ کئی گنا کر کے لوٹے گا۔ نیز ان کے لئے، اس نیکی کا مناسب اجر الگ سے ہوگا۔“

یا پھر یہ ایک نفع بخش تجارت ہے جس کا پورا بدلہ ملے گا:
إِنَّ الدِّينَ بِنُكُونِ بَيِّنَاتٍ وَاللَّهُ وَاقٍ مُّوَّالٍ الصَّلَاةَ وَالْزَّكَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ
وَعَلَا يَبِيذُ نَزْحُونَ تِجَارَةً لَّنْ نُّؤْزِرَهُ لِيُوقِيَهُمْ أُخْرَهُمْ وَبَزِيدَهُمْ مِنْ
فَضْلِهِ ۚ إِنَّ عَفْوَكَ سَكُورٌ رَفَاطٌ ۚ (۲۹-۳۰)

”جو لوگ کتابِ اللہ کی نکتہ دہی کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ نیز جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے کھلے چھپے یہ خیر میں خرچ کرتے ہیں وہ ایک ایسی تجارت کر رہے ہیں جس میں گھماٹے کا کوئی امکان نہیں۔ ان کے اعمال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ ان کو پورا پورا بدلہ دے اور اپنی خصوصیت میں بانی سے ان کو اس کے علاوہ مزید انعام سے بھی سرفراز فرمائے۔ درحقیقت وہ خطاؤں کو بخش دینے والے بڑا قدر شناس ہے۔ یہ صدقہ ہر حال میں کچھ نہ کچھ نفع دے جائے والی تجارت ہے، اس میں حق تلفی یا خسارے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔“

وَمَا يَفْقَهُوا مِنْ خَيْرٍ وَلَا يُنْفِقُوا إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ
وَمَا يَفْقَهُوا مِنْ خَيْرٍ تَوْفِئَتِكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۝
(البقرہ - ۲۷۲)

”اور خیرات میں تم جو مال خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لئے ہے۔ آخر تم اسی لئے تو خرچ کرنے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تم جو مال خیرات میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا۔ اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔“

اس کی ادھی فام گاہ ہوں گے وہ خود بھی اس میں داخل ہوں گے اور ان کے ہاؤس
اور ان کی موبیل اور ان کی والدین سے جو کچھ صاف ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں
جائیں گے۔ دیکھو۔ عارف سے اس کے سنسنی کے بے تہ ہیں گے اور اس سے کہیں گے
”میرے سہ ماہی سہ ماہی تم سے دنیا میں جس طرح سے کام سب اس کی بدولت آج اس کے
مستحق ہوئے ہوئے دیکھو کیا چہاں یہ آخرت کا کھڑا۔ لیکن وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو
مضبوط باندھتے ہیں ان کے بعد توڑا جاتا ہے۔ جو ان کو کھاتے ہیں جنہیں اس نے
جوڑے کا حکم دیا ہے اور جو زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ یہ لوگ نعمت کے مستحق ہیں
اور ان کے لئے آخرت میں بہت بڑا ٹھکانا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ سے دست کشی بلاکت کے ہم معنی ہے۔

وَالْفَقْرُ إِلَى سَبِيلِ الْمَدَدِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۚ

”جو کہی رہے اس پر پڑ کر اور پتہ دھموں اپنے آپ کو موت میں ڈالو۔

اس بات میں فرد کی طاقت مضرت نہ ہونے پر اس کو اختیار رک خود کو مذاب آخرت کا مستحق
اور اس میں لوگوں کی طاقت کا سہ اور اعظم نہیں ہے۔ اور یہ عدم انفاق کی وجہ سے سمجھ میں عدم تساقوت
میں دیکھو۔ فقر و فساد و کمزوری و انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں احتیاطی بلاکت بھی ہے۔ دو
سے فقیروں کو محروم کرنا صریح زیادتی ہے۔

أُفٍّ لِّمَن كَانَ يَسْتَكْبِرُ ۚ وَفِى جَهَنَّمَ كُلٌّ كِفَارٍ عَمَلٍ ۚ مَثَابِعُ لِلْحَبْرِ مُعْتَدٍ مُّزِينٍ ۚ

(رق: ۲۴-۲۵)

”اے ناشکر مخالف کو جہنم میں جھونک دو جو غریبوں کو دولت سے محروم کرنے والا زیادتی
کرنے والا اور دین کی حقانیت کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہے۔“

وَلَا تَضَعُ كُلُّ ذَلَالٍ مِّمَّنْ ۚ هُنَّ أُمَّةٌ مِّنْ أُمَّةٍ ۚ مَثَابِعُ لِلْحَبْرِ مُعْتَدٍ مُّزِينٍ ۚ

(اسم: ۲۶)

”بہت بڑے بڑے کہیں کھانے والے بے وقعت و کینہ طینت انسان کی بات نہ مانو جو غیبت

کرنے والا اور چیل خور ہے۔ نیز دولت سے غریبوں کو محروم کرنے والا اور حق تلفی کرنے

یہ زیادتی اللہ کے حق میں بھی زیادتی ہے اور جماعت کے حق میں بھی۔ جماعت کے ایک فرد کی حیثیت سے ایسا شخص خود اپنے اوپر بھی زیادتی کرتا ہے۔ پچھلی اور حسن سلوک جنت میں ٹھکانہ دیتی ہے ورنہ کار و وہ گھٹی پار کرتی ہے۔ جو جنت اور اس کے درمیان عامل ہے۔ یہ گھائی دراصل گردنوں کو چپٹا مانتا ہے جو اور مفلس کے دنوں میں کھانا کھلاتا ہے۔

وَمَا آذَرْتُمْ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَكُنْ رَحِيمًا ۝ وَأَوْطَأْتُمْ بَنِي يَوْمَ ذِي مَسْعَةِ ۝

بَنِي نَادٍ أَصْفَرِيَّةَ ۝ أَيْ مُسْكِبًا أَذْأَمْرًا ۝ (المائدہ: ۶۰)

”جانتے ہو یہ گھائی کیا ہے؟ کسی غلام یا قیدی کی گردن چپٹا کر یا کسی قربت دہنیم یا مفلس و فلاں مسکین کو فاقہ کے دنوں میں کھانا کھلا دینا۔“

ان کاموں سے جان چرنا انسان کو جہنم کے حوالہ کرتا اور صحت خاں میں جا کھڑا کرتا ہے۔

مَا سَأَلَكُمْ فِي سَبْعَةٍ قَوْلًا ۝ نَكُ مِنَ الْمُصْلِينَ ۝ وَكُنْتُمْ تُسْعِدُونَ

الْمُسْكِينَ ۝ وَمَا تَحْوَصُّ مَعَ الْخَالِيَيْنِ ۝ وَكُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ (سورہ البقرہ: ۱۷۷)

”حتیٰ آتینا البقیۃ ۝ (المائدہ: ۷۲ تا ۷۴)“

”تم کو کس مائت نے جہنم میں داخل کر دیا؟ وہ بولے ہم نمازی نہ تھے۔ اور نہ ہی

ہم مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے ہم آیات الہی کے ساتھ کھیلنے والوں میں شامل

ہو کر اس جرم کے مرتکب بھی ہوتے تھے اور ہمارے دن کا بھی انکار کرتے تھے

تا آنکہ ہمارے سامنے وہ گھڑی آن پہنچی جس کا نام بقینی تھی۔“

وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَرَابًا ۝

بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۝ سَيُطَوَّقُونَ مَا يَخْلَوْنَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۝ (سورہ البقرہ: ۱۷۷)

”جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور جو وہ فضل سے کام لیتے ہیں وہ

اس خیال میں نہ رہیں کہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں یہ ان کے حق میں نہایت

بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی بکھوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے

گلے کا طوق بن جائے گا۔“

کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھ اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اس میں
بخل سے کام نہ لے۔ میں نے کہا اسے اللہ کے رسولؐ! یہ کیسے ہو سکے گا؟ آپؐ نے فرمایا:
یا تو یہ روش اختیار کرنی ہوگی یا جہنم کا بندھن بننا پڑے گا۔

یہی نہیں بلکہ ان کے بخل اور منع خیر کے بدلے ان کو دنیا میں بھی کبھی سزا مل جاتی ہے۔ قرآن کریم
ایک چوڑے سے قصبے کے ذریعہ ایک مثال سامنے لاتا ہے۔ یہ کچھ لوگوں کا قصہ ہے جن کے پاس کینا میچ
تھا جس کے پھلوں میں سے یہ فقر کو بھی کھلایا کرتے تھے۔ پھر ان کے جی میں آئی کہ جو سی کریں اور کسی کو
کچھ نہ دیں۔ ادھر باغیچہ پر ایک آفت آئی اور سہ میاں نے اس کے پھلوں کا صفایا کر دیا۔ اب یہ لوگ
بہت پچھتائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَصْحٰتُكُمْ يَحْبِبْنَ ۚ اِذَا رَاْسُوْا الْبُصْرُ مِنْهَا مُصْبِحٰتٍ
وَلَا يَسْتُوْنَ ۚ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَاعِلُوْنَ ۚ
فَاصْبِرْ لِّكَ اَعْرَاسُهُ ۚ فَنَادٰۤوا مُصْبِحٰتٍ ۚ اَنْ اَعْدُوْا عَلٰى حَرْبِكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۚ فَاَنْطَلَقُوْا وَّهُمْ يَخَافُوْنَ ۚ اَنْ لَا يَدْخُلُوْهُمْ
الْبُيُوتُ عَلَيْهِمْ فَيَسْكُنُوْنَ ۚ وَعَدُوْا عَلٰى حَرْبٍ فَاِدْرَآتٍ ۚ فَلَمَّا
رَاَوْهُمۡ قَالُوْا اِيَّا لَاضَالُوْنَ ۚ بَلْ لَّحُنُّ مَكْرٍ وَمُوْنٌ ۚ قَالِ اَوْسَطُهُمْ
اَلَمۡ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْ لَا تُسَبِّحُوْنَ ۚ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَا اِنْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۚ
فَاقْبَلْ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَتَلٰوُمُوْنَ ۚ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا اِنَّا كُنَّا
ظٰلِمِيْنَ ۚ عَسٰى رَبَّنَا اَنْ يُدْرِكَ لَمَحَنًا مِّمَّا اِنَّا اِلٰى رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ ۚ
كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۚ وَالْعَذَابُ الْاٰخِرُ اَكْثَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۚ

(رعدہ، آیت ۳۲)

”ہم نے ان کو اسی طرح آزمائش میں ڈال رکھا ہے جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا
تھا۔ جب کہ انہوں نے قسم کھائی کہ صبح سویرے ہی میں کر اس کا چل نوڑیں گے۔
ان کا ارادہ تھا کہ ان پھلوں میں سے غریبوں اور محتاجوں کے لئے کچھ بھی نہ الگ کیے۔

اس لئے قرآن لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وقت کے ساتھ سے کل جانے سے پہلے اتفاق کریں۔

قُلْ تَعْبَادُوا الَّذِينَ اصْنُوا بِقُمُو سَعْنُوۃً وَبُفَعُوۡمَتَارَ قُفُّهُمُ سَعْنُوۡ

وَعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاتِي يَوْمٌ لَا تَسْعُ فَنُهُ وَلَا يَخْلُجُوۡهُ (در سیم ۲۱)

"اے نبی میرے جو بندے ایمان لائے ہیں اُن سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور حج کی حجتم

نے ان کو دیا ہے۔ اسی میں سے کھائے چھپے رہے خبر میں خرید کریں۔ قبل اس کے کہ وہ دیکھنے

حس میں نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوست و غازی ہو سکے گی۔"

وَأَنفَعُوا مِّنْ مَّآزَرُفِكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ تَاۡتِيَ اَحَدُكُمْ الْمَوْتُ فَيَقُوۡلُ

لَوْ لَا اٰخَرَتْنِيۡ اِلٰى اٰجَلٍ قَوِيۡمٍ فَاَعْتَذِرُ فَاَنۡسُ مِنَ الصَّٰلِحِيۡنَ ۝

وَلٰكِنْ بُوۡءَاخِرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَاۡءَ اٰجَلُهَا ۝ (الاعاب ۵۰)

"جو کچھ نہ نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرید کر و قتل سے کہہ تم میں سے کسی

کی موت اس کے سر پر آگھڑی ہو تو وہ اس وقت کہ افسوس ملتا ہو ہوئے:

پروردگار مجھے توڑی مدت کے لئے اور بہت دی ہوئی کہ میں کچھ صدقہ ادا کرنا اور نیکو

ہو جانا تو پھر اتنے ایک لمحہ کی بہت بھی نہیں دیتا۔ اور ہرگز نہیں دیتا۔"

وہ انہیں تنگ دل سے بچنے کی تاکید کرتا ہے تاکہ ان کے دل اور دلی محبت انہیں بخل و حرص

میں مبتلا نہ کر دے، کہو کہ مال و اولاد ان کی آزمائش کے لئے ہیں:

اِنۡشَاۡ اَمْوَالُكُمْ وَاَوۡلَادُكُمْ فَبٰسَ ۝ وَ اللّٰهُ عَمِلَہٗ اٰخَرُ عَظِيۡمُ ۝ فَاتَّقُوا

اللّٰهَ مَا لَسَطَعْتُمْ وَاَسْمَعُوا وَاَطِيعُوا وَاَلْفَعُوا اٰخِرًا اِلَّا نَفْسُكُمْ ۝

وَمَنْ يُّؤۡفِ سَخۡ نَفْسُہٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفۡسِدُوۡنَ ۝ (الاعاب ۵۰ تا ۵۱)

"تمہارا مال و اولاد اور تمہاری اولاد و حقیقت سامان آزمائش ہے۔ اور اگر اس

فتنہ میں جینے نہ جاؤ بلکہ صحیح روش پر نہ رہو تو تمہارے لئے اللہ کے پاس حزمہ

ہے۔ پس یہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو و ربان سنو اور طاعت کرو سنو

راہ میں نہ پتہ کرتے رہو کہ اس میں تمہارا ہی وعدہ ہے۔ اور جو اپنے طبیعت کے حرص و

بخل سے بچا رہا وہی حقیقی کامیابی کا منہ دیکھ سکے گا۔"

میں سے پہلے سے وہ علم حاصل کر لیا ہو گا۔ ضرورتی قریب ہی وہ اپنے مجلس میں چلا
 گیا۔ اس کی مجلس آٹھ-دس آدمیوں سے پر ہو کر رہی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ
 اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔
 وہ خود اپنے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔
 اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔
 اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔
 اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔

انفاق کی مدت کا تمام تر مختصر اس پر ہے کہ ضرورت کہاں سے دیکھی ہے؟ وہی ہے جو اس کے
 لئے ضروری ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔
 اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔
 اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔
 اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔ اس کے لئے جو کچھ ہے وہ اس کے لئے ہے۔

وَعَدَةُ اللَّهِ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ
 وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ
 وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ
 وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ
 وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ
 وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ وَالْأَسْرُوحُ

”اور نہ سب سے کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو نہ یک نہ تفرق نہ ہو، اس کے ساتھ
 نیک ہر تفرق نہ ہو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے

پیش آؤ، ورپڑوسی رشتہ داروں سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ن لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو یقیناً جو اللہ کسی ایسے شخص کو محبوب نہیں رکھتا جو پستہ پند رہیں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ جو بخوشی کرتے اور دوسروں کو بخوشی کی بدیت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے نہیں اپنے فضل سے دیا ہے اسے چھپاتے ہیں ایسے کافر نعمت لوگوں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

بَسْئَلُوكَ مَاذَا ابْعَثُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ وَالْيَوْمِ
وَالْآخِرَةِ وَاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالسَّابِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ
بِهِ عَلِيمٌ (البقرہ: ۲۱۵)

”لوگ جو پچھتے ہیں ہم یہ کس پرست کر رہے ہیں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو، اپنے والدین پر رشتہ داروں پر یتیموں اور مسکینوں پر اور مسافروں پر خرچ کرو اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے باخبر ہو گا۔“

اس طرح اس معاملہ میں تمہارا پڑوسی اور ساتھی والدین اور اقرباء کے ساتھ ہی شمار کیے جاتے ہیں۔ اور بچہ یتیم، مساکین اور مسافر بھی ان ہی کے ساتھ آتے ہیں سب برابر ہیں یہاں تک کہ جن لوگوں سے کوئی تکلیف نہ حرکت صادر ہو جائے وہ بھی جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کے عزیز و مستطیع سے ہو گیا تھا۔ مستطیع نے حضرت ابوبکرؓ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت عائشہؓ کے بارے میں جھوٹی تہمت پھیلانے میں حصہ لیا تھا۔ اسلام ایسے لوگوں سے درگزر کرنے کی تلقین کرتا ہے اور اس کو حسن سلوک سے محروم کرنے سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ جب اپنی عزت و آبرو کو بالکل بر بنائے افتراء و بہتان پاہاں ہوتے دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے شدید غصہ کے عالم میں قسم کھائی کہ مستطیع کے ساتھ جو کچھ بھلائی وہ کرتے رہے ہیں اس سے ان کو محروم کر دیں گے تو یہ آیت اتری:

وَلَا يَأْتِيَنَّكُمْ أُولَئِي الْأُولَىٰ وَتِلْكَ الْأُمُورُ
الْمُحْجَرَاتُ عَنْكَ وَاللَّهُ وَابِعِظُوا وَلَا تَصْفَحُوا إِلَّا بِمَنْ حَبِطَ أَنْ
تَعِظُوا اللَّهَ لَكُمْ (التوہ: ۲۲)

”تم میں جس کو گویا کوماں و رفراحتی نصیب ہے ان کے لئے مناسب نہیں کہ قرابت و
مسکینوں و ررہ خد میں بخت کرنے و احوانت نہ کرنے کی قسم کی چیزیں
ان کو پست کرے نوود ررزر کی بالیسی اختیار کریں کیا تم کو یہ نہیں پسند کہ اللہ تعالیٰ
خطائیں بخت دے۔“

اس طور پر تمام انسانی شعور کو اس اعتبار سے ایک بلند سطح پر جایز بناتا ہے جو ہمیشہ
کے لئے انسانیت کے عذو شرف کا باعث ہے و جس پر وہ ماضی حال و مستقبل میں فخر رتی ہے گی۔
جب تک کہ اللہ کو منور ہو۔ چہ وہ خود حسن کے تصور میں بھی بلندی پیدا کرنا ہے و اسے
خود اللہ کے ساتھ احسان قرار دیتا ہے۔ حالانکہ اس بزرگ و برتر کی ذات اس سے کہیں بڑھ
نیک کے اس تصور کی ایک حیوانی تصویر کشی یک حدیث قدسی میں یوں کی گئی ہے:

إِنَّ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ يَقُولُ لَوْ أَنَّ بَنِي آدَمَ مَرَضَ فَنَدَّ
تَعُدُّنِي "فَقُولُوا" يَا رَبِّ يَا رَبِّ كَيْفَ أَعُوذُكَ وَأَنْتَ
رَبُّ الْعَالَمِينَ؟

فَيَقُولُ اللَّهُ "أَمَّا عَسَى أَنْ عَبْدِي فَلَانٌ مَرِضٌ فَلَمْ تَعُدَّهُ؟
أَمَّا أَنْتَ لَوْ عُدَّتَهُ لَوْ جَدْتَنِي عِنْدَهُ۔

يَا ابْنَ آدَمَ! اسْتَطَعْتَكُ فَلَمْ تَطْعَمَنِي۔

فَيَقُولُ يَا رَبِّ كَيْفَ اطْعَمْتُكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟

فَيَقُولُ اللَّهُ "أَمَّا عَسَى أَنْ عَبْدِي فَلَانٌ اسْتَطَعْتُكَ فَلَمْ

تَطْعَمَهُ؟" أَمَّا أَنْتَ لَوْ اطْعَمْتَهُ لَوْ جَدْتَنِي دَائِمًا عَبْدِي۔

يَا ابْنَ آدَمَ! اسْتَسْقَيْتَكَ فَلَمْ تَسْقِنِي۔

فَيَقُولُ يَا رَبِّ كَيْفَ اسْقَيْتَكَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِينَ؟

فَيَقُولُ اسْتَسْقَيْتَكَ عَبْدِي فَلَانٌ فَلَمْ تَسْقِنِي" أَمَّا أَنْتَ

لَوْ سَقَيْتَهُ لَوْ جَدْتَنِي دَائِمًا عَبْدِي۔ (مسلم)

”خداوند عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا: اے ابن آدم! میں بیمار پڑا

تو تو میری عبادت کو نہ آیا؟ ابن آدم جواب دے گا:

”پروردگار! میں تیری عبادت کیسے کرتا۔ جب کہ تو سارے جہانوں کا آقا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو تو اس کی عبادت کو نہ کیا۔ اگر تو اس کی عبادت کو کیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔“

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا کھلانے کو کہا تو تو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا۔“

وہ کہے گا: ”پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھاتا جب کہ تو خود ہی سارے جہانوں کا مالک ٹھہرا۔“

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کو مانگا تو تو نے اُسے نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اُسے کھانا کھلادیا ہوتا تو اس کھانے کو میرے پاس پالیتا۔“

دبھرا اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی پلانے کو کہا تو تو نے مجھے پانی نہ پلایا۔“

وہ کہے گا: ”پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاتا جب کہ تو سارے جہانوں کا رب ہے؟“

اس پر ارشاد ہو گا: ”میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی پلانے کی درخواست کی تھی تو تو نے اُسے پانی نہیں پلایا تھا۔ اگر تو نے اُسے پلایا ہوتا تو اس پانی کو میرے پاس پالیتا۔“

صدقہ کے لئے اس نے ایسے آداب مقرر کئے ہیں کہ وہ صاحب مال کی طرف سے غر پر نفوق و برتری کا اظہار نہیں بننے پانا۔ چہرہ ہی آداب اُسے غیر پاکیرہ احساسات کے ساتھ کہنے جانے والے ریاکارانہ صدقہ کی شکل اختیار کرنے سے بھی بچاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صدقہ کے محرکات پست اور ذلیل ہوں اور جو صدقہ قبول کرے اس پر احسان جنمایا جائے تو

صدقہ دینا ایک ذہیل کام ہے جتنا ہے خود میں خود کی طبیعت اور اس کے اصدق پر برے اثرات پڑتے ہیں اور اس طرح سماج کے دوسرے فرد و فرد کے مابین تعلقات پر بھی اس طرح کے صدقہ سے بڑے اثرات پڑتے ہیں۔ انسانی طبیعت کے لئے احسان متانے سے بڑے اثرات گزرنے والی تلخ نرسوئیں اور قبول احسان سے روکنے والی دوسری کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح اخلاقی اعتبار سے بھی یہ کار نامہ صدقہ سے زیادہ بڑا ہوا کوئی فعل نہیں، نہ کوئی دوسری، نہ خیر کے لئے اس سے زیادہ تباہ کن اور مضر۔ اس پر دیکھو و بھونکو و دیکھو و بھونکو کی طبیعت میں غلو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی سے بڑی فکر ہے:

مَثَلُ الَّذِينَ يُبْغُونَ مَوَالِيَهُمْ فِي سُلْطَانٍ مَدْرَسَةٍ حَتَّىٰ تَبْتَاعُوا بِهَا
 سَلَامًا فِي كُنْهُنَّ أُولَٰئِكَ خَمَلُوا بِأَنفُسِهِمْ لِبُحْبُوَّةٍ لِّأَنفُسِهِمْ فَطَعَنُوا
 فِي سُلْطَانٍ مَدْرَسَةٍ حَتَّىٰ تَبْتَاعُوا بِهَا سَلَامًا ۚ
 وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۚ الَّذِينَ يُبْغُونَ مَوَالِيَهُمْ فِي سُلْطَانٍ
 لَهُ لَا يُبْغُونَ مَوَالِيَهُمْ مَتَىٰ وَلَا أَدَىٰ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
 رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ
 وَمَغْفِرَةٌ ۚ خَرُجْ مِنْ عِنْدِ قَدِ تَبْتَاعُوا أَدَىٰ ۚ وَاللَّهُ عَنِ خَلْقِهِ
 بَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْغُوا قَدِ تَبْتَاعُوا بِمَنْ وَآلِهِ ۚ
 كَالَّذِي يُفْعَلُ مَالُهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
 الْآخِرِ ۚ فَمَثَلُهُ مَثَلُ صَفْوَابٍ عِنْدَ نَرَاتٍ قَدِ تَبْتَاعُوا بِهَا
 صَلَاحًا لَا تَقْدِرُونَ عَلَىٰ سَنِيٍّ مَتَىٰ تَبْتَاعُوا ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي
 الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۚ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُبْغُونَ مَوَالِيَهُمْ اسْتِغَاءَ
 مَرَضَابِ اللَّهِ وَبَنِيَانٍ مِّنَ أَنْفُسِهِمْ مَثَلُ حَتَّىٰ تَرَوْهُ ۚ أَصَابَهَا
 وَابِلٌ فَأَتَتْ أَكْطَمًا ضَعْفَيْنِ ۚ فَإِنْ لَّمْ يُبْصِرْهَا وَابِلٌ فَظُلٌّ
 وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۚ أَبَوْذُ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ
 حَبْنَةٌ مِّنْ حَبْلٍ وَأَعْنَابٌ بِحَرِيٍّ مِّنْ حَبْنَةٍ إِلَّا نَهْرُهُ فِيهَا
 مِّنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا

اَعْصَارُ فَنَدَّ نَارًا فَاحْتَرَقَتْ ۚ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰلَاٰتِہٖ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ (البقرہ: ۲۶۱-۲۶۶)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے پھر حسان نہیں جتاتے نہ دُکھ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لئے کسی رنج و خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دُکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بڑبڑا رہی اس کی صفت ہے۔ اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو دُکھ دے کر اور احسان جتا کر اس شخص کی طرف خاک میں نہ مل دو جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اس کے خرچہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی، بس پر مٹی کی نہ جی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کھاتے ہیں اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔ اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دلوں کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچہ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دو گنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہو جائے تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہر باغ ہو، نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا، اور وہ عین اس وقت ایک نیز گرم بگولے کی زد میں آکر تجلیں

جائے جب کہ وہ خود موڑا سو اور اس کے کہ سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں، اس طرح

”لنہ پنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرے، شاید کہ غور و فکر کرو۔“

اسی لئے صدقہ میں اخفاء سے کام لے کر پوشیدہ طور پر ناداروں تک بھی دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے تاکہ ایک طرف تو ان کی عزت و تہ و سدا مت رہے، دوسری طرف یہ خود بے جا گھمٹ و فخر سے بچے رہیں:

”إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنُعَبِّأْ بِهَا ۖ وَإِنْ تُكْمُوهَا وَتُؤْتُوهَا غُيُورًا
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ“ (سورۃ البقرہ ۲۷۱)

”اگر اپنے صدقات غدا پر دوڑا رہے ہیں تو چھپ کر دینا بہتر ہے، لیکن اگر چھپ کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا ذکر فرمایا ہے کہ سنا کہ آپ نے سے صدقہ دیا تو کہا: ”چھپا کر دیا کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ ہو کہ کد میں ہاتھ سے کیا دیا،“ ”تَصَدَّقْ بِصَدَقَةٍ جَعَلَهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ سَمَاعُكَ مَا نَفَعَكَ بِهَا“ نیکی کے معاملہ میں خفا سے کام لیتے اور سے نام نہ نہ ہو اور فخر و عور سے بچتے ہوئے خاصۃً اللہ کرنے کی یہ کنہی حسین و رکامیب تصور ہے۔

اسلام حب ذات و رخصت مالت کی بنیادی عقیدوں کا مجتہد تھا رکھتا ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ حرص و بخلات نفس انسانی میں بہر حال موجود رہنے والی چیزیں ہیں، ان سے منع نہیں۔

”وَأَخْصِرْ إِلَى نَفْسِ السَّعَةِ (البقرہ ۱۲۸)“

”نفس بخل واقع ہوا ہے۔“

چنانچہ وہ ترغیب دل کر اور ابھار کر خطرات سے خبردار کر کے اور ڈرا کر اور پھر اعلیٰ نمونوں اور بلند تصورات کی تصویریں سامنے لکرا کر نفس بہ طرح سے کوشش کر کے ان چیزوں کا انصاف طور پر علاج کرتا ہے اور بالآخر اپنا مطلب حاصل کر ہی لیتا ہے، چنانچہ وہ اسی کجوس طبیعت سے یہ مطالبہ بھی کر دیتا ہے کہ وہ چیزیں راہ خدا میں نکلے جو اس کو محبوب ہوں اور جن کی جدائی اس پر شاق ہو:

”لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ“ (آل عمران ۹۲)

”تم نیکی کا مقام برگزینہ پاؤ گے جب تک کہ اپنی محبوب چیزوں کا حصہ خرچ نہ کر دو۔“

چنانچہ نفس انسانی بیک کہتا ہے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اس طرح وہ فیاضی کے درجہ کمال پر جا پہنچتا ہے اور گہرے شعور کے ساتھ کی جانے والی پاکیزہ دادرش میں اتنے آگے بڑھ جاتا ہے جتنا آگے بڑھنا عموماً بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان اپنے نفس سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ بلندی اور طلب علو کا جذبہ ضرورت کے احساس پر اور ضمیر کے نقد غنی طبیعت کے تقاضوں پر غائب آتے ہیں۔ یہ اپنی جگہ پر خود یک بلند انسانی مقصد ہے جس کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔ یہ توازن پیدا کرنے، ناداری کا مقابلہ کرنے اور محروم و مستطیع کے درمیان تعاون اور کفالت باہمی کا اصول زیر عمل لانے کے لئے ہمارا اجتماعی ہدف ہے اور اور اسی طرحت ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

یہ پالیسی جس کا ایک نمونہ ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ سامنے رکھا ہے، اسلام نے تمام معاملات زندگی میں اختیار کی ہے جس چیز کو قانوناً لازمی قرار دیتا ہے اس پر وجدان کو مطیع کرنے کا اہتمام بھی رکھا ہے۔ وہ قانونی طور پر اتنا ہی لازم کرتا ہے جتنا معاشرہ کی سلامتی کے لئے ناگزیر ہو۔ اور لوگوں میں جو قوت و تحمل عام طور پر پائی جاتی ہے وہ اس کا بار آسانی سے اٹھا سکے گا۔ وجدان کو مخاطب کرتا ہے تاکہ وہ اس قانونی حد پر مطمئن ہو جائے اور اس سے آگے جس قدر بھی جا سکے، جانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کا مقصد انسانی زندگی کو بلند سے بلند تر بنانا اور مسلسل نئی بلندیوں کی طرف سہ گرم سفر رکھنا ہے۔ اسلام کم سے کم پابندیوں کی لازمی حد اور بلند تر پسندیدہ حد کے درمیان کافی فاصلہ جوڑ دیتا ہے تاکہ اسی میں مختلف افراد اور مختلف نسلیں ہر زمانہ میں باہم مسابقت کرتی رہیں۔

اسلام نے اجتماعی عدل کے قیام میں یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔ آئندہ دو ابواب میں ہم نے سیاسی پالیسی اور اقتصادی پالیسی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آئے گی کہ اسلام ہمیشہ اپنے طریق کار کے ان ہی دو بنیادی اصولوں پر اعتماد کرتا ہے۔ قانون سازی اور ترغیب و تلقین ان ہی دو طریقوں سے کام لے کر وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اجتماعی عدل قائم کرتا ہے۔ اسلام کے اولین دور و عروج میں اس طریقہ نے اپنا پورا پورا فائدہ پہنچایا اور گزشتہ چودہ صدیوں میں کتنے ہی ایسے ادوار گزرے ہیں

جن میں سے سے برکات سے اور اب بھی میں کہ بدرجہ عظمت موجود ہے کہ حال و سنی میں
 بھروسے وہی فیض رسائی و رتی کر دے۔ مگر یہ سب اُسی وقت ہوگا جب اُسے ٹھیک ٹھیک سمجھ جائے، یعنی
 رُخ پر عیدِ جناح اور سب لوگ خود بھی اس کی سیدھی راہ پر چل پڑیں۔

باب پنجم

اسلام میں نظامِ حکومت

اسلام میں نظام حکومت

اسلام میں عدل اجتماعی پر گفتگو طرز حکومت پر گفتگو کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس عدل کے مزاج کے بارے میں اوپر جو اصول بیان کئے گئے ہیں ان کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اسلام کا تعلق زندگی کے ہر پہلو اور ہر طرح کے اعمال سے ہے۔ یہ نظام روحانی اور مادی دونوں طرح کی قدروں پر حاوی ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر بھی یہ ضروری ہے کہ اسلامی سیاست کے مزاج پر روشنی ڈالی جائے کیونکہ طرز حکومت ان اقدار سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ مزید برآں قانون کو نافذ کرنے، معاشرہ کی مختلف پہلوؤں سے نگرانی کرنے، اس میں عدل و توازن برقرار رکھنے اور اسلامی اصولوں کے مطابق دولت کی تقسیم عمل میں لانے کا کام بھی بالآخر نظام حکومت ہی کے ذمہ کیا گیا ہے۔

اسلامی نظام حکومت پر کافی تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے اور یہ کام علیحدہ سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں اس موضوع سے صرف اسی حد تک تعرض کیا جائے گا جس حد تک کہ اجتماعی عدل کے سلسلہ میں ناگزیر ہے۔ حتی الامکان ہم بحث تو ان ہی امور تک محدود رکھیں گے جو اجتماعی عدل سے براہ راست متعلق ہیں۔ اسلام کے مطالعہ میں اکثر ایک دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے تمام پہلو ایک دوسرے سے مربوط و بڑی حد تک ایک دوسرے پر منحصر نظر آتے ہیں۔ یہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوتے کیونکہ یہ دین پورا کا پورا ایک کائی ہے، عبادات و معاملات، حکومتی پالیسی اور مالی پالیسی، قوانین و ہدایات، عقیدہ و عمل، دنیا و آخرت، سب کے سب ایک مکمل اور جامع نظام کے باہم مربوط و منظم اجزاء ہیں۔ ان میں سے کسی ایک جز پر الگ سے گفتگو اس وقت تک بہت مشکل ہے جب تک کہ دوسرے اجزاء سے بھی تعرض نہ کیا جائے۔ بہر حال ہم اپنی حد تک طرز حکومت پر گفتگو کی کوشش کرتے ہیں

اسلامی نظام پر لکھتے وقت غرض مل قدخوہ وہ سدھ کے احادی نظام پر لکھتے ہوئے حکومت
نظام اور اس کے ڈھانچہ پر سدھ دور سے نظاموں کے درمیان کچھ مشابہت دکھانے یا حلقہ ثابت
کرنے کی کوشش کرنے میں جس سے نسبت دور قدیم، غلبہ جدید میں سدھ سے قبل یا اس کے بعد تیار
رہی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ سدھ اور کسی دوسرے سے بڑے پرانے نظام کے درمیان کوئی
رسم، رے کے وہ سدھ کے حق میں کوئی بڑی قوی سند فہم کر دینے ہیں۔

یہ کوشش دراصل دراصل میں مغربی نظاموں کے سامنے احادی میں شکست کی علامت ہے۔ ان نظاموں
سے مشابہت ثابت ہوجانے کی وجہ سے سدھ کی عزت میں فرقہ برابر جی، اضافہ نہیں ہوتا اور نہ اس میں
سکے کی شکل میں اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ اسلام انسانیت کے لیے نظام کامل کا نمونہ پیش کرتا ہے۔
جس کی نظیر آپ کو کسی دوسرے نظام میں جس سے دنیا سدھ سے پہلے یا اس کے بعد متعارف ہوئی ہو
نہیں مل سکتی۔ سدھ کے کبھی بھی کسی دوسرے نظام کی تقلید کرنے یا اس سے ہی مشابہت منانے کی
کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس اس نے ایک علیحدہ اور اچھوتی راہ اختیار کی ہے اور انسانیت کی تمام
مشکلات کے حل کے لیے ایک مکمل علاج پیش کیا۔

انسانی نظاموں کے ادنیٰ بدل میں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ کبھی وہ سدھ سے آئے اور کبھی جدا
ہو گئے، لیکن خود اسلام اپنی جگہ پر ایک مکمل اور مستقل نظام ہے جسے ان دوسرے نظاموں سے کوئی
واسطہ نہیں، نہ تو اس وقت جب کہ وہ اس کے ساتھ چلیں اور نہ اس وقت جب وہ اس سے الگ راہ اختیار کر
لیں۔ یہ بلٹا یا بٹھا رہنا اور اصل محض عارضی ہو سکتا ہے اور وہ بھی ترقی، غور، نظام سے کہ خبریات اور عارضی امور
انفاق یا اختلاف کو کوئی اہمیت نہیں حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں عتد و صرف مبادی فکر اور مخصوص فلسفہ پر ہی
کیا جاسکتا ہے۔ اسلام اپنا مخصوص فلسفہ اور اپنا غیہ فکر ساسی رکھتا ہے۔ اس پر اس کی جزئیات منفع
ہوتی ہیں بہر حال اختلاف جو یا اتفاق اسلام اپنی مخصوص جداگانہ راہ پر چلتا رہتا ہے۔

اسلامی نظام کا مبادی اصول دوسرے انسانی نظاموں کے بنیادی اصولوں سے یکسر مختلف ہے۔
اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور وہی شریعت وضع کر سکتا ہے۔ دوسرے مل کے
نظام اس اصول پر ہی ہیں کہ حاکمیت انسان کی ہے اور وہ اپنے لیے تشریعت وضع کرنے کا مجاز ہے۔ یہ دونوں
اصول ایک دوسرے سے کبھی نہیں مل سکتے۔ اسی وجہ سے اسلامی نظام کسی دوسرے نظام سے میل نہیں کھاتا۔

اور یہ کسی طرح جائز نہیں کہ اس کو اسلام کے سوا کسی دوسری صفت سے منصف کیا جائے۔

اسلامی محقق کا کام یہ نہیں کہ جب اسلام میں نظام حکومت پر گفتگو کرے تو کسی جدید یا قدیم نظام سے مماثلت یا تفاق کے پہلو تلاش کرے۔ کیونکہ یہ موافقت اور مماثلت نہ صرف یہ کہ سطحی اور جزئی ہوتی ہے اور بنیادی فکر و تصور میں نہیں بلکہ جزئیات میں اتناقی تو رد کا نتیجہ ہوتی ہے اور اسلام کی قوت میں بھی کوئی اضافہ نہیں کرتی۔ جیسا کہ بعض شکست خوردہ لوگوں کا خیال ہے۔ ان کے بے صیغہ طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے دین کی بنیادوں کو پیش کریں اور اس بات پر پختہ یقین کے ساتھ پیش کریں کہ یہ بنیادیں اپنی جگہ پر خود ہی مکمل ہیں خواہ یہ دوسرے تمام نظاموں کے مخالف پڑیں یا موافق۔ رہا اسلامی نظام اور دوسرے نظاموں کے درمیان مشابہت اور موافقت کے نقطے تلاش کر کے اسلام کی تائید کرنے کی کوشش کرنا تو جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں یہ احساس شکست ہے جس کو کوئی مسلمان محقق جو اس دین کو واقعی سمجھ چکا ہو اور جس گفتگو کا پورا پورا حق ادا کرتے ہوئے اظہار خیال کرنا چاہتا ہو، اپنا شعار نہیں ٹھہرا سکتا۔

دنیا اپنے آغاز میں اور بعد کے مختلف ادوار میں بہت سے نظاموں سے آشناء چکی ہے۔ اسلامی نظام نہ تو ان میں کا ایک نظام ہے، نہ ان کا کوئی مرکب اور مخلوط ہے اور نہ ہی ان سب سے فائدہ اٹھانے والے مرتب کیا گیا ہے۔ وہ ایک مستقل بالذات نظام ہے جو اپنا گنگ فکر و رہنما علیحدہ ذریعہ و وسائل رکھتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اُسے اس کی سی مستقل بالذات حیثیت میں پیش کریں۔ کیونکہ اُس نے دوسروں سے آزاد اور گنگ رہ کر ہی نشوونما پایا ہے اور اُس سے انجی۔ وہ ہمیشہ دوسروں سے گنگ ہی رکھی ہے۔

اسی وجہ سے میں ڈاکٹر ہیکل کے عام اسلامی کوہ سامراج سے تعبیر کرنے کو ورنہ اس کو تو کوہ اسلام سامراجی ہے۔ درست نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ اسلام کی حقیقی روح کے فہم سے اس سے زیادہ دور اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ سے سامراجی قرار دیا جائے۔ چاہے ہم اسلامی سامراج اور سامراج کے معروف مفہوم کے درمیان فرق واضح کرنے میں کتنا ہی زور کیوں نہ صرف کریں۔ اور اسی طرح دنیائے اسلام کے مختلف ملک کے باہمی تعلقات کو اسلامی سامراج سے تعبیر کرنا ان تعلقات کے حقیقی فہم سے بہت دور ہے۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مصر کے ایک مشہور صاحب قلم اور سیاسی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں، ی کرم و در صدائے رسدین کی شہر

ہر اس کی کتابیں علمی حلقوں سے خارج محض حاصل کر چکی ہیں۔ (مترجم)

اس سے زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہیکل حیاتِ محمدیہ یا صدیق ابوبکرؓ اور انصارِ روقِ عربیہ میں اسلامی طرزِ حکومت پر گفتگو کرتے وقت اس حقیقی داخلِ اختلاف اور تضاد کو تو محسوس کرتے ہیں جو اسلام اور دوسرے نظاموں کے مزاج میں ہے جن سے دنیا کو ساقط پڑتا رہا ہے۔ لیکن کچھ تو ان غیر اسلامی مظاہر سے متاثر ہو کر جو حجِ سلام سے وابستہ آئے ہیں اور کچھ اسلام اور امپریلزم میں بعض مظاہر کی حد تک مشابہت کی وجہ سے ان دونوں خبیروں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غلو سے حد تک کی حکمرانی پر مبنی نظام اور انسان کی حاکمیت پر مبنی ایک دوسرے نظام کے درمیان بنیادی فرق کو ملحوظ نہیں کیا گیا۔ شاید اس منشا بہت کاسب سے نمایاں منظرِ عالمِ اسلامی کا مختلف قوموں اور تمدنوں پر مشتمل ممالک سے مل کر بنا ہونا اور ان سب کے حکومتی نظام کا ایک ہی مرکز سے متعلق ہونا ہے۔ سامراج کی ظاہری شکل بھی یہی ہے۔ مگر یہ محض ظاہری شکل ہے۔ اس مسئلہ میں فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ یہ مرکز ان مختلف ممالک کو کس نقطہ سے دیکھتا ہے؟ اور یہ کہ ان ممالک کے مابین تعلق کی اصل نوعیت کیا ہے؟

اسلام کی روئے ور حکومت کے باب میں اس کی پیمیں کی تحقیق کر کے دیکھنا طالبِ علمِ مطلق طور پر ہی قائم کرنا ہے کہ معروف سامراجی نظریوں سے بہت دور بہت ہی دور واقع ہو ہے۔ سامراج کے تمام حقوق میں بسے واسطہ مسلمانوں کو برسرِ فرقہ وارانہ ہے۔ وہ قومی و روحی غصہ بنوں کو غوتاتا ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم و بردکھتے ہیں بس وفات وہ دی و سببت کو بھی کوئی بہت شبہ دینا ورتے کہ نہ نہ زبردت ہے سی سپرٹس کف وہ مختلف ممالک کو و مسخرات (conquer) قرار دیتا ہے نہ نہیں مستحقاً ہے جا کا ہدف مانتا ہے۔ وہ نہیں ان چیزوں کی حشبت نہیں دیتا جو بس ایک مرکز کے فائدے کی راہ میں ہمارے طرف سے سب کچھ قربانی میں لے دیں دیتے ہوں۔ ہر ملک عام اسلامی کے جسم کا ایک عضو ہے۔ اس کے بسنے والوں و بھی وہ سارے حقوق حاصل ہیں۔ اگر کسی ملک کا نظم دینے کے سامنے مرکز کی طرف سے مقرر کردہ ایک وائی کے ماتحت میں تقاضے یہ عہدہ ایک ہے ہمارے مسلمان کی حیثیت میں ملحق جو مسند و بیت کا ہیں، اگیا۔ اگر ایک ایسی میٹ خام کی حیثیت سے۔ فیقت اپنی جگہ برتے کہ ان مغلوں ممالک میں سے ان کے نظریہ کے باشندوں میں سے کسی کے ماتحت میں تھا اور بھی اس فرد کے منصب حکمرانی کے لیے موزوں ہونے کی حیثیت سے ممانہ و ہاں کا باشندہ ہونے کی وجہ سے۔ ان ممالک سے جو حاصل جمع ہوتے تھے وہ پہلے وہیں کی ضرورت پر خرچ کیے جاتے تھے۔ اگر اس میں سے کچھ بچ رہتا تو وہ مرکزی میٹ امان میں بھیج دیا جاتا تا کہ بوقتِ ضرورت

تمام مسلمانوں پر خرچ کیا جاسکے، نہ اس لیے کہ اُسے مرکز اسلامی کا خصوصی حصہ قرار دے دیا جائے،
نہ دوسرے ممالک اُس کے بُری طرح محتاج ہوں۔ جیسا کہ آج کی سامراجی سلطنتوں میں علا ہوتا ہے۔

یہ باتیں عام اسلامی، یا زیادہ موزوں الفاظ میں اُمت اسلامیہ اور امپریلیزم کے درمیان بہت
بڑا بعد پیدا کرتی ہیں۔ اور یہ بات کہ اسلام سامراجی Imperialist ہے، اسلام کی رُوح اور
اُس کی تاریخ دونوں پر بڑی زیادتی ہے۔ یہ سائے ایک اجنبی اصطلاح کو زبردستی اسلام کے سر تھوپنے کے سوا
اور کچھ نہیں۔ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ اسلام اپنے عین مزاج کے اعتبار سے انسانی ہے کیونکہ وحدتِ انسا
کا نظریہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے یہاں موجود ہے اور اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر وہ ساری
انسانیت کو برابر اور بھائی بھائی بنا کر اپنے پرچم تلے جمع کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر طحسین نے اپنی کتاب الفتنہ نکبری۔ عثمان میں سدھی نظام حکومت کا دوسرے نظاما
حکومت سے موازنہ کرتے وقت جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس سے زیادہ دقت نظر پر مبنی ہے۔ چنانچہ ان کی رائے
میں اسلام اپنے اصل مزاج کے اعتبار سے دوسرے تمام نظاموں سے مختلف ہے۔ درحقیقت نظام حکومت
کے جزئیات اور خارجی مظاہر نہیں بلکہ اسلام کی رُوح اور اُس کے مزاج کے گہرے مطالعہ سے جو حقیقت معلوم
ہوتی ہے۔ وہ یہی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر طحسین نے اس بات کو ایک اور ہی نتیجہ اخذ کرنے کی بنیاد بنایا ہے اور وہ
یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد شیخین کے زمانہ میں اسلام جس صورت میں عملاً قائم ہوا وہ ایک
نادر الہام وقوع تھا جس پر انسانیت زیادہ عرصہ تک ثابت قدم نہیں رہ سکی۔ یہ بعینہ وہی راگ ہے جسے مسر
اور اسلامی ممالک میں ان کے شاگرد لاپتے سہتے ہیں اور جس کی بنا پر وہ یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام اس ریلے
میں عملاً قائم نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح میں ان حضرات کے طرزِ تحریر کو بھی مناسب نہیں سمجھتا جو اسلامی سوشلزم یا اسلامی
جمہوریت پر لکھتے ہیں۔ یا اسی طرح اللہ سبحانہ کے بنائے ہوئے نظام اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں
میں جوڑ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان انسانی نظاموں پر بشریت کی چھاپ ہے، اور نقص و کمال خطا و صواب
ضعف و قوت، اتباع خواہش یا حق پرستی کے باب میں انسان جن خصوصیات کا حامل ہے وہ ان نظاموں میں
جھلکتی ہیں جب کہ الہی نظام ان خامیوں سے پاک ہے۔ یہ ایک مکمل اور جامع نظام ہے جس میں آگے پیچھے کسی طرف
سے باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

”ہم نے آپ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔“

رَسُولَ اللَّهِ وَحَاثَمَ السَّيِّئِينَ (الاحزاب: ۵۴)

”اللہ کے رسول اور انبیاء کے خاتمہ۔“

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ وَعْدِي لَكُمْ بِالسَّلَامِ
دِينًا رَامَاؤُهُ (۳۱)

”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر لازم کر دی
ہے اور تمہارے لیے سلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کرنا ہے۔“

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّذِي هِيَ أَخْلَوْا بِهِ (دینی سرس ۹)

”درحقیقت یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔“

اپنے سلامی مفہوم کے اعتبار سے ”دین“ جدید اصطلاح ”نظام“ کے مترادف ہے، بہت اچانک کے

مفہوم میں غمخیز ہیں۔ شیخ عقیلہ، ”زندگی میں انسان کا رویہ اور حلقہ درست ہیں قوت کا بھی تضاد

ضروری ہے۔ کیونکہ یہ تیسری بھی اسلام میں ”دین“ کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس لئے کوئی بھی نہ اس وقت

تک اللہ کے نزدیک قابل قبول اور سہل کے نزدیک درست سمجھتا رہا کہ اس کا جب تک کہ وہ اسلام کے

عقائدی تصور پر نہ مبنی ہو ورنہ صرف ساری دنیا کی بددعویٰ اور غلط فہمی کا حصول

نہ اپنا تا ہو۔ ان باتوں سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس عام کے پورے والے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت اور آوہن

کے آگے تسلیم خم کیجئے ہوں اور خود اپنے بیوقوف خون ساری اور نہ ساری کی وضع کرنے کے اختیار کے

دعوے دار نہ ہوں، کیونکہ اسلام میں یہ حق صرف خدا کے لئے مخصوص ہے یہی بات، سلامی نظام کو نہ نام

دوسرے نظاموں سے نبی دی طور پر مختلف و رحمت کر دیتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود اسلام دوسروں کو اس کے بنائے پر مجبور نہیں کرتا:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرة ۲۵۶)

”دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے، جہاں بات غلط خیالات سے الگ چھٹا

کر رکھ دی گئی ہے۔“

بلکہ ان کو اپنے شعائر دینی پر عمل کی پوری آزادی دیتا ہے۔ اس آزادی کے پاس ولحاظ کی

کی عملی تطبیق کا کام زمانہ کی تبدیلیوں اور نئے موضوعات کے نمودار ہونے پر چھوڑ دیا ہے۔

طرز حکومت میں بھی جس کی ایک خاص انداز سے وضاحت ہمارے اس باب کا اصل موضوع ہے کئی قوتوں کی طرف توجہ اور جزئیات سے بے اعتنائی کی یہ صفت پوری طرح موجود ہے۔

اسلام میں نظریہ حکمرانی کی بنیاد اس بات کی گواہی اور اعلان پر ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے اس شہادت کے ذریعہ جب یہ بات طے ہو گئی کہ اللہ کی اویہیت صرف خدا کے لیے مخصوص ہے تو اسی سے یہ بات طے پا گئی کہ انسانی زندگی میں حکمرانی صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ انسانی زندگی میں یہ حکمرانی ایک طرف تو اپنی مشیت اور تقدیر کے ذریعہ معاملات زندگی کی تدبیر فرما کر کرتے ہیں اور دوسری طرف انسانوں کے باہمی تعلقات و روابط ان کے حقوق اور ذمہ داریوں اور ان کے طور پر حقوق کی مخصوص تشہیم کے لیے ایک ضابطہ حیات اور شریعت عطا فرما کر کرتے ہیں۔ اسلامی نظام میں اللہ ہی نہ کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا نہ اس کی مشیت و تقدیر میں نہ اس کے دیئے ہوئے ضابطہ حیات اور شہادت میں اگر ایسا ہو تو شرک و کفر ہو گا۔ اس اصول کی بنیاد پر انسان بطور خود نظام حکومت اور دستور و قانون وضع کرنے کا کام نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ کی اویہیت کا انکار کر کے اویہیت کی مخصوص صفات کے خود اپنے اندر ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے اور یہی صریح کفر ہے۔ اس قاعدہ کی رو سے اسلامی نظام حکومت بنیادی طور پر انسانوں کے بنائے ہوئے سارے نظاموں سے مختلف ہے۔ خواہ یہ نظام صرف حکومت کے لیے وضع کیے گئے ہوں یا پوری انسانی زندگی کے لیے یہی وجہ ہے کہ نام اور مصلحت کی حد تک بھی اسلام اور دوسرے انسانی نظاموں کا حوڑ لگانا نامناسب اور غلط ہو گا۔

ذات و حد کی حُسن اور حاکمیت تسلیم کرنے کے بعد اسلام میں نظام حکومت حُکام کی جانب سے عدل محاکمین کی جانب سے خُدا و حاکم و محکوم کے، بنی تئوری پر مبنی ہے یہی وہ موئے موئے بنیادی اصول ہیں جن پر بقیہ سارے اصول و ضوابط مستفاد ہوتے ہیں جن کا مزاج مذکورہ بالا اصل اصول نے متعین کر دیا ہے۔

۱۔ حُکام کی جانب سے عدل

إِنَّ اللَّهَ بِأَعْيُنِهِ يَتْلُو صُحُفَهُ

”اللہ تم کو عدل کا روئے صبار کرے گا مگر دن ہے۔“

وَإِذَا حُكِمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ

”جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔“

وَإِذَا قُلْتُمْ لِلنَّاسِ أَنْ يَتَّقُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ

”جب بات کہو انسانوں کو جو ان کو یاد دلائی ہو۔“

وَلَا تَجْرِمُنْكَ سَمَاتُ مُؤْمِرٍ عَلَى أَنْ تَعْلَمَ نَوَاءُ الْعَذَابِ ۚ

والمائدہ ۸

”کسی گروہ کی دشمنی تم کو نہ منسلک کر دے۔ نصاف سے بھر جاؤ۔ عدل کرو۔“

خدا ترسی سے زیادہ مناسب رکھتا ہے:

إِنَّ أَحَبَّ النَّاسِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى الَّذِينَ هُمْ أَكْثَرُ عَدْلٍ ۚ

”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ

عدل والے لوگ ہیں۔“

یہ عدل مطلق کی تہی تر از دست کہ شخص و ثبوت اس کی ڈیڈی نہیں کر سکتے اور نہ دوستی و دشمنی

اس کے قواعد و ضوابط کو بدل سکتے ہیں۔ وہ عدل ہے جو فرد کی، ملی قوت یا قوموں کے باہمی فتنے

عناد کسی سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اس سے ملت و قوم کے مابین ہر قسم کا سبب ہوتے ہیں۔ یہ وہ

سبب کا فتنہ ہے جو دنیا و مافیہا میں رہتا ہے۔ اس سے دوسری قومیں بھی اس سے مستفید

ہوتی ہیں چاہے ان کے درمیان عداوت و دشمنی ہی کیوں نہ ہو۔

یہ عدل کے باب میں وہ بلند چوٹی ہے کہ کوئی بہن، قومی قانون اُست چھو سکا۔ ملکی و قومی

استدلال کا کوئی قانون اس کے قریب ہی نہ پہنچ سکا۔

جن لوگوں کو اس حیثیت کے تسلیم کرے میں قابل ہو انہیں چاہیے کہ آج قوموں میں طاقتور و

مکروہ گروہوں کے درمیان جو سیاست چلتی ہے اس کا مطالعہ کریں اور اسی طرح باہم جنگ و پیکار میں مصروف

اقوام کے باہمی تعلقات کا جائزہ لیں یہی نہیں بلکہ ان کو اس ”عدل“ کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے جو امریکہ میں

سفید، قوامِ سُرخ اور سیاہ قوموں کے ساتھ برتنی ہیں اور جسے جنوبی افریقہ میں سفید نسل کے لوگ رنگین نسلوں کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں دیکھنا چاہیے کہ کیونسٹ، بت پرست اور صلیبی اقوام روس، چین، یوگوسلاویہ، ہندوستان اور حبشہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہیں۔ اس باب میں اشارہ کافی ہے کہ چونکہ یہ اس زمانہ کے حالات ہیں جنہیں ہر آدمی جانتا ہے۔

اسلامی عدل کے سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ مجرد نظریات تک محدود نہ رہا بلکہ علیٰ زندگی میں بھی اس سے غور کیا اور دفعہ تاریخ اس کی پے در پے مثالوں اور نمونوں سے ہر پڑا ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلاً آگے مناسب موقع پر آئیں گی یہاں ہماری کوشش یہ ہے کہ اسلامی اصول و نظریات کو مخصوص کی روشنی میں واضح کر دیں۔

۲۔ محکومین کی طرف سے اطاعت

بَا أَتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

(سہ، ۵۰)

”اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں“

آیت میں اللہ، رسولؐ اور اولی الامر کو ایک ساتھ جمع کرنا اس طاعت کی حدود اور اس کے مزاج کی تشریح و توضیح کا کام کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ صاحبِ امر کی اطاعت اس کی ذات کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ اس کی طاعت اس سے کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی حاکمیت تسلیم کر کے اس کے اقتدار کے آگے نہ تبسم نہ کر دیتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت کا اسیان نہ کر رہتا ہے۔ یہ حق کہ اس کی اطاعت کی مانگے اللہ اور اس کے وعدہ کی حاکمیت کے اعتراف اور اس کی شریعت کے نفاذ سے حاصل ہوتا ہے۔ اب گروہ اس عزرائل یا نفاذ سے پہلو نہیں کرے تو اس کی طاعت کا حق ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کے احکام کا نفاذ واجب نہیں رہ جائے گا۔ اللہ کا رسولؐ فرماتا ہے:

عَلَى الْمَوءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فَمَا أَحَبُّ وَكَوَرُ الْإِذَا نَؤُومٍ مَعْصِيَةٍ،

فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة (بخاری، مسلم)

”ہر مسلمان ہر نامہ ہے کہ خدا جب امر کا حکم مانے اور اسے بجا مانے خواہ اسے یہ حکم پسند ہو یا نہ پسند ہو۔ الا یہ کہ اسے معصیت کا حکم دیا جائے۔ جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو اس پر نہ سنا فرض ہے نہ حکم بجالانا۔“

اسمعوا واطيعوا، وان استعمل عليكم عبد حبشي كان راسه ذبيحة،

ما افام فيكم كتاب الله تعالى (بخاری)

”حکم سنو اور اس کی تعمیل کرو خواہ نہ پر ایک حبشی کو حاکم بنا دیا جائے جس کا سر کتس کے دانہ کے مانند اچھوٹا اور سیاہ ہو جب تک کہ وہ تمہارے درمیان کتاب اللہ کے احکام نافذ کرتا ہے۔“

اس حدیث میں یہ بات بالکل ساف کر دی گئی ہے کہ سمع و طاعت اس وقت تک ہونی چاہیے جب تک کہ کتاب اللہ کو قائم کیا جائے یہاں حکمران کے احکام کی مطلق اور غیر مشروط اطاعت نہیں اور نہ ہی یہاں کہ جابہ حکمران اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کو پس پشت ڈال دے لیکن طاعت جاری رہے۔ یہاں دو چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ حاکم شریعت دینیہ کی تنفیذ کا کام اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اس کا ذمہ داری جو اسے اور یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے کہ اسے اپنا اقتدار اپنی کسی دینی خصوصیت کی بنا پر حاصل ہو۔ حاکم کو کوئی ایسی دینی افتخاری نہیں حاصل ہے جسے وہ بلا واسطہ آسمان سے حاصل کرنا ہو جیسا کہ پہلے بعض حکمرانوں کے مارے میں خیال کیا جاتا تھا جس کو نفیاً کر بی۔ کا نام دیا گیا ہے۔ یہاں حاکم مسلمانوں کی مطلق آزادی اور کامل اختیار کے نتیجے میں حاکم بنتا ہے۔ اس مسئلہ میں نہ تو سابق حکمران کا کیا ہوا یا کرایا ہوا کوئی عہد و پیمان مسلمانوں کو کسی خاص فیصلہ پر مجبور کرتا ہے نہ وہ اس منصب کو وراثت کے طور پر کسی خاندان کے لیے مخصوص رکھے کے پابند ہیں۔ اسے اگر یہ منصب ملتا ہے تو اس کے اقتدار کا منبع شریعت الہی کی تنفیذ کی ذمہ داری ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ ذاتی اقتدار کی بنا پر بطور خود قانون سازی کا دعوے دار ہو۔ پھر اگر مسلمان اس سے راضی نہ ہوں اور اسے پسند نہ کریں تو وہ کسی طرح بھی یہ منصب نہیں پاسکتا۔ ان کی رضا مندی کے بعد بھی اگر اسے مل کر امام اللہ کی شریعت کو چھوڑ دے تو یہ وہی ہے اس کی اطاعت بھی موقوف ہو جاتی ہے۔

یہیں سے ہیں اس بات کا بھی پتہ مل جاتا ہے کہ اپنے بعد کے لیے اپنا خلیفہ مقرر کرنے میں نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا حکمت تھی۔ آپ کا ایسا کرنا یہ مشہد پیدا کر سکتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مقرر کیے جانے کی وجہ سے اسلام میں خلیفہ ایک طرح کی مذہبی ریاست کا حامل ہے۔

اسلام مسیحی کلیسا کے Ecclesiastic طبقہ کی طرح کی کسی دینی ہیئت کا قائل نہیں اور نہ اسلامی حکومت کسی مخصوص ادارے یا مجلس کے ہاتھوں چلائی جانے والی حکومت کا نام ہے۔ ہر وہ نظام حکومت جس میں حکمران اللہ ہی کے واحد حاکم ہونے کا اقرار کرے اور اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ اسلامی شریعت کو نافذ کرے کہ اس کا کام شریعت کے نفاذ کے سوا کچھ نہیں، اسلامی حکومت قرار پائے گا۔ اگر کسی مذہب کے نزدیک "مذہبی حکومت" سے وہ حکومت مراد ہوتی ہو جس کی باگ ڈور ایک متعین گروہ کے ہاتھوں میں ہو تو اسلام کے اندر یہ معنی کسی درجہ میں بھی مستحق نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ رائے بھی صحیح نہیں قرار دی جاسکتی کہ حاکمیت صرف اللہ سبحانہ کے لئے مخصوص سمجھ کر اسلامی قانون کے نفاذ کے واسطے اسلامی حکومت کسی اور شرط کی تکمیل پر بھی منحصر ہے۔ درحقیقت ہر وہ حکومت جو اس اصول پر مبنی ہو کہ حاکمیت صرف اللہ کا حق ہے۔ اور اس میں اسلامی شریعت نافذ کی جاتی ہو اسلامی حکومت ہے۔ اسی طرح جو حکومت حاکمیت کو صرف اللہ سبحانہ کے لئے مخصوص کرنے کے اصول پر نہ مبنی ہو اور جس کے ہاتھوں یہ شریعت نافذ کی جا رہی ہو اسے اسلام اپنی طرف منسوب کرنے کو تیار نہیں خواہ اس کی نگرانی کسی دینی ہیئت کے سپرد ہو یا اسے کسی اسلامی نام سے موسوم کر دیا گیا ہو۔

محکومین کی طرف سے اطاعت حکمران کے اس اعتراف پر کہ حکمرانی صرف اللہ کا حق ہے اور اسلامی شریعت کی تنفیذ پر منحصر ہے اور اسی دہنگ ہے جب تک کہ یہ صفت برقرار ہے۔ یہ بات حکمرانی میں عدل اور اللہ کی اطاعت کے سوا کسی دوسری شرط سے مشروط نہیں۔

۳۔ محکام اور محکومین کے مابین مشاورت

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)

”معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کیجیے“

أَمْؤُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوری: ۳۸)

”ان کے معاملات آپس کے مشوروں سے طے ہوتے ہیں“

اس طور پر شوریٰ اسلام میں طرز زندگی کا ایک بنیادی اصول قرار پاتی ہے۔ اس کا دائرہ اثر حکومت

پیش پیش رہنے والے اور صاحب الرائے اہل شوریٰ کون لوگ ہیں۔ یہ تعین ایسی سہولت اور خوش سلوئی سے انجام پاتی ہے کہ انسانی اہتمام سے نا آشنا ہیں۔

اسلام میں حاکم کے لئے اس کے احکام کی اطاعت اس کی خیر خواہی اور وفاداری اور شریعت کے قائم کرنے میں اس سے تعاون کے سوا کوئی ایسے حقوق نہیں ہیں جو عام مسلمانوں کو نہ میسر ہوں۔

وضیح رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم ہی نہ تھے بلکہ آپ ہی قانون دیے والے بھی تھے جنہاں جو اسد مہ کے عطا کردہ حقوق کے دائرہ میں حاکم کو جن حدود کی پابندی کرنی ہے اُن کی آپ نے عملی طور پر نشاندہی کر دی ہے۔ پھر آپ ہی کے اُسوہ پر خلفائے راشدین بھی چلتے رہے جیسا کہ اُندۃ تاریخ میں مول کے باب میں آ رہا ہے۔ آپ کا حال یہ تھا کہ خود اپنی ذات سے بھی قصاص لیتے تھے۔ لہٰذا آنکھ جس کا حق ہو خود وہی معاف کر دے۔ ایک بار ایک قرعہ خود پیا اور آپ سے کچھ سختی کے ساتھ پینے آیا۔ اس پر کچھ مسلمان اس کی طرف پکے۔ آپ نے انہیں اشارہ کیا کہ اسے چھوڑ دیں کیونکہ حق دار کو کہنے سننے کا پورا پورا حق ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لَا يَحِلُّ لِي مِنْ غَنَائِكُمْ لَا هَذَا أَحْسَنُ، وَالْأَحْسَنُ مَرَدُّ عَلَيْكُمْ۔

(بو داؤد، نسائی۔)

”تمہارے غنائم میں سے مجھ اس پانچویں حصے کے میرے لئے اور کچھ حلال نہیں، اور یہ پانچواں حصہ بھی تمہارے ہی اوپر خرچ کیا جائے گا۔“

آپ نے اہل خاندان اور قریبی رشتہ داروں کو مخاطب کر کے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اسْتَوْزُوا لِنَفْسِكُمْ لَا غَنَىٰ عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا۔ يَا بَنِي عَبْدِ
مَنَاوٍ لَا غَنَىٰ عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا۔ يَا عَبَّاسَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا غَنَىٰ
عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَيَا صَفِيَّةَ عَمَةَ رَسُولِ اللَّهِ لَا غَنَىٰ عَنْكَ مِنَ اللَّهِ
شَيْئًا وَيَا فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِّطِي مَا شِئْتَ مِنْ مَالِي لَا أَعْنِي عَنْكَ مِنَ اللَّهِ
شَيْئًا۔ (مسند عبد)

”اے ابی فریش! بیٹے سہاں کرو میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ بھی کام نہ سکوں گا۔
 اے بنی عبد مناف! میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ بھی کام نہ سکوں گا۔ اے عباس
 بن عبدالمطلب! میں اللہ کے حضور تمہارے ذرہ برابر بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے
 رسول اللہ کی بچو بھی صفیہؓ میں اللہ کے حضور تیرے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے
 فاطمہؓ سنت محمدؐ میرے ماں میں سے جو پستہ انگ سے گرتے گرتے حضور میں میرے کچھ
 بھی نہ کام آسکوں گا!“

علیؑ کو فاطمہؓ سے حوں کو سب سے زیادہ محبوب فرماتے ہیں:
 لَا أُعْطِيكُمْ وَادِعَ أَهْلَ الْبَيْتِ تَنْقِي مَطْوِيهِمْ مِنَ الْخَوْعِ۔
 (حدیث نمبر ۵۹۶ مسند امام احمد، مرتبہ و نشر کردہ استاد احمد محمد شاگر)

”یہ ہو گا کہ میں تم کو بچوں دوں، اور اہل عیال کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ جو کس کے پاس
 اس کے بیٹ پیٹے جا رہے ہوں!“
 ایک دوسرے موقع پر ان ہی سے فرمایا:

لَا اخذ مكنيا وادع اهل صفا مطوي۔ (رخاء)
 ”یہ ہو گا کہ تمہاری خدمت کروں اور اہل صفا کو فدا کر کے اپنے چھوڑ دوں!“
 آپؐ کی کارِ شاد ہے کہ:

ان ہی اسواند کاں اسرق فیہم شریف مزكوة، واداسرق
 فہم الضعيف قطعوه لوكايت فطمذ لفظعت یدھا۔
 (رواہ ابی جعفر)

”ہی سزائیں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی مغرز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے
 ورنہ با کوئی کمزور اور معمولی آدمی چوری کر بیٹھتا تو اس کا ہاتھ کاٹتے۔ میں تو گرفتار
 سب اس جرم کی مرکب، ہوتی تو اس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔
 پس حاکم کے بے حد و شرعی یا اموال ریاست میں کوئی خصوصی حقوق نہیں اور اس کے گھروالوں
 کو بھی ان اموال میں ان حقوق سے زیادہ کوئی حق حاصل نہیں جو عام مسلمانوں میں سے کسی شخص کو حاصل

ہوتے ہیں۔ حاکم کو عام لوگوں کی روح، اُن کے جسم، اُن کی عزت و آبرو اور ناموس، اور اُن کے مال و دولت پر کسی طرح کی زیادتی کا حق حاصل نہیں ہے۔ جب وہ حدود شرعی قائم کر چکا اور فرائض کو نافذ کر چکا تو یہاں آکر اس کے اختیارات ختم ہو گئے اور اس سے آگے لے لوگوں پر کوئی اقتدار حاصل نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دائرہ سے آگے اُن کو اس کے اقتدار کی دمنس سے باہر اور محفوظ رکھا ہے۔ روح و جسم اور ناموس و مال ہر اعتبار سے۔

اسلام نے نئے وضع اور مطلق احکام کے ذریعہ روح و جسم اور مال و ناموس کے تحفظ کی ضمانت دی ہے کہ ان کے بعد اس حقیقت میں کوئی بھی شائبہ نہیں رہ جاتا کہ اسلام امن و آشتی اور سب کے لئے باعزت زندگی کے موقع فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا
وَتَسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا (سورہ: ۲۴)

”کسی گھر میں بغیر اجازت داخل نہ کیے اور گھروں کو سلام کے بعد داخل ہوا کرو“

لَيْسَ الْبِرَّ بِأَنْ تُولُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا. (البقرہ: ۱۸۹)

”نیکلی اس کا نام نہیں کہ گھروں میں عقب سے آؤ“

وَأَنْتُمْ الْبُيُوتُ مِنْ أَبْوَابِهَا (البقرہ: ۱۸۹)

”گھروں کے اندر ان کے دروازوں کی راہ سے آؤ“

وَلَا تَجَسَّسُوا (النجم: ۱۲)

”دوسروں کے عیب نہ ڈھونڈتے پھرو“

حدیث ہے کہ:

كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهُ وَعَرَضُهُ وَمَالُهُ مُسْلِمٌ وَبَنَاتُهُ

”مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے۔ اس کا خون، اس کی عزت و آبرو

اور اس کا مال“

اور ساتھ ہی اسلام میں جان کے بدلے جان اور زخموں میں برابر کے بدلے کا اصول رکھا گیا ہے۔

جہاں اسلام اپنی ذات سے متعلق امور میں امام کے حدود اختیار کو بہت محدود کر دیتا ہے وہیں

مخلصانہ احتساب و نگرانی اور بے خوف ہو کر ہر بُرائی کو، خواہ وہ کسی سے صادر ہو، مٹانے کے ذائقہ کی ادائیگی کی صلاحیت سے محروم کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد اپنی ان ذمہ داریوں کو اس وقت تک نہیں ادا کر سکتے جب تک انہیں روزی کے ایسے ذریعے میسر نہ ہوں جو انہیں اور اس کے مقدر کر دہ عہدہ داروں کے قبضہ قدرت سے آزاد ہوں۔ بات یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں روٹی کے سارے خزانے ہوں گے اس کے آگے بندوں کی گردنیں جھکی رہیں گی۔

اُمت مسلمہ کی تاریخ میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ سلامی طرز زندگی کے بنیادی اصول کو بھڑکتے بغیر عام معصات کی پوری رعایت ٹھوٹا رکھی گئی ہے۔ ہر زمانہ میں ایسا کرنا ممکن ہے، کیونکہ اسلام کوئی جامد نظام نہیں ہے اور اس کے اصولوں و عملی حالات پر منطبق کرنے کا عمل کسی زمانہ یا کسی ماحول میں رُک نہیں جاتا۔ اسلام جن چیزوں کو بہ حال قائم رکھنا چاہتا ہے وہ بنیادی اصول ہیں جو اس کی رہنمائی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہیں۔ مسلم سوسائٹی ان اصولوں کو جاہلی معاشروں میں کمزور پڑ جانے یا مٹ جانے سے بچاتی ہے۔ اور اگر وہ اہسان کر سکے تو اسلام ان معاشروں کی قیادت کے اس منصب سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس کے لیے وہ آیا ہے۔

دانشور ہے کہ یہ تصدیقات اسلام کی حکومتی پالیسی کے تحت "ری" (یعنی قانونی اور ضابطہ کے تحت آنے والے) پہلو سے متعلق تھیں۔ اس کے پیچھے تطوُّع (یعنی اُداد کے اختیار و پسند پر چھوڑی ہوئی ذمہ داریوں) کا پہلو بھی مستقل طور پر موجود ہے جسے تلقین و ترغیب کی قوت قانونی طور پر عاید کی جانے والی ذمہ داریوں سے بہت آگے لے جاتی ہے۔

پس اسلام میں نظام حکومت قانونی بنیاد کے ساتھ ہی ضمیر کی بنیاد پر بھی قائم ہے۔ اس بنیاد پر کہ اللہ تعالیٰ ہر لمحہ ماکم و محکوم دونوں کے درمیان ہے اور دونوں کو اچھی طرت دیکھ رہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:-

ما من عبد یستزعیہ اللہ رعیۃ فلم یخطہا بنصیحة الا
لم یجد راحة الجنة (بخاری و مسلم)

۔ جس بندے کو بھی اللہ کچھ دُگوں کا نگران ہو، اگر وہ اچھی اپنی زیرِ جوابدہی

سے ڈھانپ نہ لے وہ جنت کی خوشبو سے بھی آشنا نہ ہو سکے گا۔

بائشتم

اسلام کی اقتصادى پالیسى

اسلام کی اقتصادی پالیسی

آج کل اجتماعی عدل پر انبیا و نبیاں کہنے وقت سب سے زیادہ اہمیت اقتصادی پالیسی کو دی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے نالباکھ پڑھنے والوں نے ایسا محسوس کیا ہوگا کہ کتاب میں اس موضوع کو بہت مؤثر کر دیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کیونکہ اسلام میں جس چیز کو ہم اجتماعی عدل کہتے ہیں وہ اقتصادی پالیسی سے کہیں زیادہ وسیع اور بلند تر چیز ہے۔ جیسا کہ ہم گذشتہ ابواب میں واضح بھی کر چکے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ مخصوص طور پر اسلام کی اقتصادی پالیسی کے بیان سے پہلے اس بنیادی اہمیت کے حامل فکر کو سامنے لائیں جو اس نظام عدل کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ ہم نے اس کے مزاج اس کے ارکان اور ان طریقوں کی تشبیہ کی جو اجتماعی عدل کے وسیع باب میں اسلام نے اختیار کر رکھے ہیں۔ اقتصاد کو مقدم رکھنا مادی نظاموں کا خاصہ ہے جو معاشی قدروں کے، سوائے زندگی کی دوسری قدروں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔

اسلام اقتصاد کے باب میں جو پالیسی اختیار کرتا ہے وہ اس کے جامع فکر اور بنیادی نظریہ کے عین مطابق ہے۔ اسلام اقتصادی پالیسی کے ضمن میں بھی پہلے اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ اللہ واحد کی بندگی کا اصول قائم ہو۔ جس کا طغیہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا استعمال اللہ کے قوانین کے تابع ہو جائے۔ یہ قانون فرد اور جماعت دونوں کے مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں موزوں مناسب درمیانی راہ اختیار کرتا ہے جس میں نہ تو فرد کی کوئی حق تلفی ہوتی ہے نہ جماعت کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ وہ نہ تو فطرت کی راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے نہ زندگی کے حقیقی اصول و ضوابط یا

اس کے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں روڑے اٹھاتا ہے۔

اس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے کے لیے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اختیار رکھتا ہے۔ یعنی قانون نافذ شدہ بندوں اور بدعتیں۔ ان کو اپنے لیے یہی مقاصد حاصل کرتا ہے۔ ہر ایک صاحبِ اختیار کی زیرِ سماعتِ حق کے پابندی ہے، اور جہاں تک مقاصد کے ذریعہ وہ حاجات کی غلامی سے بلند ہوئے، ان کے بند نہ رہے۔ روڈوں سے توجہ ماننے اور عیب دہانی زندگی کو آئیڈیل کی حد تک بلند کر دینے سے یہ مقاصد کی طرف توجہ ہے۔ یہ مقاصد جو یہ واقع ہوئے ہیں کہ تمام لوگوں کا بہ طور کے حالات میں نہ تک پہنچ سکتے ہیں، اس لیے ترقی اور کمال کی راہ میں ہمیشہ کھلی رکھتا ہے۔

دلی پالیسی پر غصیل سے سنسو کرنے سے قبل ہم ایک ایسی مثال سامنے لائیں گے جس سے خود مال کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کو مسلمانوں میں سے ایک ایک کو وصول حق قرار دیا ہے جسے وہ لوگ پر قانوناً لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کی عدم ادائیگی کی شکل میں اس نے امام کو حدود قائم کرنے اور ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے جو اس سے کفر کریں۔ وہ یہ سرتاسر اپنے امام کو یہ حق بھی دیا ہے کہ زکوٰۃ کے عرصہ میں ان کے پاس انھوں نے سب سے بڑے بڑے کے فرقہ کاروں ہو سکتے ہیں اور ان کے جانے اور بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے مفادات کو محفوظ رکھ سکے۔ یہ بھی ضرورت پڑنے پر زکوٰۃ ہی کی طرف ایک حق ہو جاتا ہے، جس کی بہت فیصلہ کا انحصار اسلامی نظام کے عام اصولوں منت سے مصالح عامہ کی انصاف پسندی اور یا انتہائی ہے۔

معاملہ قانونی بلو نو اسی حد تک تھا، لیکن بدعت و فتنے کے ذریعہ لوگوں میں اچھا بھلا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنے سارے ہی مال سے دست بردار ہو جائیں اور اسے کل کا کل اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً نحو أحب وانا معه
فقال: "ما ابا ذر" فقلت لبیک یا رسول اللہ۔ فقال: الا کثر
هم الا تلتون یوم القیامۃ الا من قال کذا وکذا۔ عن یحییٰ و

شمالہ وقد آمدہ وخلفہ۔ وقیل ماہم۔ ثم قال: "یا ابا ذر!"
 فقلت: نعم یا رسول اللہ، ما بی انت و اخی۔ قال: ما یسر فی
 ان لی مثل أحد، انفضد فی سبیل اللہ أمر و انزل منہ قرطین
 قلت: او تظاری یا رسول اللہ، قال: "بل تیواطین" ثم قال:
 "ما ابا ذر، انت توین الاکثر وانا اربد الاقل"

(بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

"ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کی طرف تشریف لے چلے۔ میں بھی آپ کے
 ساتھ تھا۔ آپ نے فرمایا: "ابو ذر" میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! تیک" آپ
 نے فرمایا: "آج جو لوگ زیادہ رکھتے ہیں کل قیامت کے دن، ہی مفلس ہوں گے۔
 بجز ان کے جو ایسا کریں۔ آپ نے اپنے بچے، تہ، این بائیں اور سامنے چھپ چلائے ہوئے کہا
 اور یہ لوگ کم ہی ہوں گے۔ پھر آپ نے فرمایا: "ابو ذر" میں نے عرض کیا: "ہاں
 اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان (ارشاد ہو)۔ آپ نے فرمایا: "جی یہ بھی
 گوارا نہیں کہ میرے پاس اُحد جتنی دولت ہو اور میں اُسے راہِ خدا میں خرچ بھی کرتا
 رہوں لیکن مومن تو اُس میں دو قیراط (دو خرچ کیے ہی) چھوڑ جاؤں" میں نے عرض
 کیا: "رسول خدا آپ کی مروت کیا دو قیراط سے ہے؟" آپ نے فرمایا: "نہیں نہیں دو قیراط
 پھر آپ بولے: "ابو ذر! تم زیادہ کی طرف جاتے ہو اور میں کم کی طرف؟"

وہ تھی قانون سازی اور یہ ہے ہدایت و تلقین! اور یہ دونوں مل کر ہی اقتصادی پالیسی
 کی تشکیل کرتی ہیں۔ اسلام کی تمام پالیسیوں کا یہی حال ہے۔
 آئیے اب ہم تفصیلات میں داخل ہوں۔

انفرادی ملکیت

انفرادی ملکیت کا حق

اسلام دولت کی انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔۔۔ حصولِ ملکیت کی

ان مخصوص شکلوں کے ساتھ جن کو قانون جانور قرار دیتا ہو۔۔۔ ان شکلوں کا بیان آگے آتا ہے اور ایسی انفرادی ملکیت کو اس نے اپنے حق کی بنیاد قرار دیا ہے۔ پھر وہ اس حق کو تسلیم کرنے پر تیار ہونے والے رزلی نت سچ کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ بشا حق دار کے حق کی حفاظت اور اسے چوری سے ڈاکہ، ٹوٹ مار اور چپکنے وغیرہ کی تمام شکلوں سے محفوظ رکھنا۔ ساتھ ہی وہ اس بات کو بھی مد نظر رکھتا ہے کہ بغیر کسی اجتماعی ضرورت کے اور بغیر چور معاوضہ دیے ہوئے کسی کی ملکیت چھین لی جائے۔ اس تحفظ کی عملی طور پر ضمانت "دوست اندازی کی تمام شکلوں پر سخت سزائیں متعین کر کے" دینا ہے۔ ساتھ ہی وہ اصلاحی ہدایات و تلقینات اپنی جگہ پر ہیں جن کے ذریعہ وہ نفس کو ان چیزوں کی طرف پکھنے سے روکتا ہے جو اس کے اپنے پاس نہیں بلکہ دوسروں کے ملک ہیں۔ سدھ نے اپنے الی ملکیت کے دوسرے لازم بھی تسلیم کیے ہیں جنہیں اپنے مال میں توجہ رکھنا، اجارہ دہان بہہ وردھنت کے ذریعہ تلف کی ان تمام شکلوں کا چور یا مروجہ عملوں سے روکنا اور جیسے شہادت کے۔ سدھ نے جو حدود مفہوم رکھیں گے انذر ہوں۔

اسلام میں اس میں اور واضح حق کے تسلیم کیے جانے میں کوئی شبہ نہیں۔۔۔ بات بھی مشابہ سے بالا ہے کہ یہ حق اسلمی طرز زندگی کا ایک بنیادی اصول اور اسلام کے انفرادی نظام کی اساس ہے یہ ایسا بنیادی اصول ہے جس کی خلاف ورزی نہ صرف ضرورت کی صورت میں ضرورت کی حد تک ہی کی جاسکتی ہے۔

لَا يَرْجَا لِنَجِيبٍ عَمَّا كَتَبُوا ط وَلِلنِّسَاءِ نَفِيبٌ عَمَّا كَتَبُوا ط

(النساء: ۳۲)

و مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کہیں اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ خود کہیں۔

وَأَتُوا لِنِسْأِي مَوَا تَحْمَ وَلَا تَتَّبِدُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ ط

(النساء: ۲)

و قیہوں کا مال ان کے حوالہ کر دو اور بُری چیز کو اچھی چیز سے مل۔۔۔ لو:

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ

كَتَرْتَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَتُدَّهَمَا
وَيَسْتَخْرِجَا كَتَرْتَهُمَا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ ۚ (الکہف: ۸۲)
”رہی دیوار تو وہ اسی شہر کے دو قیمہ لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن
تھا۔ ان کا باپ ایک صالح آدمی تھا۔ پس تیرے رب کی یہ مشیت ہوئی کہ وہ
دونوں لڑکے بچتے عمر کو پہنچیں اور اپنا خزانہ برآمد کر لیں۔ یہ تیرے رب کی طرف
سے مکرم فرمائی تھی“

حدیث میں آیا ہے کہ:

مَنْ قَتَلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ (بخاری و مسلم)

”جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے“

چوری کی محنت سزا اس حق کے اتمام اور اس پرست درازی کی ممانعت کی گئی ہے
وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جِزَاءً بِمَا كَسَبَا
نَكَالًا مِنَ اللَّهِ ۗ (المائدہ: ۳۸)

”چوری کرنے والے مرد یا عورت کا حکم یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اس
جرم کے بدلے جس کے وہ مرتکب ہوئے، اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر“

غضب کرنا لازم اور اس جرم کا مرتکب ملعون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:
مَنْ ظَلَمَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا طَوَّقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرْضِينَ (بخاری و مسلم)
یہ الفاظ بخاری کے ہیں

”جو کسی دوسرے کی زمین کا تھوڑا سا حصہ بھی غصب کرے گا ساتوں زمینوں کا طوق اُس کے
نکلے میں ڈالا جائے گا“

مَنْ قَتَلَ مَالَ ۚ مَرِيٍّ مُسْلِمٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لَقِيَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ وَهُوَ عَلَيْهِ

غَضَبَانِ۔ (اسناد احمد محمد شاہ کی مرسل کردہ مسند امام احمد حدیث نمبر ۲۹۴۶)

”جو شخص کسی مسلمان کا مال بلا استحقاق دبا بیٹھے وہ اللہ کے حضور اس حال میں جائے گا

کہ اللہ تعالیٰ اس پر بہت غضبناک ہوں گے“

فرد کو جس طرح ملکیت رکھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح وارث بنانے کا حق بھی حاصل ہے :

لِلزَّهَّالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلْمَسْكِينِ مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفُقَرَاءُ
يَتِمَّ تَرْكَ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ (النساء : ۸)

”مردوں کا حصہ ہے جس ترکہ میں سے جو وہ مال جو ان کے چھوڑنے والے اور اسی طرح غریبوں کا بھی حصہ ہے جس ترکہ میں سے جو مال یہ غریب مسکین چھڑ جائیں۔“

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي ۱۰ لَدِكُمْ إِذَا كُنْتُمْ سَفَرًا وَلَمْ تَجِدُوا مَالًا ۖ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي ۱۰ لَدِكُمْ إِذَا كُنْتُمْ سَفَرًا وَلَمْ تَجِدُوا مَالًا ۖ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي ۱۰ لَدِكُمْ إِذَا كُنْتُمْ سَفَرًا وَلَمْ تَجِدُوا مَالًا ۖ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي ۱۰ لَدِكُمْ إِذَا كُنْتُمْ سَفَرًا وَلَمْ تَجِدُوا مَالًا ۖ

”مستغنیوں کا مال ان کے نصیب کی شکل میں ہے اور اگر وہ سفر میں ہوں اور مال نہ ملے تو اس مال سے جو کچھ چاہیں وہ لے سکتے ہیں۔“

انفرادی ملکیت کو تسلیم کرنا اور اس کا تحفظ محنت اور جدوجہد کے درمیان عدل قائم کرنے کا کام کرتا ہے۔ اس طور پر فلاحیت سے بہتر تہیہ ہوتی ہے اور نفس سفاکی میں رنج و ملامت کے سوا بھی پورے ہوتے ہیں۔ وہ مہمانان جن کی سداً نظام اجتماعی کی تشکیل میں پوری پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ایسا کرنے جماعتی مصالح سے بھی دوری حتم آئینگے کیونکہ یہ فرد کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ زندگی کی ترویج و ترقی کے لیے جو کچھ بھی اس کے بس میں ہو کر گزرے۔ مزید برآں یہ افراد میں وہ آزادی و رغبت نفس پیدا کرتا ہے اور ان کی شخصیت کو اس انداز پر نشوونما دیتا ہے کہ وہ اس دین کے علم بردار بن کر رہیں، منکر کی روک تھام کرنے اور حکمراں کا احتساب کرتے ہوئے اس کو نصیحت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ بغیر اس کے کہ انہیں اس بات کا اندیشہ لاحق

رہے کہ ان کی روزی نہ چھین جائے، جیسا کہ روزی کے حاکم کے ہاتھوں میں رہنے سے لازم آتا ہے۔

پنانچہ فرد کی فطرت میں "خیر" کی طلب و دیعت کی گئی ہے۔

إِنَّهُ لَحَبُّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝ (العادیات: ۸)

"وہ خیر کی طلب میں بہت حریص واقع ہوا ہے"

اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ اس کی ملک ہو اس پر قبضہ کرنے اور انھیں اپنی ملک میں

باقی رکھنے پر حریص ہو۔

قُلْ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ فَإِذَا تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ تَنْصَحُوا لَكُمْ وَأُفٍّ لَّكُمْ إِذَا تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ

الْوُفَّاقِ ط (بنی اسرائیل: ۱۰۰)

"کہہ دیجئے کہ تم میرے رب کی رحمت کے غرور کے مالک ہو تے تو بھی منہ بوجھنے

کے در سے ہاتھ روک لیتے"

وَأُفٍّ لَّكُمْ إِذَا تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ط (النساء: ۱۳۸)

"دل تنگی کی طرف مائل ہو جایا کرتے ہیں"

اپنی اولاد سے محبت و اپنی محنت کے ثمرات ان کو درشتہ میں منتقل کر جانے کی خواہش بھی

بالکل فطری ہے۔ آدمی جو مال ان کے لیے بچا رکھتا ہے وہ محنت ہی ہے جسے مال کی صورت میں جمع

کر کے رکھا گیا ہے اور اپنی زندگی میں اپنے تمام وسائل کا ذریعہ بنانے کے بجائے اپنی اور دیگر ترجیح

دیتے ہوئے ان کے لیے رکھ چھوڑا گیا ہے۔

ان فطری میلانات کا ساتھ دینے اور ان کے تقاضے پورے کرنے میں کوئی حرج نہیں تاکہ

انسان محنت اور سیدائش دولت کی بہرہ میں اپنی ہی ضروریات کی خاطر ورنہ ہی ذوق و شوق کے تحت

پورے جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھے اور اس میں اپنی پوری طاقت صرف کر دے، حالانکہ وہ

کسی طرح بھی خود کو محنت کرنے پر مجبور نہ پاتا جو نہ بے دلی، نہ پسندیدگی اور مایوسی کے جذبات

اُس کے پاس پھکیں۔ اس کی اس کدو کاوش کا حاصل بار خیر جماعت سے حصہ میں آئے گا۔

مزید برآں اسلام ایسے قواعد و ضوابط بھی ترتیب دیتا ہے جو اس کا فائدہ جماعت کو بہم پہنچانے

کے علاوہ ان متوقع نقصانات کا بھی سد باب کرتے ہیں جو فرد کی آزادی و خیر اور اس کو عطا کردہ حق

ملکیت کے نتیجہ میں سامنے آ سکتے ہیں

یہ بات مدرسہ کے اہلین عاصم میں سے ہے کہ جب تک غلو جماعت کے لیے مفاد ہو اجتماع ملی مہ کو فوڈ کے میدان سے رتوبات سے ہوتا ہے۔ مدرسہ کی دشمنی کے مطابق جہاں جہاں فرد جماعت کی راہ میں جو فوٹیں منٹتا ہے، جس میں اپنا پسیدہ بہا ہے، اس کے لیے جو جہاں اور ذہنی کردار کاوش کرتا رہتا ہے اس کے لیے نظر ایسا نہ ہا کی ضرورت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مدرسہ ہی اسلام کا اصل اصول ہے۔ مدرسہ اجتماعی ہوتا ہے، بقا اس ضروریہ ممکن نہیں کہ اس سلسلے کی قربانیوں کا سارا بار فرد ہی پر پڑے۔ اس لیے درمیان کی راہ میں اجتماعی مدد کو اس کی تمام صورتوں میں قائم کرنا چاہیے۔ نیز ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا بار فرد اور جماعت دونوں پر عیاں طور پر پڑے۔

کوئی بھی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تو ان طبیعی محرکات، عوامل کو کچھنا فر دیا جماعت کے حق میں کچھ اچھا بتا سکتا ہے۔ حقیقت یہ فطرت انسانی سے یک بار و جہ کی مددنی ہے جو قیام مدرسہ کی واحد ممکن شکل ہیں اسی کو تو رہتی ہے کہ فطرتی میلانات کو دبا دیا جائے۔ ان کی راہ روک رکھ دے ہو جایا رہے۔ وہ خیالی نظریات جو حقیقت واقعہ سے کوئی بحث نہیں کرتے صرف وہی یہ فرض کر سکتے ہیں کہ خرافات، قانون اور سماجی علم وہاں ڈال کر ایک تھوڑے سے یا چند پشتوں میں ان شکات کو کیے ختم کیا جاسکتا ہے۔ سلطنت سے اس درجہ بدگمانی نہیں کرتا اور یہی وہ عقائد ہیں جنہیں ہندو کے خیالی بنیادوں پر اپنی مہارت اٹھانے کا خیال ذہن میں لاتا ہے۔

اب ہم یہ سوچنا شروع کر سکتے ہیں کہ خود انسانیت کے احکام کا تقاضا ہے کہ ہم اسے ذرا اور تجزیاتی نظریات دیکھیں جو اس کے مذاق کی گہرائیوں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکے۔ اس کی فطرت کی اصل کو پاسکے اور یہ معلوم کر سکے کہ اس کی جڑیں کتنی گہری جا چکی ہیں۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ ہم انسانیت کی رہنمائی اور اس کی تعمیر کے اہم کام میں زیادہ اشتہار، سوجھ بوجھ اور سنبھل سنبھل کر قدم نہ اٹھانے کا مظاہرہ کر سکیں۔ بلکہ ہمیں پچھلی جوئی انسانی زندگی جو دلائل پیش کرتی ہے وہ اتنے ہلکے اور بے وزن تو قرار نہیں دیے جاسکتے کہ ہم حیات انسانی کی فطرت، اس کی اصل روتیں اور اس کے

میلانات درجانات کی بابت خود سے کچھ نظریات گھڑ لیں اور پھر زبردستی انہیں کو مستطیح بھی کر دیا۔
 حق وراثت و توریث کی بات پر تفصیل گفتگو اجتماعی نکال کے باب میں کر چکے ہیں۔ اب
 یہاں ہم نے جس اسچٹ پر روشنی ڈالی ہے یہ حق اس کے عین مطابق اور ساتھ ہی عدل اجتماعی سے اسکی
 بلند ترین سطح پر اور مندرجہ تحت سے اس کے وسیع ترین معنی میں ہم آہنگ ہے۔ یہ تصور نوع انسانی
 کی ایک بہشت اور دوسری پشتوں کے درمیان کوئی مصنوعی دیوار نہیں کھڑی کرتا اور پھر جیسا کہ آگے آتا
 ہے یہی حق تقسیم دولت کے مسائل میں سے بھی ایک ہم وسیلہ ہے۔

انفرادی ملکیت کا مزاج

لیکن یہ نہیں کہ سلسلہ نے سرمایہ دارانہ نفس مرکب ذاتی ملکیت کے حق کو حدود و قیود
 مایہ کیے بغیر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ وہ اس حق کو تسلیم نہ کرتا ہے لیکن اس کے پیلوں کو پورے
 اصول و ضوابط بھی دیتا ہے جو اس حق کو اسی درجہ میں جماعت کے مصالح حاصل کرنے کا ذریعہ
 بنا دینے ہیں جس درجہ میں کہ اس سے ملک و دے مصالح پورے ہوتے ہیں۔ وہ اس حق کو قانوناً
 تسلیم کرنے کے ساتھ ہی مال کی فزائش، خرچ و درجہ دینے سے متعلق تصرفات کے لیے متعین
 ضابطے بھی عطا کرتا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیچھے جو چیز کام کر رہی ہے وہ جماعتی مصالح کا لحاظ
 اور خود فرد کی مفاد کی رعایت ہے۔ ان فطری اغراض و مقاصد کی حدود میں رہتے ہوئے جن پر اس
 زندگی کی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

حق ملکیت کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے مال و ملک کے سلسلہ
 میں فرد کی حیثیت جماعت کے نمائندہ اور نائب کی سی ہے، اس پر اس کا قبضہ ملکیت کے ہیں زیادہ
 ایک ذمہ داری ہے۔ اپنی عمومی حیثیت میں مال و دولت جماعت کا حق ہے جب کہ خود جماعت بھی
 اس معاملہ میں اس خدا کی نیابت پر مامور ہے جس کے سوا کوئی ذات کسی چیز کی تخلیق یا ملک نہیں۔
 انفرادی ملکیت اس وقت وجود میں آتی ہے جب ایک فرد اپنی ذاتی محنت سے ان شے میں سے
 کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لے آتا ہے جس پر اللہ نے بنی نوع انسان کو اپنا نائب بناتے ہوئے ایک
 عام حق ملکیت عطا فرماتا ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ تَاٰخِقُوْا عَمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَحْبِبِيْنَ

فِيْهِ ۔ (الحديد: ۷)

”مومنو! اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا اور جس سے تم کو پسند ہے اس سے

جے اس میں سے جو تم کو پسند ہے۔“

نہ کسی، دین کی حاجت میں اور نہ نفعی طور پر ہمارے بیان کی، مذکور رہتا ہے۔ یہی
نہ اس کے، خود میں جو، سب وہ خدا کا ہے اور اس کی حیثیت، سب کی ہے۔ راصل
میں اس کی پسندوں میں اس جو، سب وہ خدا کی، بت ہے حکم دیا گیا ہے۔

۱۰۔ فَصَلِّ مِمَّا رَاٰکَ اللّٰہُ تَاٰخِیْہُ ۝ (النور: ۳۳)

”خدا سے جو، سب وہ خدا کی، بت ہے اس سے۔“

وہ یہی اس جو، نفس دے اس وہی سب سے نہیں بڑھ سکے، اس میں سے دیتے ہیں وہ

وہ مستحق نہ ہو، ایک دہا، سطر کی ہے۔

”اس کی نہ وہ سب کی سب کے، اس میں سے نہ وہ، نفع اور نہ ہی سب میں
یہی ہیں تو سب کی ہیں۔ اس سے سب سب کے نفع کے حق سے رہا وہ نہ ہو میں۔ واقعی یہی
یہی ہے۔ جو کہ مانتا ہے در نفع کے حق کے وہ سب کی اس میں نہیں سکتی نہ فی
اس حق کے بقاء کی شرط سب کی سب کی ہے۔ اور جب کوئی سب کی، دلی
اور نہ ہی کا مضامین کرے جو، سب کی، سب کی کوئی سب کی ہے کا حق ہے۔

وَاٰتُوْا الشُّعْبَۃَ ۝ اَمْوَالُہُمُ الَّتِیْ حَدَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قٰتِلَہُمْ

وَاٰتُوْہُمْ مِنْہَا وَاکْثُوْہُمْ (النس: ۵۰)

”خدا سے جو، اس میں خدا سے بہار سے کہہ رہے کہ وہ جو، اس میں کہہ رہے ہیں

کے حوالے نہ کر دو۔ والیت، اس میں سے ان کو کھاؤ اور پیناؤ۔“

”خدا کا حق نہ کر دو۔ اس میں خدا کی بخشش و ثواب انہی میں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ

نہ، اس میں خدا کی بخشش و ثواب انہی میں سے کہہ رہے ہیں کہ وہ

یہی موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس میں اس سے کہہ رہے ہیں کہ وہ

اس کا وارث نام ہوتا ہے۔ کیونکہ مال دراصل جماعت کا تھا جسے ایک فرد کی نگرانی میں دیا گیا تھا۔ جب اس کے بچے اس کا کوئی نذر یا تو مال جہاں کا تھا وہاں لوٹ آیا۔

اس اصل پر زور دینے سے جو دینی مروجہ نہیں کہ ہم دوست فی اجتماعی ملکیت کا اصل ثابت کریں ذاتی ملکیت کا حق اسلامی نظام میں ایک بنیادی حق ہے جسے واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ ملک میں یہ زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کے مارے میں صحیح تصور کی ضرورت ہے۔ اس میں اصل سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس سے مال و دولت کے بارے میں سد کا وہ مذہبی تصور سے آگے نہیں بڑھتا۔ ذاتی ملکیت واقعی بھی ہے۔ درہمات بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ملکیت کا سد مذہبی نظریہ انفرادی ملکیت کے سربراہ دارانہ نظریہ سے بالکل مختلف واقع ہو ہے۔ باعناذ دیگر ذوی احساس ہونا چاہیے کہ وہ اس مال میں جو دراصل ہمارا ہے صرف ایک ذمہ دار کا یہ ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاکہ یہ احساس اسے اپنے نفع ذاتی پر جماعت کی عہدہ ہاں بندہ ہوں کو بخوشی سنبھالے۔ یہ دوسری سوئی ہوئی ذمہ داروں کو جس سے قبول کر کے کے بڑھے یہ مادہ کرے۔ اسی حالت میں ان کے ہاں بے خوف ہو جائے۔ ذاتی ملکیت کے ہاں کی تحقیق ملک ہے۔ یہ وہ ذمہ دار یاں ڈالنے یا عہد بندیاں عاید کرنے ہیں زیادہ جری اور بے باک ہو جائے۔ البتہ ایسا کرنے میں جماعت اسلامی نظام کے مذہبی اصولوں کو ملحوظ نہ ہونے دے گی۔ جن کی طرف ہم نے یہ اشارہ کر چکا ہے۔ بات ذرا پیسے سے ملنے والے سے سس کے ہاں کے ہاں دوست سے اس طرح فائدہ اٹھایا جائے جس سے مکمل اجتماعی عدل قائم ہو۔

مال سے متعلقہ کے سلسلہ میں سد کا دوسرا اصول یہ ہے کہ مال کا لوگوں کے ایک خاص گروہ میں محدود ہو کر رہ جائے اور اسی کے درمیان اس دن رات رہنے رہا کر دوسرے لوگ اسے نہ پاسکیں بہت نا پسندیدہ اور سراسر نامطلوب ہے۔

کَلَّا لَا يَكُونُ دُولًا بَيْنَ الْأَئِمَّةِ بِسْمِ اللَّهِ الْحَشْرُ ۝

”تاکہ مال نہ ہمارے مالدار لوگوں ہی کے درمیان چکر لگاتا رہ جائے“

مطلب یہ ہے کہ مال دار لوگوں سے ان کے مال کا ایک حصہ لے کر اسے غریبوں کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ اس شخص سے حوتاریخ و بستہ ہے اس کا جاننا اسلام کے اس بنیادی اصول کو صحیح طور پر سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

نسان کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ کبھی نہیں ڈلتا۔ اسی لیے سے یہ گوار نہ ہوا کہ دولت صرف غنیوں کے ہنر چکر کرتی رہے ورنہ س نے اپنی دیالیسی کے سلسلے میں اس کو ایک مستقل اصول کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اس نے مسکے ایک حصہ کو غنیوں کو دینا لازم قرار دیا تاکہ ان کو دردی کا ایک ایسا ذریعہ حاصل رہے جو ان کے اپنے قبضہ میں ہو ورنہ عزت نفس کے ساتھ آئے زندگی گزار سکیں یا کہ وہ ہر سبوں کو مٹانے کی وہ ذمہ داری ادا کر سکیں جو اس دینے کے لئے پوری پیکر ہے خواہ یہ بڑا یا چھوٹا ہو یا جتنی ہی یا محبوس میں۔

بعض مشائخ قسم کے مال سے ہوتے ہیں جن کا اپنے قبضہ میں لانا اذیت کے لیے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے نبی کا نام لیا ہے: یانی، گھاس اور آگ۔

الناس شرکاء فی ثلاث: فی الماء والکلاء والنار۔ مصنف نے اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے۔

انہیں چیزوں میں سب کے سب شریک ہیں: یانی، گھاس اور آگ۔

ایسا نہ چیزوں کی اس خصوصیت کی بناء پر ہے کہ اس وقت کے عرب میں یہ چیزیں جہاں کی زندگی کے لیے ضروریات میں شمار کی جاتی تھیں۔ اسی لیے ان سے متفاد کا حق یہی ہے جہاں کو کبھی طور پر دیا گیا۔ جماعت کی زندگی کے لیے لازمی اشیاء میں ماحول اور رہائش کے مسائل سے نمٹنا ہوتی رہتی ہے اور قیاس میں جو اسلامی اصول شریعت میں سے ایک ہے، صوبہ ہی وسعت موجود ہے کہ ان دوسری چیزوں پر بھی اس کا انطباق کیا جاسکے جو اس حکم کے تحت داخل ہوں۔ شرط یہ ہے کہ اسلامی نظام کے بنیادی اصول مجروح نہ ہوں۔ یہ نہ ہو کہ تمام افراد کو ذاتی ملکیت سے محروم کر کے حکومت کا تنخواہ دار بنادیا جائے، کیونکہ ایسی صورت میں حکومت کو عدم بننے اور دبا کر رکھنے پر اس سے کہیں زیادہ قادر ہو جاتی ہے جنہی قدرت کے یہ دروازے کھولے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ حکومت کے ہاتھ میں اقتدار اور مال دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

مال کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو جماعت کے بعض ضرورت مندوں کا حق ہے۔ یہی وہ حصہ ہے جو زکوٰۃ کی صورت میں قانوناً فرض ہے۔

فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۚ لِّلشَّائِلِ ذَآلِ الْمَحْرُومِ ۚ (معارف ۲۳: ۲۵)

یہ شارٹ ہی ہے جس نے اسے سبب شرعی پر منحصر قرار دے کر انسان کو ملکیت کا حق عطا کیا۔ چنانچہ ملکیت کی مختلف تعریفوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ملکیت کسی شے کی ذات یا اس سے فائدہ سے متعلق ایک شرعی حکم ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ جس فرد کی طرف اس حکم کی مناسبت کی جلتے ہے اس شے سے نفعات کا اور اسے دے کر اس کی قیمت وصول کرنے کا حق دار سمجھا جائے۔

فقہائے اسلام کی متفقہ رائے ہے کہ ملکیت اسی وقت مستحق ہوتی ہے جب خود شارع اسے عطا کرے یا تسلیم کرے۔ اس لیے کہ سارے حقوق جن میں حق ملکیت شامل ہے بلا شارع کے عطا کیے یا اس کے اسباب کو تسلیم کیے نہیں ثابت ہوتے۔ یہ حق اشیاء کی طبیعت سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ شارع کے اذن سے اور اس بات سے وجود میں آتا ہے کہ اس نے شرعی طور پر سبب کو مسبب کے وجود میں لانے کا ذریعہ تسلیم کیا ہے۔

حق ملکیت کے بارے اسلامی نظریہ کی وضاحت میں یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کی روش سے ملکیت ثابت کے نائب کی حیثیت میں شارع کی طرف سے دی ہوئی خاص چیز پر قبضہ ہو وہ حق ہے جو وہ کسی فرد کو دیتا ہے۔ اگر یہ تمسک نہ ہوتی تو اس فرد کا قبضہ کبھی درست نہ ہوتا۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ مال اللہ کا ہے اور بنی نوع انسان اس میں خلیفہ کے طور پر منتصرف ہیں۔ شارع ہی اس کا مجاز ہے کہ کسی چیز کے اپنی ذات کے لیے مخصوص کرنے کی اجازت دے، خواہ یہ اجازت کسی اصولی م کے تحت ہو یا کسی خاص اجازت نامہ کے ذریعہ۔

اسلام میں ملکیت کا حق پانے کا واحد ذریعہ عمل ہے۔ غنّ، پھل، ترشموں اور نمازوں کی شکلوں میں۔ اس طور پر محنت اور اس کی جزائے درمیان مساوات قائم رکھی گئی ہے۔ اس اجازت کی تفصیل یہ ہے کہ دولت کے حاصل کرنے اور اس کا مالک قرار پانے کی جن شکلوں کو اسلام درست تسلیم کرتا ہے وہ یہ ہیں،

۱۔ شکار۔ یہ انسانی زندگی کا قدیم ترین ذریعہ معاش رہا ہے۔ اب بھی غنم اور

ترقی یافتہ ممالک میں بہ فحشت فساد کے سال حاصل کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ کبھی موتی، مرجان، ہفتی اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کا شکار آج بھی قوموں اور ان کے تمدن کو ایک معتد بہ حقہ و خیرات ہے۔ یہی حال تجارت کے لیے یافتہ کی ہے۔ برٹریوں اور جانوروں کے شکار کا بھی یہی ہے۔

۲۔ جن افتادہ زمینوں کا کوئی مالک نہ ہو

ان کو کسی طریقہ سے کارآمد بنالینا

اس سلسلہ میں یہ لازم قرار دیا جاتا ہے کہ قبضہ کرنے کے بعد تین سال کے اندر وہ شخص اس کو کارآمد بنالے ورنہ اس کی ملکیت زمین بوجہ سب کا یکساں حصہ ہو جائے گی۔ افتادہ زمینیں کارآمد ساق میں تین سال سے زیادہ عرصے سے عرصہ سے بے سند ہیں، وہ محض ہوسٹیں ہیں۔ تین سال کی مدت میں بات کو جانچنے کے لیے وٹا ہے۔ قبضہ کرنے والے کارآمد بننے پر قادر ہیں۔ اس وقت اس وقت اگر اس قدرت آبادت دینے والے کو بھی ملک نہ ملے تو اسے نو وقت و زمین دوبارہ جماعت کی طرف وٹا دی جائے گی اور کوئی فرد اس کا مالک نہ سمجھا جائے گا۔

عادی الارض لئود۔ سہ مدتہ لکھ من بعد لمن حب ارضاً میثا
فھی لہ، لیس لمجتہو حق بعد ثلث سنیں۔ ان بھی جو سب سے کناہل
میں سے مدت کو بیٹھ من عادیوں کے واسطے سے یہ پتہ کیا ہے،

و افتادہ زمینیں نہ اور اس کے سوا کسی ملک ہیں۔ اس کے بعد وہ ممالک میں صاف
پوچھیں کہ کسی وقت وہ زمین کو کارآمد بنالے وہ زمین بوجہ سب کے حصے کی ہے۔ کسی ہاتھ سے
والے ہاتھ میں حال بعد و حق نہ تسلیم کیا جائے گا۔

اس معاملہ میں سدھ میں قانون آٹ کے اس خود ساختہ قانون سے بہتر ہے جو انڈیسی قانون
کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ اس قانون میں صرف چند سال تک قبضہ کو اس بات کے لیے کافی تسلیم کیا
گیسا ہے کہ زمین قابض کی ملکیت قرار پائے خواہ وہ اسے کارآمد بنائے، اس عرصہ میں اور اس کے بعد
جس اُسے یونہی ناکارہ چھوڑے رہے۔ یہاں حق ملکیت دینے میں جو حکمت کام کر رہی ہے وہ محض ایک منفی حکمت
ہے اور صرف صورت واقعہ کو قانون تسلیم کرنے کا نظریہ فیصلہ کن بن رہا ہے۔ یہاں اسلامی نظریہ اور
خود ساختہ قانون کے نظریہ کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔

۳۔ زمین کے اندر جو کانیں (رکاز) ہیں اُن کو نکالنا

کان سے جو کچھ نکلتا ہے اس کا $\frac{1}{5}$ حصہ نکالنے والے کی ملک قرار پاتا ہے اور $\frac{4}{5}$ ازکوۃ کیونکہ یہ دنیویہ صدقہ مباح تھا جسے فوج و محنت مشقت کے حاصل کرتا ہے۔

یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ درحقیقت جس وقت یہ حکم صادر کیا گیا تھا اس وقت تک رکاز سے جو کچھ نکال لیا جاتا تھا وہ صرف قلیل اشیاء معدنیات تھے۔ مثلاً سونا اور چاندی۔ اور یہ چیزیں پتھر و لکڑی کی طرح کی نہیں تھیں جن کی ضرورت مندرساری جماعت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پتھر و لکڑی کو نکالنا اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کو پانی لکھا اس اور آگ جیسی مشرک و رزق کی ضروری چیزوں پر قیاس کیا جائے گا یا ان رکاز پر جو اسلام کے ابتدائی دور میں معروف تھے۔

اس مسئلہ میں ہم مائیکہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں جس کے مطابق یہ اقسام دولت ملکیت عامہ قرار پاتی ہیں اور ان کی ملکیت اس زمین کے مالک کی طرف نہیں منتقل ہوتی جس سے کان برآمد ہو۔ کیونکہ زمین کا مالک ہونا اس کے اندر پانی جسنے وہاں حیوان کی ملکیت کو مستلزم نہیں جب کہ زمین کی ملکیت یا اس کی طلب عام طور پر ان قانون کے لیے نہیں ہوتی۔

۴۔ خام مواد سے مصنوعات کی تیاری

اس سے زندگی کی کوئی ضرورت پوری ہو اور ایسا مادہ حاصل ہو سکے جو اس کے خام مواد ہونے کی وجہ سے نہیں حاصل کیا جاسکتا تھا یا اس میں ایسی خصوصیات کا فقدان جس سے وہ پہلے سے زیادہ مفید ہو جائے۔ اس میں مختلف انواع کی محنت کی اہمیت نہایت ہے۔

۵۔ تجارت

اس کے مختلف مراحل ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ۔ سارے معاملے ایک ہی آدمی طے کر لے اور یہ بھی کہ متعدد افراد مل کر اس معاملے کو طے کریں۔ بالآخر جو مقصد حاصل ہوتا ہے وہ خام مال یا مصنوعات کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہونا ہے، جس کے نتیجے میں اس خام مال یا تیار شدہ سامان سے زیادہ فائدہ اٹھانا ممکن ہو جاتا ہے۔

۶۔ اجرت کے عوض کسی دوسرے کے لیے محنت کرنا۔

اسلام اس طرح کی محنت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کی اجرت کو بلا کسی تاخیر اور بلا کسی تخفیف کے پوری پوری ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ خود قرآن عمل پر اکساتا ہے اور اُسے نکال ہوں کا مرکب اور

فور و فکر کا مقابلہ کر دیتا ہے۔

وَقُلْ أَغْنَىٰ اللَّهُ عَنْكَ رِزْقَهُ رِشْوَتُ الْكَافِرِينَ ۝ ۱۵

”کہا دیجئے کہ میں نے اس سے اس کی ریشوت سے جس کا وہ کفر کر رہا ہے“

اس آیت میں وہ مال جس کو وسیفہ و رزق سے دے دیا گیا ہے۔ بھروسہ ہے۔ بھروسہ محنت کی تعمیر یافتہ ہے اور اسے معاہدہ کرنے، خورد و خوراک، اس کے نفع کے لئے، تنہا دینا نہیں چاہئے بلکہ اس کے لئے دیا گیا ہے۔ یہ مال جو فلاح میں اور اس کی فلاح میں جو چاہئے یہ مال ہے

فَاغْنَىٰ عَنْكَ اللَّهُ رِزْقَهُ ۝ ۱۵

”اس سے اس کو رزق دے گا“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محنت کا رتبہ بلند ہونے کے باعث اس میں متعدد احادیث منقول ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ الْمُوْتِمِرَ ۝ (اس حدیث کو

قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے)

”اللہ اس بندہ مومن کو عزیز رکھتا ہے جس کی پیروی کے درپے اپنی رزق کرتا ہو۔“

ما اكل احدكم طعاما قط خيرا من عمل بد ۝ (بخاری،

”پنہ ہر کھانے کا سب سے بہتر کھانے کا کھانا ہے۔“)

محنت کی قدر و منزلت اور اس کی بزرگی۔ ”اللہ اس کی نظر تیری بنیاد پر اس کو دے گا“

حق اُجرت کو ایک مقدس حق ہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی تمہین کرتا ہے۔ اور جو کوئی محنت کشوں کو یہ حق دے دے، اسے وہ حق دے گا، ہے کہ

ایسا کرنے والا دراصل اللہ سے لڑائی کر رہا ہے اور اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: قال اللہ عز وجل: ثلاث

انا خصمهم يوم القيامة ۝ رجل اعطى بئرا ثم سدّها ۝ رجل

باع حرّا فافّا کل ثمنه ۝ رجل اسنا جراجیرا فاستوفى منہ ولم

يعطه ۝ جرک (بخاری،

”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تین طرح کے

وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ
وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ (الأنفال: ۴۱)
معاں نور جو چیز میں تم کو غنیمت کے طور پر حاصل ہوں اُن کا ۱/۵ اللہ کا، اس کے رسول
رسول کے ذریعہ داروں، یتامی، مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے۔

۸۔ سلطان کا اُن زمینوں میں سے کسی کو کچھ عطیت
کے طور پر دے دینا جن کا کوئی مالک نہ ہو

اور جو اُردت زمینیں مشرکین کی طرف سے جن کا مس پرست نام و رپا تاج، بیت المال
میں آئی ہوں، یا سیطرت ان ناکارہ زمینوں میں سے جن کا کوئی مالک نہ ہو، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ
و سلم نے حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ کو زمینیں عطا فرمائی تھیں۔ آپ کے بعد خلفاء بھی عطیت
کے طور پر زمینیں دیتے رہے ہیں۔ یہ عطیہ اسلام کا کسی خدمت یا کسی نمایاں کارنامہ کے صلہ میں دیے
جاتے تھے لیکن بیت محمد و بیت نبی نہ ہوتا۔ اُردت انہی زمینوں میں سے جو یا تو ناکارہ ہوں یا اُن کا کوئی
مالک نہ ہو۔ جب ہی بیتہ کار نہ نہ تیا تو انھوں نے لوگوں کو نوٹا اور زمین کے عطا یا اپنے عزیز و اقارب میں
تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے کہ جیسا کہ آگے تفصیل سے آئے گا یہ لوگ خلفائے راشدین میں
سے نہ تھے بلکہ ان کا شمار ظالم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

۹۔ بقائے حیات کی خاطر مال کا محتاج ہونا

چنانچہ اسلام نے زکوٰۃ کے بارے میں متعین شرائط بیان کیا جاتا ہے اور یہ ہے :
أَنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ الْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَ
الْمَوْلَىٰ فَكَوْنُكُمْ فِي الْبِرِّ قَابِ وَأَنْتُمْ رَمَىٰ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَابْنِ السَّبِيلِ ط (التوبة: ۶۰)

”صدقات کے مستحق وہ فاقہ و مساکین و مصروفات کی تفصیل تقسیم پر مقرر
کر دہ کارندہ سے ہیں، اوردہ لوگ حق کی تالیف قیاس بقصد ہوں، و اگر کہیں نے
میں، بقصد نفس کی مدد کرنے میں، اسد کی راہ میں مسافروں پر بھی صدقات میں سے
صرف کیا جائے گا۔“

نفس کی صفائی، غیری کی تطہیر، سب اسی پر مشتمل ہیں۔ تزکیہٴ روحانی، جسم کو تقویت پہنچانے اور سستی، کالہی اور کمزوری کے عناصر سے انسان کو بچانے رکھنے وغیرہ امور جس حسن و خوبی کے ساتھ محنت کے ذریعہ انجام پاتے ہیں کسی دوسرے ذریعے ممکن نہیں۔

جب تک حصول ملکیت کا واحد ذریعہ "عمل" کی مختلف صورتیں ہوں، انفرادی ملکیت کا ان حدود کے اندر تسلیم کیا جائے جن کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے کسی کے لیے ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ فرد کو اس بات پر اجازت دیتا ہے کہ اپنی امتیازی کوششیں بھی کرے۔ اس طرح اسے اس بات کا موقع ملتا ہے کہ تدریجاً حدود میں رہتے ہوئے اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچاتے ہوئے اپنے قبضہ میں مانے وراثت کی ملکیت میں رکھنے کے رجحانات کو پورا کر سکے۔ اگر وہ ان حدود سے بھی بزرگ نہ ہو تو صنفِ مذکورہ یہ ہے کہ اسے حدود کے اندر واپس آنے پر مجبور کیا جائے نہ یہ کہ اس کو بے حد کی طرف گریز سے روک کر پست قیمت گنہگار اور کم قدر استعداد رکھنے والوں کے برابر کر دیا جائے۔ یہ طریقہ مناسب نہ ہو گا کہ غنہ استعمال کو روکنے کے بہانے فرد کو سرے سے حق ملکیت ہی سے محروم کر دیا جائے۔ کیونکہ غنہ استعمالات کا علاقہ ممکن ہے اور ضرورت کے مطابق مداخلت کر کے اسے روکا جا سکتا ہے۔

ملکیت کے اسی نظریہ کا نتیجہ ہے کہ اسلام اتحقاق ملکیت کے طریقوں میں بھی مداخلت کرتا ہے اور فرد کو اس سلسلہ میں بالکل آزاد نہیں چھوڑتا، خرید و فروخت اور دوسرے معاملوں، وراثت اور وصیت کے ضابطوں سے بھی یہ حقیقت ظاہر ہے۔ صرف یہ اور بدیہ کو تو قید سے آزاد رکھی گئی ہے اور صاحب مال کو اس بات کا پورا اختیار دیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں اپنے مال جس کو چاہے بیکر کر دے یا ہدیہ دے۔ اس گنجائش کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں طبیعت خود ہی ایک روک تھامت ہوتی ہے اور صاحب مال اپنے مال کا ایک حصہ ہی بدیہ یا بیکر کے طور پر دیتا ہے۔ اس سے وراثت کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ یہی مال وصیت کا بھی ہے۔ اب اگر وہ اس وقت پر ترستا ہے تو اسے بیکر یا تصدق کرنے والا قرار دیا جائے گا اور اس پر قانونی پابندی عاید کی جا سکے گی۔ یعنی اسے اپنی ملکیت میں تصرف کے حق سے محروم کیا جاسکے گا۔

مالک کے قبضہ کا اٹھنا اور مال کا اس کے بعد وراثت یا جن لوگوں کے حق میں وصیت کی گئی ہو ان کی طرف منتقل ہونا ایک مقرر ضابطہ کے تحت عمل میں آتا ہے جس کی حکمتیں علیحدہ ہیں۔ چنانچہ کسی

اب یہاں ہم نظام وراثت کی ان حکمتوں پر غور کریں گے جو خصوصیت کے ساتھ اجتماعی پہلو سے متعلق ہیں۔

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام دولت کے ارتکاز اور اس کے ایک طبقہ کے اندر محدود و مکرر نہ جانے کو پسند نہیں کرتا اور اسلام کا نظام وراثت پشت در پشت جمع ہونے والی دولت کی تقسیم کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ چنانچہ اس کے ذریعہ ایک ملکیت محقق، ملک کی وفات سے اس کی متعدد اولاد اور اعزہ کو مستقل ہو جاتی اور اس طاق چھوٹے چھوٹے یا متوسط طبقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس سبب سے ہم جانتے ہیں کہ اس ضابطے کے باوجود ملکیت جیسوں کی توں رو جائے ان شاندار و نادر پیش آنے والے حالات کے لیے کوئی اصول بنانا ممکن نہیں رہتا۔ یہ کہ مالک کی وفات ایک ہی یا تھوڑے لوگوں کی وفات یا بے جو اس کے سارے ترک کا وارث قرار پا جائے گا۔ یہ کہ متوفی کے باپ، ماں، بیوی اور لڑکیاں سے کوئی زندہ نہیں رہا۔ زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ دولت متفرد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

جب ہم اس ضابطہ کا دوسرے ضابطوں مثلاً انگریزوں کے ضابطہ سے متعلقہ ہوتے ہیں جو ترک کا تمام تر مستحق بڑے بڑے حصے کو گردانتا ہے تو ہم پر اسلام کی یہ حکمت کہ وہ جمع شدہ دولت کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اسلامی ضابطہ میں دولت کے مابین جو عدد ملحوظ رکھا گیا ہے وہ اس پر مستزاد ہے۔ اس کا مدد صرف بڑے بڑے حصے کے لیے مخصوص نہیں۔

ملکیت کو نمونہ بخشنے کے طریقے

ملکیت دولت کی بابت اسلام جس نظریہ کا قائل ہے اس کے تحت اس نے مال کے ذریعہ مزید مال حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے طریقوں میں بھی مداخلت کی ہے۔ وہ مالک کو اس بات کی کھلی تمہید نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں من مانی کرتے رہیں۔ کیونکہ خود کی ذاتی مصلحت کے پہلو پر پہلو اس جماعت کی مصلحت بھی قابل لحاظ ہے جس سے خود معاملات کرتا ہے۔

چنانچہ ہر فرد کو مال کے ذریعہ نفع کمانے کا پوری آزادی ہے۔ لیکن قانون الہی کے مقرر کردہ حدود کے اندر۔ اسے پوری آزادی ہے کہ زمین میں کاشت کرے۔ خام مال کے ذریعہ مصنوعات تیار کرے تجارت کرے وغیرہ وغیرہ۔

علیہ وسلم اِنَّہٗ قال : لا یكسب عبدٌ مالا حراما فیتصدق
منہ فیتقبل منہ ولا ینفق منہ فیکسب لہ فیك۔ ولا یتركہ
خلف ظہرہ۔ الا کان زادہ الی النار۔ ان اللہ لا یجھو السیئ
بالسیئ ولكن یمحو السیئ بالحسن۔ ان الخبیث لا یمحو الخبیث
(ذکرہ صاحب معایج السنۃ فی الصحاح)

”عبداللہ بن سعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے
فرمایا: ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص حرام مال کماے اور اس میں سے صدقہ خیرات
کرے نودہ رحمۃ اللہ قبول کر لیا جائے یا وہ اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت
ہو سکے۔ وہ ایسے مال کو اگر اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو یہ اس کے لیے راہ جہنم کا توش
ثابت ہوتا ہے۔ اللہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو اچھائی کے ذریعہ مٹاتا
ہے۔ درحقیقت ناپاک چیز ناپاک چیز کو دور نہیں کر سکتی

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

انا کلا یربو لحم نبت من سمحت ۲ لا کانت النار اولیٰ
(ترمذی۔ نسائی)

”مال حرام پر بلا ہو گوشت (جسم) یروان نہیں پڑھتا بلکہ اس کا اصل ٹھکانا جہنم
کی آگ ہے۔“

اس باب میں اسلام کی پالیسی اپنے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ وہ جان کی ریسائی
کا ستر باب کرنے اور لوگوں کے درمیان باہمی تعاون کی اسپیشل پیدا کرنے کے بنیادی مقاصد کو یہاں بھی
اپنے سامنے رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو دھوکہ دہی ایک طرف تو نفس کی کثافت ہے، ساتھ ہی یہ
دوسرے کی نہ رسانی کے بھی ہم معنی ہے۔ بات تو اس طرح ایک ایسی فضا بن جاتی ہے کہ ہر ایک دوسرے
پر اعتماد کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اعتماد باتیم کے بغیر کسی گروہ میں تعاون کا سوال ہی نہیں
پیدا ہوتا۔ پھر دھوکہ دہی کا مال ہی تو ہے کہ بلا کسی معقول اور جائز کوشش کے کچھ مال ہاتھ لگ جائے
جب کہ اسلام کا عام اصول یہ ہے کہ کوئی ٹمرہ بلا محنت نہیں، اور اسی طرح کوئی محنت نہیں جو راسخاں ساتھ

اور اپنے ثمرہ سے محروم رہے۔

۲۔ اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی کو اسلامِ دولت کمانے اور اس میں اضافہ چاہنے کا جائز طریقہ نہیں تسلیم کرتا۔

من احتكر فهو خاطي (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

”جس نے احتکار کیا وہ غلط کار ہے۔“

وجہ یہ ہے کہ احتکار صنعت و تجارت کی آزادی کا خون ہے۔ کیونکہ اجماعاً در Monopoli

کو یہ گورہ نہیں ہوتا کہ وہ بھی بازار میں اسی جیسا مال لائے یا اسی جیسی مصنوعات تیار کرے۔ وہ تو بازار پر اپنا جور کھڑا کر چاہتا ہے تاکہ لوگوں سے من مانی قیمتیں وصول کر سکے اور قیمتی لوگوں کو ہر طاقت کی شدت و رنگی ہنسٹا کر کے ان کا جینا دو بھ کر دے۔ وہ دوسروں کے لیے اس بات کے مواقع ختم کر دیتا ہے کہ وہ بھی اسی طاقت کی روزی کما سکیں یا اس تنگ وڈ میں اس سے زیادہ سرگرمی کھا سکیں۔ چنانچہ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ احتکار کرنے والی دولت کے ذخیروں پر مسائب بن کر بیٹھ جاتا ہے اور زبرد سامان کو تلف کر دیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طاقت ایک خاص نرخ کو لوگوں پر مسلط کر سکے۔ یہ طرز عمل عربیہ طور پر مسائب و معیشت کے ان سماجی خزانوں کی بربادی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے فائدے کے لیے زمین میں پیدا کیا ہے۔

کسب مال کے اس ذریعہ کا سد باب کرنے کو اسلام نے اتنی اہمیت دی کہ احتکار کو دترہ دین سے خارج کرنے والا جرم قرار دے دیا:

من احتكر طعاما اربعین یوماً فقد برئ من اللہ وبرئ اللہ منه

(مسند امام احمد)

”جس نے چالیس دن تک سامانِ غذا کو ذخیرہ کیے رکھا اس کو اللہ سے کوئی واسطہ

نہیں نہ اللہ کو اس کی کوئی پروا ہے۔“

ایسے شخص کو مسلمان تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا جو جماعت کی دشمنی میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنی ذاتی نفع اندوزی اور اس طرز اپنے خزانہ میں انسانہ کی خاطر اجتماعی مصالح کو دانستہ مجروح کرتے ہوئے سماج میں مصنوعی طور پر خوف اور احتیاج پیدا کر دیتا ہے۔

۳۔ سودی کاروبار بھی افزائش دولت کا ایک حرام ذریعہ ہے جسے اسلام واضح طور پر قابل نفیس قرار دیتا ہے۔ وہ اس کی جہالت واضح کرتے ہوئے اسے اپنانے والوں کو بدترین انجام کی خبر سناتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۱۵۰ ال عمران : ۱۳۰)

”اے اہل ایمان! دو گنا چوت گنا کر کے سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو کہ ... نجات پاب ہو سکو“

یہاں مقصود صرف دو گنے، چو گنے سے روک کر سود کی معمولی شرحوں کو سند جواز عطا کرنا نہیں، یہ صرف احوال واقعی کا بیان ہے، اور جو کچھ اس وقت عیب میں، مذکور بات اس کی تفصیل ہے۔ جیسا کہ دوسری آیات سے واضح ہوتا ہے نفیس سود کی ممانعت مقصود ہے :

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقْوَمُ الَّذِينَ يَخْبِطُونَ الشَّيْطَانَ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَخَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا مَنْ جَاءَهُ مَوْثِقَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَأَنْتَقَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمَّا مَرَأَىٰ إِلَى اللَّهِ وَالَّذِينَ عَادُوا فَلَيْلٌ أَضْحَىٰ النَّارُ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (البقرة : ۲۷۵)

”سو، خوار کا حال اس شخص کا سا ہے جس کو شیطان (جنوں) نے اپنے اثر سے غمہ اجواں بنالیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ بیع کا معاملہ بھی سودی معاملہ کی طرح ہے۔ مگر اللہ نے بیع کو حلال اور سودی معاملات کو حرام قرار دیا ہے اب جس کو اس کے بپ کی نصیحت اس باب میں پہنچے اور وہ آئندہ سودی معاملات سے باز آجائے تو جو کچھ سودی معاملہ پہلے ہو چکا وہ اس کا ہے۔ اور اس باب میں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔ اور جواب بھی یہ حرکت کرے گا تو ایسے دگ جنہی ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ

سُوْرَةُ مَائِدَةٍ ۝ وَنَاذِرًا يُبَيِّنُ لِلنَّاسِ اَلَّذِي هُوَ سُوْرَةُ مَائِدَةٍ ۝
تَبَيَّنَ مَعْنَاهُ : اُوْرُسُ اَلْمَاكِهَةِ : وَنَاذِرًا يُبَيِّنُ لِلنَّاسِ ۝

(البقرہ: ۲۴۹-۲۵۰)

۱۔ بن بیان، منہ سے، ۲۔ جو کچھ سودی مطالبات باقی رہ گئے ہیں انکو
درتقیف میں جو چھوڑ رہا ہے وہ سود نہیں کرتے تو تمہیں شہ اور اس کے حوالے
سے ہنگامی دیکھنی پڑتی ہے۔ کرتہ خرید کر دھو اور سودی معاملات سے باز آ جاؤ۔
۳۔ مبادیہ سے مبادیہ (Principle) مبادیہ سے مبادیہ وہ سود نہیں ہے، تو
تو زیادتی کرو مبادیہ سے مبادیہ کی وجہ سے۔

۴۔ کی مذمت و رس کے احتساب کی نہیں میں اسلام یہاں تک آگے جاتا ہے کہ اس معاملہ
میں جو کوئی کسی شے بھی شریک ہو، پاپ ہے اس کا دست دین لکھنے، مہویا میں پرگو اہی دینے والوں ان
سب پر وہ لعنت بھیجتا ہے :

عن حابر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کل اولاد
مکملہ کا شہدہ و شہادہ بدو قال حد سواء (مسلم)
۵۔ حد بجا رہے مہدی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سادگانے والے
کھلانے والے در اس کی دستاویز لکھے والے، اس پرگو اہی دینے والوں سب پر
لعنت بھیجی ہے اور فرمایا یہ سب برابر ہیں :

۶۔ تمام امور میں اسلام میں بنیادی اصولوں کے مطابق یا ایسی اختیار کرتا ہے جو مال و دولت
اخلاق اور صلح عامہ کے سلسلہ میں اس کے سامنے ہیں اس کے نزدیک دولت صاحب
دولت ہے (تر میں ایک امانت ہے اور وہ اس پر پوری جماعت کے مفاد کا نگران قرار دی گئی
ہے اسے لوگوں کو نقصان پہنچانے اور ذاتی منہ کی خاطر اس امانت داری کو پس پشت
ڈال دینے کا کوئی حق نہیں کہ وہ اشیاء ضرورت منہ کی گھڑی کا منتظر ہے۔ ان کی کمزور
پوزیشن سے بے با فائدہ اٹھانے اور جو کچھ انہیں دیتا ہے اس سے بڑھ چڑھ کر معاد و حصول
کرے۔ ضرورت بقسم فی ہوتی ہے کبھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے جس پر زندگی کی گاڑی کے آگے

کھینکنے کا انحصار ہے تو کبھی علاج کے لیے دوا کی یا حصول علم یا کسی اور ضروری کام کے لیے اخراجات کی۔ اس طرح یا تو یہ سارے کام یونہی پڑے رہ جائیں گے یا دولت مند لوگ ضرورت مندوں پر اپنا حکم چلائیں گے۔ اس کو تھوڑا دے کر اس سے بہت سا واپس لیں گے اور اس طرح اس کی محنت کا حق ۱۰ بیٹھیں گے وہ بے چارہ محنت مشقت برداشت کئے جائے اور نتیجہ صرف یہ نکلے کہ یا تو ساری کی ساری کمانی سود ادا کرنے میں سود خواروں کا تدر ہو جائے یا سال بسال قرض میں اضافہ ہوتا جائے۔

یہ زائد از ضرورت دولت جس سے صاحب مال فائدہ اٹھاتا ہے _____
 دریں حاسیک وہ کرتا کچھ نہیں بس اس المال Principal اس کا ہوتا ہے _____
 یہ دراصل خون اور پسینہ ہوتا ہے جس کو یہ کمال حیوانیت سے چاٹ رہتا ہے اور بیٹھے ہی بیٹھے دھباً طور پر چوستا رہتا ہے۔

اسلام جو محنت کی عظمت و تقدس جتلاتا ہے اور اُسے ملکیت اور نفع کی اساس قرار دیتا ہے اس بات کو زوا نہیں رکھتا کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے والے فرد مال کا حق دار ٹھہرے یا دولت و دولت کو جنم دے۔ دولت کو صرف محنت جنم دے سکتی ہے۔ بصورت دیگر وہ مال حرام قرار پاتا ہے۔

اسلام فرد کی اخلاقی پاکیزگی اور جماعت میں باہم میل و محبت دونوں کو پوری اہمیت کے ساتھ سامنے رکھتا ہے۔ درحقیقت نہ تو کوئی صاحب خیر اور شریف انسان سود خوری میں ملوث ہو سکتا ہے نہ یہ ممکن ہے کہ کسی جماعت میں سود خوری کی لعنت عام ہو جائے اور پھر بھی اس کے افراد میں باہم انس و محبت باقی رہ جائے۔ جو شخص مجھے ایک دینار صرف اس لیے دیتا ہے کہ اُسے دد دینا کر کے مجھ سے واپس وصول کر سکے وہ درحقیقت میرا دشمن ہے۔ میں کبھی اپنا دل اس کی طرف سے صاف نہیں رکھ سکتا اور نہ اس کی محبت میرے دل میں جگہ پاسکتی ہے۔ تعاون اسلامی سماج کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اور سود اس اصول کا دشمن واقع ہوا ہے۔ وہ اس بنیاد کو ڈھلوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔

حرمت سود میں ایک اور حکمت مضمربے جو ہم پر آج دور جدید میں منکشف ہو رہی ہے اور

منوع قرار دے کر۔ لیکن اس مداخلت کے حدود انسانوں کے اپنے اختیار اور ان کی خواہشات متعین ہوتے ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ کی سندر کھنے والے کسی معترضہ اصول کے تحت۔

مدیر برآں اس کی تہیں یہ غلط اور فساد انگیز تصور کام کر رہا ہے کہ انسانی وجود کا آخری مقصد کسی نہ کسی طریقہ سے مال حاصل کر کے خواہشات نفس کے مطابق اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد مال حاصل کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے چھپے پھر جاتا ہے اور اس راہ میں ہر اصول اور دوسروں کی ہر مصلحت کو ہال کرنا چلا جاتا ہے۔ بالآخر اس سے ایک ایسا نظام جنم لیتا ہے جو انسانیت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے اور انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی ہر سطح پر انسانی زندگی کو چند سوہ خواروں کے فائدہ کی خاطر نانووش و ناماد بنا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ نظام حیات انسانی کو اخلاقی، نفسیاتی اور اعصابی اعتبار سے پست کر کے دولت کی گردش اور انسانی معیشت کی موزوں ترقی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ بالآخر اس کا انجام دو یہ حادثے انجام کی طرح یہ ہوتا ہے کہ یوری انسانیت پر حقیقی اقتدار اور عملی اختیار چند بدترین اور پست ترین گرد ہوں کے ہاتھوں میں مگوز ہو جاتا ہے۔ خلق خدا کے یہ بدترین افراد انسانیت کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے، اس کے بارے میں کوئی بھی ذمہ داری نہیں محسوس کرتے۔ یہ کسی عہد کا پاس رکھتے نہ کسی انسانی قدر کا لحاظ کرتے ہیں۔

یہ وہ افراد ہیں جو افراد کو بھی قرض دیتے ہیں اور حکومتوں اور قوموں کو بھی۔ اپنے ملک میں بھی اور ملک کے باہر بھی۔ ساری انسانیت کی محنت کا اصل حاصل اور انسانوں کی خون پسینہ ایک کی ہوئی محنت کے نتائج چہاں طرف سے کھینچ کر ان کے قدموں میں آتے ہیں۔ اس سود کی شکل میں جس کے پیدا کرنے میں انھوں نے فدا بھی محنت نہیں کی ہوتی ہے۔ انھیں صرف مال و دولت نہیں ملتی بلکہ نغز و درسون بھی حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ کسی اصول یا اخلاق کے حامل نہیں ہوتے، نہ کوئی اخلاقی یا دینی تصور رکھتے ہیں بلکہ دین و اخلاق اور اصول و مقاصد کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں، لہذا قدرتی طور پر اپنے اس زبردست اثر و نفوذ کو ایسے حالات پیدا کرنے، ایسے افکار کو فروغ دینے اور ایسے طریقے رائج کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جن کے طفیل ان کے لیے یہ نفع کمانا اور اس تحصیل کرنا ممکن ہو سکے۔ اپنی حرص پوری کرنے اور ان کمینہ مقاصد کو حاصل کرنے کی راہ میں یہ کہیں بھی نہیں رکھتے۔ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کے اخلاق خراب ہوں اور وہ لذت کوئی اور ثبوت پرستی کے دلدل میں جا گریں کہ اس کی

خاطر بہت سے لوگ دنیا آخری میسہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ میسہ ان کی جیبوں میں آتا ہے جنہوں نے اس دنیا پر یہ سارے جال پھیلا رکھا ہے۔ سنا ہے کہ یہ لوگ دنیا کے معاشی مورد معاملہ کو ایسے محدود مصارف کے مطابق جس طرح چاہتے ہیں میل تے ہیں۔ خواہ اس کے نتیجے میں کساد بازاروں کے دورے اور معاشی ملامت ہو رہے ہیں جن سے معاشیات کی دنیا خوب وصف ہے۔ ان کے اثر و رسوخ کے نتیجے میں معاشی پیداوار سارے انسانوں کے مصارف کے مطابق انجام پانے کے بجائے ان مال دار سود خوروں کے مصارف کے مطابق انجام پاتی ہے جس کے ہاتھوں میں دنیا بھر کی دولت کی باگ دوڑ آجاتی ہے۔

دور جدید میں ایک ایسی سرسختی واقع ہوئی ہے جو اس بڑی شعل میں وہ جہلیب میں بھی نہیں جیت سکتی تھی۔ وہ یہ کہ یہ سود خور جو پورے زمانہ میں بعض افراد و رمانی اداروں کی شعل میں پائے جاتے تھے اور آج جدید بینکوں کے ڈائرکٹر وغیرہ بن گئے ہیں، دنیا کے عوام کو اس معطلی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ سودی نظام ہی قدرتی اور معقول نظام ہے۔ ایسا کرنا اس زیر دست اثر و رسوخ کی بنا پر ممکن ہوا ہے ان سود خوروں کو بین الاقوامی دروں اور حکومتوں میں اور ان کے ہاتھ میں حاصل ہے۔ ساری دنیا کے ریل و سائل اور تعلیم و تربیت کے نظام پر ایسی لوگوں کا قبضہ ہے۔ خبرات و رسائل، کتابوں اور ان کی تعلیم دینے والوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور سینما گھروں، سب پر ہی چھائے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سود خور دنیا کے جن فریب عوام کا خون چوس رہے ہیں اور جڑیاں پیانے میں انہیں میں ٹھونکنے میں خیال رنخ کر دیا ہے کہ معاشی ترقی کی واحد صحیح بنیاد سود ہے۔ اس کے سوا کسی اور بنیاد پر معاشی ترقی ممکن ہی نہیں اور مغرب کی ساری تمدنی ترقی اسی سودی نظام کی برکت سے عمل میں آئی ہے۔ انہوں نے بہر مال کو باہر کر لیا ہے کہ جو لوگ سود کو ختم کرنا چاہتے ہیں وہ خیالی دنیا میں رہتے ہیں۔ انہیں عملی حالات سے کوئی واقفیت نہیں اور ان کی رائے کی بنیاد صرف اخلاقی نظریات اور ایسے آئیڈیلز کی طلب ہے جو دنیا کی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کی رائے کو اگر معاشی نظام میں دخل اندازی کا موقع دیا گیا تو یہ پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ آج جو لوگ سودی نظام پر تنقید کرنے میں ان کا مذاق وہ لوگ بھی اڑانے میں جو خود اسی نظام کے مارے ہوئے اور اس کے ستم رسیدہ ہیں؛ ان بیچاروں کا حال بھی وہی ہے جو پوری عالمی معیشت کا ہے جسے

دنیا کے سود خواروں کی ٹولیاں ایک خلاف فطرت غیر موزوں اور غلط راہ پر چلنے پر مجبور کیے ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں وہ مکمل طور پر کساد بازاری کے دوروں میں مبتلا رہتی ہے۔ اب اس معیشت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ پوری انسانیت کے لیے سود مند ہو، بلکہ وہ بھیڑیوں کے ایک ٹھنڈ کا شکار بن کر رہ گئی ہے۔

سودی نظام خالص معاشی زاویہ نگاہ سے بھی ایک ناقص اور مضر نظام ہے۔ اس کی مضریت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ اس کے مفاسد پہ خود مغرب کے بعض علمائے معاشیات کو تنبیہ ہو چکا ہے جو خود اس کے زیر سایہ پردان چڑھے ہیں اور جن کی تعلیم و تربیت اسی زہریلی فضا میں ہوئی ہے، جو دو تہذیبوں کی گولی ہندیہ و ثقافت در فکار و اخلاق پر شیعہ میں پیدا کر چکی ہے۔ اس نظام پر خالص معاشی زاویہ نگاہ سے تنقید کرنے والوں میں پیش پیش جرمنی کے عالم معاشیات ڈاکٹر شناخت ہیں جو جرمنی کے ریشہ بینک کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ دمشق میں ۱۹۵۳ء میں اپنے ایک لکچر میں

انہوں نے کہا تھا کہ وہ الجبرا کے ایک (لامتناہی) سلسلہ حساب کے ذریعہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا کی ساری دولت محدود ہے چند سود خواروں کے ہاتھوں میں کھینچ آنے والی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سود پر قرض دینے والا ہمیشہ فائدہ حاصل کرتا ہے جب کہ قرض لینے والے کو کبھی نقصان ہوتا ہے اور کبھی فائدہ۔ ظاہر ہے کہ ساری دولت بالآخر اس کے ہاتھوں میں آ جائے گی جس کو ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔ الجبرا کے ذریعہ یہی بات ثابت کی گئی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ عملاً ایسا ہی ہو رہا ہے کیونکہ آج دنیا کی بیشتر دولت کے اصل مالک چند ہزار افراد ہیں، باقی سارے اصحاب ملکیت اور کارخانہ دار جو بینکوں سے قرض لے کر کاروبار کرتے ہیں، اور ان کے مزدور و فیرہ سب انہی مال داروں کے تنخواہ دار ملازمین کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی محنت کے ثمرات ان چند ہزار افراد کو ملتے ہیں۔

سود کی مضریت اسی پر موقوف نہیں۔ معاشی نظام کے سود پر قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور صنعت میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان تعلق کی نوعیت دائمی طور پر باہمی کش مکش اور بارجیت کی بازی ہو جاتی ہے۔ سود خوار زیادہ سے زیادہ سود حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خاطر وہ سرمایہ کو روکے رکھتا ہے تاکہ تجارت اور صنعت کے جانب سے اس کی طلب میں شہرت پیدا ہو اور سود کی شرح بڑھ جائے۔ وہ اس شرح کو اسی طرح بڑھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ تاجروں اور صناعتوں کو یہ نظر آتا ہے کہ اتنی اونچی شرح سود پر سرمایہ حاصل کر کے سرمایہ کاری کرنے سے انھیں کوئی نفع نہیں حاصل

کاموں میں لگانے کے لیے گیلے تو اس پر جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ ٹمہ دراصل اس محنت کا ہے جو وہ خود کرتا ہے نہ کہ اس مال کا جو اس نے قرض لیا۔ کیوں کہ یہ مال بلا محنت نفع آور نہیں ہوتا اور اسلام میں اصل اہمیت محنت ہی کو حاصل ہے۔ سرمایہ کے ذریعہ نفع کمانے کی صورت صرف مضاربیت ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال رہتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر سود کو کسی حال میں جائز نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اپنی تدبیریات کے لیے قرض پا بننے والے کو قرض دنیا بہ حال لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اب اگر قرض لینے والے نے قرض لیا اور پھر تنگی ہی میں مبتلا رہا تو اسے ”فرائی تک مہلت“ دی جائے گی (فَنْظَرٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ)۔ یہی رائے میں یہ صیغہ حکم کے لیے ہے کیونکہ یہ شرط اور حجاب شرط کی شکل میں وارد ہوا ہے۔

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ ط (۱) بقرہ: ۲۸

”اگر (مقرض) تنگ حالی میں مبتلا ہو تو اسے فرائی تک مہلت ملنی چاہیے۔“

اس صیغہ کے استعمال سے حکم دینا مقصود ہے نہ کہ صرف ترغیب اور اتہار پسندیدگی۔

اس حکم کے پیرو پہلو اسلام نرمی برتنے اور سہولت سے پیش آنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

(حمداً للہ جلّ اسمعاً اذا باع و اذا اشتري و اذا قتل).

(بخاری، ترمذی)

”اس شخص پر خدا اپنے رحم و کرم کی بارش کرے جو بیرونیت میں خوش و خوار اور

سیدہ مندی برتتا ہے، رخصت کا تقاضا کرنے میں نرمی سے پیش آتا ہے۔“

قرض کے تقاضے میں نرمی اور رشتہ افست مقتضی کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھنے کا باعث بنتی ہے

اور اس کے دل میں قرض دینے والے کی محبت کے لیے جگہ بناتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ ابھارتی ہے کہ حق الامکان ادا کرنے کی پوری کوشش کرے۔ آپ نے فرمایا:

من سرکہ ان ینجیہ اللہ من کرب یوم القیامۃ فلینفس عن

معسر او یضع عنہ۔ (مسلم)

”جو قیامت کے روز کرب و اضطراب سے بچنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ تنگ حال

مفروض کی مستحکات رفع کرے یا اس سے جو مطالبہ ہو اس میں کچھ کمی کر دے :-
اور یہ کہ :

من انظر معصا ۱۱۱ وضع لہ 'اطلہ' اللہ یوم القیامۃ: نخت
نخل العرش یوم لا نفل الا ظلمہ - (تومذی)

جس نے تک سال مفروض کو مہلت دی یہ اس کے لیے کچھ کمی دے، جس فرض میں سے
کرمی سے مذقیامت کے دن عتق پائے گا، یہ نفل لے لیا، جب کہ اس دن بعد
اس کے سایہ کے کوئی سایہ میسر نہ ہو گا :-

اس کے باغیض اسلام فرض ذکر کا فرض تو ریتلے ہے کہ وہ فرض کو ذکر کرنے کی پوری یوری
کو شیش کرے تا کہ اس طاعت اپنی ذمہ داری سے بھی عبیدہ برآ ہو جائے اور فرض دینے والے کے
احسان کا بدلہ واپسی کے معاملہ میں وعدہ کا تپا ثابت ہو کر ادا کر دے۔ نیز اس کے اس طر عمل کا ایک
مزید فائدہ یہ بھی ہو گا کہ معاملات میں لوگوں کا باہمی اعتماد بڑھ جائے گا۔

من اخذ اموال الناس یرید ادا، ہا ادى اللہ عنہ و
من اخذ ہا یرید اتلافہا اتلفہ اللہ - (بخاری)
"جو ادا کرنے کی نیت سے لوگوں کا مال دقض، لیتا یا داند اس کی طاعت سے ایٹگی
کا بند و بست نہ مائے گا۔ اور جو ادا کرنے پرانے کی نیت سے لیتا ہے اس کو
بہرہ ہادی کے حوالہ کر دے گا۔"

چنانچہ جو ادا کرنے کی نیت سے قرض لے گا وہ نہ در کو شیش کرے گا کہ کچھ کمی سے اور روزی حاصل
کرے۔ اور عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ دھن کا بچاؤ و شرف کمانے میں کامیاب ہو جی جاتا ہے، اور
جو ادا کرنے پرانے کے خیال سے لے گا وہ دوسروں کے مال پر عیش کرنے ہی میں شغول جائے گا اور سعی و
جدد چھوڑ کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے گا۔ نتیجہ میں کاہلی اور شستی اُسے آدہ چے گی۔ اس کی تمت جواب
دے دے گی اور بالآخر وہ ناکامی اور تباہی سے دوچار ہو گا۔ اللہ کا رسول نہ مانتا ہے :-

صلی اللہ علیہ وسلم (رواۃ المختار)

"مال رکھنے والے کا واپسی قرض میں خواہ مخواہ تاخیر کرنا صریح ظلم ہے۔"

ایک شخص نے دریافت کیا کہ اللہ کے رسولؐ آپؐ کا کیا خیال ہے اگر میں روزِ خدا میں قتل کیا جاؤں تو اللہ میری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ہاں، بیشک۔ تو حاضرتہ لندہ لہر رہا ہو، جسہ و ثبات کا مظاہرہ کرے اور اسے قدم بہ قدم بڑھائے نہیں بکڑے آگے دائرہ کہتے ہوئے مارا جائے۔ یہ آپؐ نے اس شخص سے فرمایا کہ اگر پناہ سواں نہ ہو، اس نے سوال کو رد کیا، آپؐ نے فرمایا: ”ٹھیک ہے۔ لیکن قرض نہیں بخش جائے گا۔“ جواب دیا: ”تو ہمارے پاس گویا صاحبِ قدرت مفروض کے ساتھ قرض کا ہر قسم کی بات بھی نہیں ہٹ سکتا کہ وہ جہاد کرے اور خدا میں نقصانہ طور پر وجہ و ثبات کے ساتھ توڑے اور پیچھے ہٹ جائے جو نہیں جانتا مندانہ آدم کی بات میں مارا جائے۔ کیونکہ قرض کا تعلق دو۔وں کے حقوق سے ہے جو اس کے ذمہ ہیں۔ دین اللہ کا حق نہیں۔ یہ اس شکل میں جب کہ وہ اولیٰ قرض پر قادر ہو۔ رہا معذور اور عاجز آدمی، تو وہ زکوٰۃ میں سے ایک حصہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ... وَالْمَغْنَمِ۔ اس کو اوروں کے قرض کی خاطر صدقہ کے طور پر چھوڑنا بھی منسوب ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے یہی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے (کاروباری نقطہ نظر سے) بھلے کا ایک باغ خرید لیا۔ آفتِ سہابی کے نتیجے میں باغ تباہ ہو گیا۔ بے پیارہ بہت نقصان پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس شخص پر صدقہ کرنے کی تلقین کی۔ بچہ ہو گا سنے صدقہ کیا۔ لیکن سنا مال نہ ملتا جو سفاک پورا قرض... رہا سفاک۔ اس شخص نے صدقہ سے قرض خواہوں سے فرار کیا کہ حوصلہ خاں سے اسے جواب اور رد کیا، انہیں نہیں مل سکتا۔ ترجمہ:

جب پہلے درپے فتوحات کے نتیجے میں کالی، رات سے سب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھا قدم اٹھایا۔ اس آپؐ نے یہ دستور بنایا کہ منہ و حق افروگے سے کے عدال کے ذمہ کے فتنے مت لیں سے انکار کرنے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
یؤتی بالرجل المتوفی علیہ الذین فیسأل: هل ترک لدينہ
قضاء؟ فان حدث انہ ترک وہا، صلی علیہ، والا قال للسلیم

اور جب کوئی سورۃ اس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو نوا اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ کُن میں سے صاحبِ قدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ ہمیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھ جائے اور انھوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ ہیں۔

اسلام نے صاحبِ قدرت لوگوں کو مجاہدین کی صفوں سے پیچھے ہٹ جانے اور شیعہ رجسٹرڈ کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا پورا نمرہ اس وقت ہوگا جب ہم حیل طحیح جو ہیں کہ اسلام جہاد کو کتنی اہمیت دیتا ہے، اس کی کتنی ترغیب دیتا ہے اور جو لوگ خود سے اس کی طرف ہڑھیں نہ کو کتنے بلند تہ قرار دیتا ہے۔ پناہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزِ وَلَمْ يَجِدْ لِنَفْسِهِ غَزْوًا مَاتَ عَلَى شَعْبَةٍ
مِنَ النِّفَاقِ۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی)

”وہ شخص ایک کاذب نفاق کی حالت میں جس نے موت تک اللہ کی راہ میں جنگ

نہ کی، اور نہ اس کے دل میں اس کا کوئی ارادہ پیدا ہوا۔“

یہ چنداں تعجب کی بات نہیں کیونکہ عیش پرست کابل اور سہولت پسند ہوتا ہے۔ نہ اس میں مددگار ہائی رہنمائی ہے نہ قوت ارادی۔ اس نے محنت و مشقت کی عادت نہیں ڈالی لہذا اس کا جذبہ دروں سرد پڑ جاتا ہے۔ اس کی تمہیں پست ہو جاتی ہیں۔ جو چیزیں اس کو عزیز ہے وہ شہوانی لہذا نہیں۔ جہاد کے سلسلہ کی مشغلیں اسے کچھ عرصہ کے لیے ان حیوانی لذتوں سے محروم کر دیتی ہیں۔ اور ایسا آدمی بجز ان بے حیا اور فحش و ناکارہ اقدار کے زندگی میں کسی اور چیز کی قدر و قیمت سے آشنا ہی نہیں ہوتا۔

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ تاریخ انسانیت میں نہ فہم کا عمل کیا رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اس بدیت کی راہ میں روزانہ ثابت ہوئے ہیں جس کے در ان کے زیر دستوں کے لیے آئی ہے۔ جس سماج میں کچھ لوگ پیش پرست ہوں وہاں زیر دستوں کا ایک گروہ بھی مذوری ہے تاکہ وہ ان کی خوشامدی کر کے ان کے کبر نفس کو تسکین دے۔ محنت کر کے ان کی خواہشات پوری کرے۔ دس کی چاکری کرنا ہو کیڑے مکوڑوں کی طرح فنا ہو جائے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا

اور ان عیش پرستوں کے لیے غلغلہ و اضطراب تھا کہ اس وقت حکومتِ قبا نے کاموں میں باقی رہنا جس کے سبب وہ ان کے آزار و غلام بنے رہتے ہیں۔ اس بار وہ باہر خرافات اور بے بنیاد قصوں کو بھی ختم کر دیتا ہے جن کے ذریعہ وہ لوگ اپنے کو ایک دل بنالیتے ہیں اور میں امرہ اور غلہ مذہبیت رکھنے والے سماج میں انہیں مستحق سمجھتا ہوں کہ ایک نو تر حرج کے طور پر استعمال کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ہم ہدایت اور رہنمائی کے متمن ہوتے ہیں۔ عیش پرستی ضریحِ نفاق ہے اور ذاتی ہے اور نہ کسی کی زندگی انسان کے جذبات یا یہ کہ اس پر وہ خود شہادتیں دیتے ہیں کہ ان فراموشیوں کے علاوہ ہے۔

وَيَوْمَ يُعْطَرُ هَذِهِم بِعَبْدُونِ مِنْ دُونِ النَّبِيِّينَ وَالَّذِينَ
 أَتَلَّوْا كِتَابَ اللَّهِ هَؤُلَاءِ هُمْ صُورَةُ الْبَشَرِ هَؤُلَاءِ هُمْ
 مَا كَانَ بَيْنَ بَنِي آدَمَ أَنْ تَخْلُقَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْبَانٍ وَلَكِنْ مَتَّعْنَاهُمْ
 وَأَنَّا لَهُمْ حَتَّى نَسْأَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَا كَانُوا فَعَلُوا (الفصل ۱۰۰: ۸۰)

”اور ان کو جو کہ عیش پرست ہوں گے ان کو دوسروں کی عطر سے عطر کیا جائے گا جو ان کے ان معبودوں کو بھی بدستور کا نہیں آئے۔ نہ وہ عطر پر چڑھے ہیں۔ پھر وہ ان سے بچے گا کیا تم نے
 جس سے ان بندوں کو کہہ دیا تھا کہ یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟ وہ عرض کریں گے
 ”پاپ ہے آپ کی ذات، یہاں تو یہ محال ہے۔“ آپ کے سوا کسی کو پناہ مونی نہیں، مگر آپ نے
 ان کے پاپ کو خوب سامان کیا ہے۔“ یہی سبب ہے کہ ان کو بدستور سے بدستور ہے۔“

یعنی عیش و عشرت کے سامان جو دنیا میں ہر ایک پر ہے اور ان کے اندر سے دور نہ میں ملے ہوں
 انسان کو خاصے غافل کر دیتے اور ناکارہ بنا کر چھوڑتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ لوگ سر ہلکے ہو جاتے، ذرا ان کی
 تصویر کھینچ دی ہے۔ اس میں بڑے بڑے معافی و شیدہ ہیں۔ پھر ان قسط زدہ زمینوں کو کہتے ہیں جو کچھ
 پیدا کر کے نہیں دیتی ہیں۔ ان لوگوں کے ہاں ان کی طبیعتیں اور ان کی یوری زندگی اسی طاعتِ سخت اور شجہ ہوسا
 ہے۔ اب اس میں زندگی کی کوئی بھی حرکت نہیں ہوسکتی اور بس ساق

اللہ کا رسول مت نہیں کے کھانوں کو شیطان کے ٹھکانے قرار دیتا ہے کہ انہی سے نسا دھیڑتا ہے

اور وہیں پر مڑاٹھا ہے:

تَكُونُ أَهْلَ الشَّيَاطِينِ وَبِئْسَ لِلشَّيَاطِينِ فَا مَّا أَهْلُ الشَّيْطَانِ

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ تَرْيَیْءٍ ۖ بَطُوتٌ مَعِیْتَهُمْ ۖ فَتَنَتْ مِنْهُمْ

لَمْ تَسْكُنْ مِنْ ۖ بَعْدَ هَمٍّ ۖ لَا قَلِيلًا ۖ (قصص: ۱۵)

”اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ایسی غارت کر دیا جو اپنی معاشی حالت پر تارنے کی تھیں

تو یہ بستیوں کے گھر پر جو لوگوں کے جبریت بن گئے، بدبو لگ گئے۔“

عیش پرستی آخرت میں عذاب شدیدی سے وہ یاد دلاتی ہے کیونکہ اس کے سبب آدمی طاح

کے گناہوں سے آلودہ ہوتا ہے۔

وَأَصْحَابُ الشَّامِ ۖ مَا أَصْعَبُ النَّهَالَ ۖ فِي سَعَةِ ۖ وَحَمِيمٍ ۖ وَذَلَّ

مَنْ يَحْكُمُهُ ۖ الْبَارِدِ ۖ لَا كُنْ يَجِدُهُ ۖ انْقَضَ ۖ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتَرَفِّعِينَ ۖ

وَكَانُوا يُصَوِّرُونَ عَلَى الْجَنَّةِ الْعَظِيمِ ۖ وَكَانُوا يُفْتَنُونَ ۖ بَلَدًا مُمْتَنًا

وَكُنَّا عَرَابًا مُنْظَمًا ۖ أَنْ لَمُبَعُوثُونَ ۖ أَوْ أَنْ بَارِئًا ۖ لَا قَوْلُونَ ۖ

(الواقعه: ۱۴ تا ۱۸)

اور اہل شام والے، کیسے باریں جانب والے، بادِ سرد اور کھاتے و دہن میں۔

کے سایہ میں۔ جو نہ ٹھنڈا ہو گا نہ جھان۔ یہ لوگ اس سے پہلے دنیا میں خوش حال لوگ

تھے۔ یہ لوگ نہ دُشیدہ یعنی مسک و کفر پر مٹھ تھے۔ اور کہا کر سکتے تھے جب ہم کو

مٹی و ریشمی بن چکے ہوں گے وہیں پوٹا ٹھایا جائے گا۔ وہ نہ دے سکتے تھے۔ اور ان کو

بھی۔“

کیا یہ ذمہ داری تھی کہ ان کو غلبہ و فتنہ میں نہ رہنے دیا گیا کہ اس پوری کائنات

کو کھینچ لیتا ہے جو متغیر نہیں ہے۔ جو دیکھ کر غلبہ و رغبت کو اڑا کر قوت دیتا ہے۔

وَإِذَا أَرَادْنَا أَنْ نَخْلُقَ قَوْمِيَّةً ۖ أَمْرًا مُتَرَفِّعًا ۖ مُسْتَعِدًّا ۖ فَبِهَا نَحْنُ

عَلَيْهَا الْقَوْلُ ۖ فَذَلِكَ مَعْنَاهُ ۖ (النمل: ۱۰)

اے یہاں امران کے معنی کثرت، تعداد و حالت ہے۔ یہ مصنف جب یہ کہتا ہے کہ ہم نے

ہمارے لیے مصنف کی رائے سے اتفاق کرنا، متعلق ہے وقتِ قہر

رفتہ رفتہ یہ مرض زہنگی کے تر اور شعبہ میں پھیل جاتا ہے اور یہ نواب سب سے ایک
 ایسی صفات پر مبنی رہی تھی اور بے چارہ کی پوری قوم میں عام ہو جاتی ہے۔ ملک بے قیود با حقیقت
 ہر کس و کس کا شہرہ و ریوڑ ہے۔ لوگوں کے ذہن سر جہاں نہ لگے کس و انصاف کا شکار ہو کر
 ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اور روسی اور معنوی قی رہا ہے۔ نہ ٹھٹھی نے کھاتے۔ جب مسیحی و عیسوی
 میں جا گرتا ہے تو اللہ کی سنت کے مطابق وہ نخب و پاکست کو مستحق قرار دیتا ہے اور اللہ کی
 اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیتا ہے۔

یہ ہے سلام کی نظر میں جرم عیسیٰ پرستی کی تاریخ اور مسلمانوں کا انجام۔ یہ فراموشی پہلے چند ائمہ دینی
 کے درمیان میں نمودار ہوئی ہے۔ بعد میں جماعت سے خاموشی سے گورکھ پست کو یہ فساد پنے
 نت کی ساختے رہا ہے اور یہ جماعت کے جسم کو اپنے بار بار اثرات سے رت ہوئے ناسوز
 میں بدل دیتا ہے۔ مفدمات پر ناک کے منب ہوئے اور ذاتی اسباب پر مستببات کے
 انہور میں آنے کے قاعدہ کے تحت یہ فساد جماعت کو باندھ کر پراکت کرے اور میں قابل دیتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ الْإِسْلَامِ تَغْيِيرًا ۚ (الاحزاب: ۶۲)

اور تم نہ پائے گے اسلام کی روایت کو تغیر سے۔

میان پر سوال پیدا ہوا ہے کہ عیسائی و غلطی کے حدود کیا ہیں اور ان کے مابین
 اعتدال و توسط کی راہ کیا ہے؟

جب ہم اسلام کے تین درجہ کو دیکھیں گے کہ پہلے میں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ مسلمانان
 اور غلطی اور دوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عام ہے۔ ہیں معلوم ہوا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 نے لوگوں کو ریشمی لباس پہننے سے منع فرمایا:

مَنْ لَبَسَ الْحَرِيرَ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَأْبُدْ فِي الْآخِرَةِ ۖ

جس نے دنیا میں حریر پہنا وہ آخرت میں نہ رہے گا۔ (تفسیر: ۱۰۰)

در علی کریم اللہ و جہہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ

کڑا لہجے، دہانے کی گونگی سے روک دیں۔ ہر جگہ عرف و ادب کے یہ بھی۔ حور و ناز کے یہ
 رستی ہاں اور سہارے کے روبرو ہاتھ دلا کر کہے۔ ”گھر میں سہارے ہیں پسہ کیا تپ
 ن میں ہوا دیں ہاں رخی نہ تھی صبا، سہارے کے روبرو ہیں۔ میں ہاں شمع کی گونگی ہے آپ
 صلی اللہ علیہ وسلم نے چہ نعم ہوں گے یہ دہانے میں ہوں گے یہ سہارے ہاں ہاں ہیں تو
 دیا تھا۔

ہمارے نزدیک مکتبہ مودودی کے لئے ہوں گے ہاں گھر کے حور و ناز
 کا تقاضا نہ ہو تو اسلام بذات خود خستہ من خستہ گونگی کی دعوت نہیں دینا۔ پھر یہ بھی یک
 حقیقت ہے کہ ہمیں درشتی کے اور رستی یا نقش و نگار سے آراستہ ہاں ہونے سے
 مردانہ اعتبار کی سائنس اور اس کا اثر وجودات ہوتا ہے۔ جسے ہاں سے نہ میں میں کوثر اور
 جہل پسندوں کو دیا ہے۔ میں میں حور و ناز۔ ہاں میں اور یہ ایسی شکل میں جب کہ تباہی کے
 اقتصادی حالت سے ہاں سسور کی حالت نہایت ہوں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
 بھی نہیں گرا۔ ہاں میں ہونے سے ہاں درپردہ سلیش تک جا رہی ہے کہ ہاں ہاں ہاں
 لاہور ہی پر تھے گئے اور تپہ پختہ ہو۔

حفظ نام سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ملاں
 کے سے نہ ہاں کے تپہ تک گئے ہاں میں کو دیکھا کہ ہاں ہاں ہاں ہاں کے ہاں پر اندر ہیں؛
 آپ نے کہا۔

”کہا ہے کہ ہاں درست گونگی کے لئے کوئی زبان مل سکی۔“

”یک بار آپ نے آپ نفس کو میلے پکھیلے کپڑے پہنے دیئے ہاں ہاں؛“

”ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں کے لئے کھجور نہ مل سکا؟“

”ہاں ہاں ہاں نے اپنے ہاں سے روایت کیا ہے کہ ہاں نے کہا کہ مجھے ہی کہہ کر رسول اللہ

علیہ وسلم نے اس میں دیکھا کہ پٹھے پڑنے کے پٹھے ہونے لگے۔ آپ نے دریافت کیا کہ:

”کہا تمہارے پاس کچھ مال ہے؟“

”میں نے جواب دیا: ہاں۔“

آپ نے فرمایا: ”کس قسم کا مال۔“

میں نے عرض کیا کہ: ”اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے مال سے رکھے ہیں، اونٹ ہیں، بکریاں ہیں۔“
آپ نے فرمایا:

اِذَا اَتَاكَ اللّٰهُ صَالًا فَلْيُزِ اَثْرَ نِعْمَتِهِ وَكَرَامَتِهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ ابو داؤد۔

”جب اللہ صاف سے مال دے تو ضروری ہے کہ تیرے مال پر اس کی نعمت

اور کرم فانی کا اثر بھی محسوس کیا جائے۔“

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ يُّحِبُّ الطَّيِّبَ، نَظِيفٌ يُّحِبُّ النَّظَافَةَ، كَرِيْمٌ يُّحِبُّ الْكَرَمَ

جواد یحب الجود، فنظفوا انفسكم ولا تتبھوا بالیہود۔

(ترمذی، بسند حسن)

”اللہ پاک ہے اور پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے۔ صاف شخص کو ہے درمناں سب کو ہے

پسند بھی ہے، کریم ہے اور رتہ کریم کو محبوب رکھتا ہے۔ سخی ہے اور سے وفات

پسند ہے۔ جو نہ بھی اپنے جسموں کو صاف ستھرا نہ کرے اور یہ بڑی عورت اُس سے نہ ہو جائے۔“

اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو زیب و زینت اختیار کرنے اور حد دل و پاکیزہ چیزوں کو حرام

نہ ٹھہرا لینے کا حکم دیا ہے۔ اس کا ذکر و پرکھنا یہاں ہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک

پہنچتے ہیں کہ سماں کی عام معاشی سطح پر عیش و عشرت اور دنیاوی و دنیوی متعین کر سکی ہے۔ چنانچہ جب

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بڑے بڑے معاشی کاموں کا فاتح بنایا، دولت و عافیت میں اضافہ ہوا اور معاشی

سطح بلند ہوئی تو ان کے لباس بھی ہر گز اور وہ ان نعمتوں سے بھی لطف اندوز ہونے لگے جن سے

ہم پہلے نہیں لطف اندوز ہوتے تھے۔ کسی نے بھی ان کو یہاں پر ملاحت نہیں کی تھی کہ یہ کبھی

حد معقول سے تجاوز کر گئے ہوں اور ان پر تنقید کی گئی ہو، یہی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

كُلْ مَا شِئْتَ وَابْسُ مَا شِئْتَ مَا حَطَمَكَ اثْنَانِ سَوْفَ اُخْبِلُهُ

(بخاری)

”جو چاہا کھاؤ اور جو چاہا پیو، نہ ٹھیک نہ بے در ہٹ، ان دونوں چیزوں سے بچ رہو۔“

نفس سے نہیں بڑھتا۔ انھیں یزید اور دنیا یا شہ ہے۔ سو یہ ہاتھوں کی ہاتھوں سے ہے
 اور جسے وہی مومن ہے۔ جس کا یہ ہاتھ وہی ہاتھ ہے۔ جس کے ہاتھوں کی ہاتھوں
 ستان یہ قرأت ہے۔ جس کے ہاتھوں کی ہاتھوں سے ہے۔ جس کے ہاتھوں کی ہاتھوں سے
 غلام بن کر رہ جائیں۔

نفس عندك قد تغس عنك...
 نفس واشكس... اذا مثلك فلا انقش...
 جو درمن کے ہاتھوں سے ہے۔ پھر جب اسے کافی ہے۔ جس کے ہاتھوں سے ہے۔

اسلام کا مانتا ہے کہ ہادی ساز و سامان سے بے نیاز کے ساتھ اس کو برتنے میں
 زبان روی اختیار کی جائے۔ قلب مسلم کو ہادی ساز و سامان سے بے نیاز کو خوب چاہتا ہے۔

فريضة زكوة

باب میں مذکور ہے کہ زکوٰۃ ہادی ساز و سامان سے بے نیاز کے ساتھ اس کو برتنے میں
 صورت انتہائی موقع ہے۔ اس کے ہادی ساز و سامان سے بے نیاز کے ساتھ اس کو برتنے میں
 کی حامل ہے۔

زکوٰۃ مال میں عاید ہونے والا ایک نفع ہے۔ ایک اعتبار سے لوہے کی عبادت ہے اور اسے
 دوسرے پہلو کے اعتبار سے ایک اجتماعی فريضہ۔ عبادت اور ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے
 مخصوص طریقہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے
 زکوٰۃ نام دیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے
 حق واجب کی ادائیگی کے بعد ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے
 ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے
 ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے
 ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے ہادی ساز و سامان کے

سے حق مارا کرنے اور اس طرح حلال قرار پا جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کا یہی تعبیر سی
پہلو ہے جس کے سبب اسلام کے لطیف احساس نے یہ گوارا نہ کیا کہ اہل ذمہ اور اہل کتاب سے اس کی
ادائیگی کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ اس نے اس کے موضوعات پر جز یہ عاید کیا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ
ریاست کے عام شرجات میں شریک ہو سکیں۔ مگر جب اسلامی عبادت کے پابند نہ فرمادیے جائیں
اور یہ کہ وہ خود اسے اختیار کر لیں۔

زکوٰۃ سمان کا ایک حق ہے جو فرد پر واجب ہوتا ہے تاکہ ضرورت مند طبفوں کی ضروریات
پوری ہو سکیں۔ اور بسا اوقات ناگزیر ضروریات کے ماسوا بھی انھیں کچھ سامان زندگی فراہم کیا جاسکے
اس طرز اسلام کسی حد تک اپنے اس اصول کو عملی جامہ پہناتا ہے جو آیہ کریمہ کی مائیکون ڈولڈ
ہیں اِنہ غنیاء، مَنکَحہ میں بیان ہوا ہے۔ اسلام کو انسان کا فقر، احتیاج میں مبتلا بنا
نا گوار ہے اس نے یہ اصول طے کر دیا ہے کہ فرد اگر استطاعت رکھتا ہو تو اپنی قوت بازو کے بل پر اپنی
ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے اور گروہ کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا ہو تو اسے سماج کے مال میں
سے کفاف دیا جائے۔

اسلام کو انسان کا فقر و احتیاج میں مبتلا رہنا کیوں نہیں گوارا؟ اس لیے کہ وہ چاہتا
ہے کہ انسان کو اس کی مادی ضروریات سے فائدہ کے اُن بلند ترین مقامات، منازل کی طرف توجہ
کرنے کا موقع فراہم کرے جو مقام انسانیت اور اس خصوصی شرف و امتیاز کے نمایان شان میں جو
اللہ نے بنی آدم کو عطا فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوُجُوهِ وَالْبَحْرِ وَ
رَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ
خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل: ۷۰)

مہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ان کو خستلی و تیری میں سواریاں عطا کیں اور
ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں حریت بخشی
اللہ نے انسانوں کو یہ بزرگی عقل و حیرات اور جسمانی ضروریات سے بلند تر مقاصد کی
طرف روحانی میلانات دے کر عملاً عطا فرمادیا ہے۔ اب اگر انسانوں کو ضروری سامان زندگی فراہم

ایما اهل عرصۃ اصبح فیہما مروءۃ جانیۃ فقد رئت منہم

ذمۃ اللہ۔ (مسند امام احمد۔ حدیث نمبر ۴۱۰۰ بحوالہ جدید پبلیکیشن مرتبہ احمد رضا شاکر)

”جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے

اللہ کی حفاظت و نگرانی کا وعدہ ختم ہے“

نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

لا یؤمن احدکم حتی یحب لا ٰخیه ما یحب لنفسہ۔ (متفق علیہ)

”وہم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک مقبہ نہیں۔ جب تک وہ جو کچھ اپنے لیے پسند

کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی نہ پسند کرے“

اسلام امت کے مختلف افراد کے درمیان اتنے زیادہ تفاوت کو کیوں نہیں پسند کرتا؟ اس کا

جواب صد ویکٹ کے ان خطاؤں کی بات میں مضمر ہے جو سماج کی بنیادیں ہلاتے ہیں۔ اس کا جواب اس

بے جا امتیاز، حق تلفی اور سنگ دلی میں مضمر ہے جو قلب و ضمیر کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ تنازعات ہونے کا

مطلب ضرورت مندوں کو چوری اور غصب کرنے یا عزت نفس اور خود داری سے ہاتھ دھو کر انتہائی ذلت

و خواری میں مبتلا ہو جانے پر مجبور کرنا ہے۔ یہ انسانوں کو ہستی کی طرف لے جانے والے عوام میں جس سے اسوام

سماج کو بچائے رکھنا چاہتا ہے۔

اسلام نہیں چاہتا کہ دولت قوم کے مال دار افراد کے درمیان گردش کرتی رہے اور عوام کی اکثریت

کو خیر چ کرنے کے لیے مال زمینہ ہو کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی زندگی ٹھنڈی رہ جاتی ہے اور روزگار

اور آمدنی کی سطح گر جاتی ہے۔ اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں مال ہوگا تو وہ اسے ضروریات زندگی کی ضروریات میں

سرف کریں گے، اشیاء کی طلب بڑھے گی، پیداوار میں اضافہ ہوگا اور قابل کار زادے بے عمل روزگار حاصل

ہو سکے گا۔ اس طرح محنت، پیداوار، دولت اور منفعت دولت کا عمل اپنے قدرتی انداز پر جاری رہ کر مفید

نتائج سامنے لائے گا۔

زکوٰۃ کا مقصد بھی ہے۔ تاراع نے اسے ایک مالی ذریعہ قرار دیا ہے جو اپنے مصحقین کا ایک

قانونی حق ہے، نہ کہ زکوٰۃ نکالنے والوں کا ایک احسان، اس کا انصاف اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ ہر سے

مال دار لوگ اس کی ادائیگی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جس سے کم مال پر زکوٰۃ نہیں عاید ہوتی

ہیں مشغال سونا ہے۔ جو ہمارے سنگہ میں تیس روٹے ہوئے ہیں۔ ایک ہفتہ میں دو روٹے
 روزانہ بات کے علاوہ اس سے پاس نہ تین چار روٹے ہوئے ہیں۔ اور یہ سب کو بیچ کر
 خود ہی روٹہ کا مستحق ہو کر رہے ہیں۔ اس لئے وہ سب ہفتہ میں سب سے پہلے روٹے دیکھ کر
 موسم وصولی کی جاتی ہے، ان فصل پیر ہونے کے بعد جب ہوں ہے۔ سارا ہی رستہ روٹہ سونے دینا ہوتا ہے
 اس کو نو فہمیت کی ہے اس کے سب سے پہلے روٹے دینا ہوتا ہے۔ روٹے دینا ہی اس کے لئے ہے۔ اس میں
 ان کو سب سے پہلے دینا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد دینا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد دینا ہوتا ہے۔
 اور اس کے بعد دینا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد دینا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد دینا ہوتا ہے۔
 اور اس کے بعد دینا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد دینا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد دینا ہوتا ہے۔

وہاں یہ نہایت سہولت ہے۔ اور یہ کوہ کے مصنف ہیں۔

فقراء

۱۰۰۰۔ میں نے سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔
 اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔
 اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔
 اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔
 اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔
 اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔ اور یہ سب سے پہلے دیکھا ہے۔

مساکین

وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔
 اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔
 اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔
 اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔
 اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔
 اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ اور وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔

عالمین زکوٰۃ

یعنی وہ لوگ جو اس کی تعمیل عمل میں لاتے ہیں۔ ان کو ان کے کام کے معاوضہ کے طور پر کچھ
 دیا جاتا ہے خواہ یہ خود صاحب مال ہوں۔ گویا (ان کا حصہ) ایک طرح کی تنخواہ ہے اور اس کا تعلق نظام
 محنت و اجرت سے ہے نہ کہ ضروریات کی تکمیل سے۔

مؤلفۃ القلوب

یعنی وہ لوگ جو ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں ان کو مال دے کر ان کی ہمت افزائی کرنا اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب و متقاعد بنانا ہے۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں مہاجرین کے خلاف فوج کشی کے بعد سے اس مسئلہ پر فریج کرنا بند کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اسلام کو اتنا نابلہ و استہکام حاصل ہو گیا کہ اسے مال کے ذریعہ، لیفۃ قلوب کی کوئی حاجت نہیں باقی رہ گئی۔ اس کے باوجود کہ قرآن کی ایک آیت واضح طور پر ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کا مستحق قرار دیتی ہے، حضرت عمرؓ نے اس مسئلہ میں توقف کرنے میں کوئی حرج نہ محسوس کیا۔

گرد میں پھڑانے میں

یعنی ان مکاتب خدوہ کی مالی امداد جو اپنے آقائوں سے ایک شیعہ رتبہ کے عوض آزادی حاصل کر لینے کا معاہدہ کر لیں تاکہ وہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔

قرض دار

جن کے اوپر ان کی پونجی سے کہیں زیادہ قرض ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ قرض کسی گناہ کے کام میں نہ لیا گیا ہو۔ مثلاً عیش پرستی وغیرہ۔ ان کو زکوٰۃ سے حصہ دینا ایک طرف تو قرض سے نجات کا ذریعہ بنے گا۔ دوسری طرف ان کو صاف شہرہ باغزت نہ ملے گا۔

فی سبیل اللہ

یہ ایک عام مدد ہے جس کی عملی تشکیل حالت میں متعین کر سکتے ہیں۔ یہ بدین کی تیاری و تیار کرنے کا علاج۔ جو لوگ خود سے تعلیم نہ حاصل کر سکتے ہوں ان کی تعلیم کا بندوبست، اور ان کے وہ سارے کام جو معصات مسلمین کی خاطر مفید اور ضروری ہوں اس قدر کے تحت آجاتے ہیں۔ اس کے اندر ان کی وسعت ہے کہ محض حالت میں سارے ہی جنہ کی کام میں ان کے تحت آجاتے ہیں۔

مسافر

جو غریب الوطنی کے باعث اپنے مال سے فیئ نہ اٹھا سکتا ہو۔ اس وقت اس کا ہاتھ خالی ہو۔ اس نے ایف کے تحت آتا ہے۔ اس کے مہاجرین بھی آجاتے ہیں جو جنگ، غارتگری، درندہ و حور کے باعث بے گھر ہو جاتے ہیں، جو کچھ مال و دوست ان کے پاس تھا وہ وہیں چھوٹ جاتا ہے اور اسے

مواقع فراہم کر دیے جاتیں۔ ساتھ ہی وہ اس کے ذریعہ سرمایہ کے موزوں طریقہ پر گردش کرتے رہنے کا اہتمام بھی کرتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

زکوٰۃ تعاون اور کفالت باہمی پر مبنی اس معاشہ کی بنیاد ہے جسے اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی سودی نظام کے سپارے کی ضرورت نہیں۔

آج زکوٰۃ کے بارے میں ہمارا تصور منبہ ہو گیا ہے۔ وہ بد بخت نسلیں زکوٰۃ کی حقیقت کے صحیح ادراک سے محروم ہیں۔ جنہوں نے اسلامی نظام کو دلتاعت کی دنیا میں قائم نہیں دیکھا ہے اور بدوار مشاہدہ سے یہ بات نہیں سمجھ سکی ہیں کہ یہ نظام ایمانی تصور ایمانی تربیت اور ایمان پر مبنی اخلاق پر قائم ہوتا ہے اور نفس انسانی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ پھر اس نظام کے یہ شعبہ میں صحیح افکار و تصورات، پاکیزہ اخلاق و مادات اور اسلی لوڑ طریقے جاری ہوتے ہیں۔ جابل نظام کے بالمقابل جس کی بنیاد سود پر ہے اسلام اپنے نظام میں زکوٰۃ کو بنیاد کی حیثیت دیتا ہے۔ اس نظام میں انفرادی سہمی و جہد اور سود سے پاک باہمی تعاون کے ذریعہ زندگی نو پاتی ہے اور معیشت کی ترقی عمل میں آتی ہے۔ جن بدقسمت نسلوں کو انسانیت کے اس اعلیٰ تصور کا عملی تجربہ نہیں ان کو زکوٰۃ کی اس صحیح شکل کا شعور نہ حاصل ہو سکا۔ یہ نسلیں سود پر مادی نظام کے زیر سایہ پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ انہیں حرص و انہج و کم ظرفی، درندوں جیسی باہمی ماسبقیت اور اس خود غرضانہ انفرادیت کی کانچہ ہو۔ جو عوام کے فہیروں پر بھی حکمراں ہے، جس کے تحت خود تمندوں کو بھی سود کے ذریعہ زندگی کے سوا کسی اور صورت سے ماں نہیں مل سکتا۔ جن انسانوں کے پاس جمع شدہ مال نہ ہو وہ اس نظام میں بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ سپارے کی صورت میں یہ نکل کر اپنے ماں و یک حصہ ادا کر کے نفس کے سودی کاروبار میں شریک کر دیے۔ تجارت و صنعت کو بھی اس وقت تک کاروبار ہی نہ رہا۔ نہیں مل سکتا۔ جب تک وہ اسے سود پر حاصل کرے۔ یہ یہ ہوا کہ نہ بد نصیب نسلوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ اس نظام کے سو کوئی زیر نظام ممکن ہی نہیں، زندگی کی کائنات سود کے پہیوں پر چل سکتی ہے!

زکوٰۃ کے بارے میں لوگوں کا تصور شاید یہ تھا کہ وہ ایسے معمولی، جبکہ انفرادی حیثیت سے بچنے لگے ہیں جس کی بنیاد پر دور رس مادی دنیا بننا ہی نظام نہیں قائم ہو سکتا۔ مگر غور کرنے کی بات

”جو یمان لائے ہیں اور نیک اعمال بجا لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔“

ہر لوگ جردتہا کے علاوہ اس زندگی میں سکون و عینیت سے بھی محروم رہیں گے اور اس خودمی کی تر متروک زندگی ان کی اپنی جہالت، جاہلیت، مگر بی اور غی دشمنی پر ہے۔

زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے محاصل

زکوٰۃ وہ واحد حق نہیں جو مال میں عاید ہوتا ہو

ایسا انداز ہے کہ جو آج کل زکوٰۃ کے موضوع پر تلبہ زخیل کرتے ہیں وہ اس بات پر قریب قریب متفق ہو گئے ہیں کہ اسلام سے مایہ پٹنیکس جو عاید کرتا ہے اس کی آخری سد بیٹ ہمیشہ سے یہ زکوٰۃ ہے۔ پیشہ ور علماء کے اس سازشی اذہان کا پردہ چاک کرنا بہت فوری ہے۔ جس کا سب راہ و گ بھی لیتے ہیں جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس ترقی کے زمانہ میں اسلامی نظام چل نہیں سکتا ہے۔

در حقیقت زکوٰۃ مال و دولت پر عاید کیے جانے والے ٹیکس کی ادنی ترین شرح ہے اور یہ ان حالات کے لیے ہے جب کہ جماعت کوئی صل زکوٰۃ کے بعد مزید فنڈ کی ضرورت نہ پڑے ایسے حالات میں جب کہ زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو اسلام کے باتو بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اُس نے شریعت اسلامی کو نافذ کرنے والے صاحب امر مایہ پٹنیکس کو گانے کے، بیت خیرات دینے میں وہ مایہ میں سے اس قدر طلب کر لینے کا مجاز ہے جس قدر کہ ضروریات اس کے لیے ضروری ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ:

ان فی المال حقاً سوى الزکوٰۃ (ترمذی)

”مال میں زکوٰۃ کے علاوہ حق بھی ہے۔“

اسلامی قانون سازی میں مصداق مال اور سند ذرائع کے اصول، بہ اندر اتنی وسعت

رکھتے ہیں کہ ان کے تحت ہر طرح کے سماجی معاشی کا حصہ، دولت کی مفتوں کا از رنگ ہے۔

ان اصولوں کی وسعت سامنے لانے کے لیے ہم اس قدر اہمیت دے رہے ہیں کہ اسلامی قانون

ہے کہ اصل اور فرع کے درمیان یعنی جو حکم مستنبط کیا جا رہا ہے اس کے اور مخصوص حکم کے درمیان کوئی باقاعدہ اصولی رشتہ پایا جاتا ہو۔ قرآنی کا ساتھ دینا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شوافع کے یہاں باقاعدہ قیاس کے بغیر کسی مصلحت مرسلہ کے اعتبار کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

دوسری رائے احناف اور ان دوسرے حضرات کی ہے جو قیاس کے ساتھ استحسان کے بھی قائل ہیں۔ استحسان کی یہ لوگ جو نوعیہ بھی کرتے ہوں اس میں مطلق مصلحت پر اعتماد کرنا آپ سے آپ شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے استنباط میں مصالح کا اعتبار شوافع سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن خاص استحسان کی مثالیں ان کے یہاں بھی بہت زیادہ نہیں کیونکہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں ان کا سہارا تمام تصرف مصالح پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان مصالح کو ان کے یہاں بنیادی اصول کے طور پر نہیں شمار کیا جاتا۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مصالح کے اعتبار میں غلو سے کام لیتے ہیں، یہاں تک کہ انسانی معاملات میں مصالح کو نقص پر مقدم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مصلحت نفس کی تفصیص کر سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک مصلحت اجماع کی بھی تفصیص کر سکتی ہے۔ اگر کسی شخص کی روشنی میں کسی مسند پر علم کا اثبات ہو گیا ہو درمیان یہ حکم بعض پہلوؤں کے اعتبار سے مصلحت کے منافی نظر آئے جو مصلحت کے بحال کو مقدم رہی جائے گا اور ایسا کرنے کو تفصیص بھی جائز کا۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ رائے کی ہے۔

چوتھی قسم معتدوں سے رکھنے والوں کی ہے درجی کا مسئلہ قربانی المصوب نظر آتا ہے۔ ان کی رائے میں مصالح مرسلہ کا اعتبار ان امور میں کیا جائے گا جن میں نقص قطعاً نہ وارد ہوتا ہو۔ یہی میں سے کہہ سکتے ہیں۔ یہ مسلک مصالح مرسلہ کا غلبہ ایک مستقل اصول قانون ہے مگر مسائل کا خود اختراع کردہ نہیں بلکہ اس باب میں وہ (مدف مصالح کے) تتبع تھے (میں کہ ذیل کے نظائر سے واضح ہوتا ہے)

۱۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ صحابہ میں نہ جلی نہ عیب نہ سہم نہ تباہی کی بات کے حد کچھ ایسے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو انہوں نے دین کو ایک تباہ کی شکل میں جمع کیا وہ اس کے بعد اس کی مصلحتی نہ جانے دوسرے درجہ میں یہ ہوا تھا مگر جب انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو کہ خداوند تعالیٰ کی بات کے بعد ان کے بھولے جانے والے تو مصلحت مندانہ مصلحتی ہوں گے اور وہ جتنے باتیں کہتے ہیں وہ سب سچ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ متمدین کے خلاف جنگوں میں خداوند تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں ہمارے تباہی کو فتنے کے ساتھ جس سے کہ عیب نہ ہو اور تباہی نہ ہو حضرت جو اس کے ساتھ یہ بھی دیکھ کر فتنے کے ساتھ ہی جنگ میں جمع ہو جاتے ہیں اس کے صحابہؓ نے تباہی کی تصویر سے اس پر اشارہ کیا۔

۲۔ جی نہ کر رہے۔ صحابہ جلی نہ عیب نہ سہم کے بعد اب خور کو خور کو خور کی سزا دینے پر تیار ہو رہے۔ یہی صدر بھی مصلحت کا دھوکہ کھاتے ہوئے یہ کیا تھا کیا کہ انہوں نے، جی نہ کر رہے۔ خور کی فتنوں کو جس پر بھاری اور تباہی پر داری اور پاکیزہ ترین عورتوں پر تہمت عاری یہ متع ہوتی ہے

۳۔ خلفاء راشدین نے متنازعہ پریشانیوں میں یہ نہیں دیکھ کر نہ کا بیعت کیا۔ اگرچہ جو استبداد کا رنگہروں کو کام کے لیے دی جاتی تھیں وہ اصولاً اعانت کی حیثیت رکھتی تھیں نہ ان میں میں نقصان واقع ہو جانے یا اس کے ضایع ہونے کی شکل میں اعانت درجہ میں انہیں دھوکہ کیا جاسکتا لیکن عملی صورت حال یہ تھی کہ لوگوں میں متنازعہ عوامی بڑی طلب تھی۔ اگر ان صفت عوام کو لوگوں کے سامان ضائع جانے یا ان میں حصہ واقع ہو جانے پر تیار نہ تھے بلکہ ان کے قرار یا جاتا تو یہ لاپرواہی پر تھے اور عوام کا نقصان ہوتا۔ ایسی شکل میں مصلحت کا لفظ ضابطہ ہی تھا کہ ان پر نقصان عاید کی جائے۔ اسی بنا پر حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو ان سامانوں کا مقدار در دین اور قرار دینے کی بات یہ فرمائی ہے کہ:

”اس کے بغیر لوگوں کے مفادات کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔“

۴۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا دستور یہ تھا کہ جن دایوں پر خیانت کا شبہ ہوتا ان کے مال میں سے نصف حصہ بحق سرکار ضبط کر لیتے۔ وجہ یہ تھی کہ جو مال یہ لوگ اپنے منصب ولایت کے اثر سے فائدہ اٹھا کر کرتے تھے وہ ان کے اصل ذاتی مال کے ساتھ مل چکا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ بھی مصلحت رسد کے تحت آتا ہے۔ آپ نے یہ محسوس کیا کہ دایوں کی صلاح اور ان کو منصب ولایت کے رعب و اب سے بے جا فائدہ اٹھا کر یہ دوسرے ناجائز طریقوں سے مال و دولت کماتے ہوئے رہنے کے لیے ایسا کرنا فائدہ دیتی ہے۔

۵۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ آپ نے ملاوٹ کرنے کی سزا کے طور پر ایک باریانی ملا جو دو دھڑ زمین پر بے جا دیا تھا۔ یہ قدام بھی مصلحت عامتہ کے تحفظ کے لیے تھا تا کہ تاجر عوام کو دھوکہ دینے سے باز آجائیں۔

۶۔ آپ کے بارے میں منقول ہے کہ اگر کسی آدمی کے قتل میں ایک یوراکر وہ شریک جو آپ پر اسے گروہ کے قتل کا قصد کرتے تھے کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا اور اس باب میں کہ قاتل نہیں موجود تھی۔ مصلحت کا ثبوت یہ ہے کہ مقتول بے گناہ ہے اور اسے عداقت کی کیا ہے۔ اسی شکل میں اس کے خوں کا بدلہ لینا قصاص کی جڑ کاٹ دینے کے برابر معنی ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاتل نے اسے اس لوگ ایک دوسرے سے مدد لینے لگیں گے۔ کیونکہ انہیں بخوبی معلوم ہوا کہ مل جل کر یہ کام کیا جائے تو ان سے قصاص نہیں کیا جاسکے گا۔ غرض کیا جاسکتا ہے کہ اس قتل میں جو قاتل نہیں آئے قتل کی سزا دے کر دین میں ایک بہت کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ بال گروہ میں سے کسی ایک فرد کو بھی اس کی انفرادی حیثیت میں قاتل نہیں قرار دیا جاسکا۔ جواب یہ ہے کہ قتل کا اصل مجرم وہ یوراکر وہ ہمیشہ گروہ ہے۔ اسے بھی اسی طرح قتل کیا جائے گا جیسے کہ کسی منفرد قاتل کو اس گروہ کی طرف قتل کا جرم اسی طرح منسوب ہوا ہے جس طرح کہ وہ کسی فرد واحد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گو یا کہ اس قتل میں یہ یوراکر گروہ سزائے قتل کے سلسلہ میں فرد واحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب کرنے کا حکم

مصلحت ہے۔ کیوں کہ غور و تدبیر کا سہارا اور انسانی سماعت کا تحفظ اسی طرح ممکن ہے۔

مسئلہ عامہ میں مصلحت کے لحاظ کی ایک مثال یہ ہے کہ جب بہت لمال بھائی ہو، یا فوج کے اخراجات بڑھ جائیں، اور بیت المال میں بقدر ضرورت مقررہ موجود ہو تو اس کو بڑھانے کے لئے اردوں پر بھرنا ضرورت ٹیکس عاید کر دے۔ جب تک بیت المال میں دوستی مدت کے لئے آمدنی نہ ہو جائے، اس میں اضافہ یا کمات کے بقدر ماں نہ آجائے۔ یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں جو پیشہ ٹیکس وصول کئے اور پھلوں کے ٹوڑے جانے کے وقت اضافہ کر کے، اور صاحب ثروت کے مال سے حسب کرمان میں بددی پیدا کرنے کا باعث بنیں چاہئے۔ اس میں اس وقت کا پتہ یہ ہے کہ اس کا دوسرا گھر بسا نہیں کرنا تو اس کی دھمک بھڑکانے کی بجائے اسے اٹھانے کیس گئے اور ان کو اس کے غلبہ و غفہ نہ تو ہو جائے کہ جو یہ توقع سے قائمہ اٹھا کر دیتا چاہتے ہیں۔ یہاں چاہئے کہ وہ ٹیکس بٹائے گئے ہوں۔ اس کی طرف سے اس سے بسا چاہئے کشا طبعی نے اس کا جو سبب ہو چاہئے کہ ان کا ہاں ہو۔ پیشہ جانے یہ دانش بینا سنی تعلیم میں مناسب ہو گا جبکہ بیت المال مستقبل میں بڑھانے کی توقع ہو۔ اس تعلیم میں جسے کوئی آمدنی سے فائدہ نہ ہو اور اس کے جو ذرائع مینہ ہوں ان کی آمدنی بھی بڑھی ہو، ضروریات کے لئے، لائی ٹیکس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ذرائع

ذریعہ کے معنی ہیں وسیلہ کے۔ مثلاً ذرائع کا مطلب یہ ہے کہ نہایت سیدھے پیر و سیکھے اسباب کا ازالہ کر دیا جائے۔ جو چیز کسی حرام کا سبب یا ذریعہ ہو وہ خود بھی حرام قرار پاتی ہے، اور جو چیز کسی واجب کا وسیلہ ہو وہ خود بھی واجب ہے۔ زنا حرام ہے لہذا کسی اجنبی عورت کی طرف قصد ادیکھنا بھی حرام ہے۔ کیونکہ یہ چیز زنا کی طرف لے جاتی ہے۔ جمعہ کی نذر فرض ہے۔ لہذا اس کے بے جانا اور اس روانگی کی خاطر کاروبار

ردک دینا بھی فرض ہے۔ حج فرض ہے۔ لہذا بیت الحرام کی طرف سفر اور حج کے جہلہ اسم کو بحال نا بھی فرض ہے۔

سید ذرائع میں اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کوئی کام یا تاخر کس انجام تک پہنچاتا ہے۔ اگر اس کا رُٹ اُن مصالح کی جانب موجود یا یہی معاملات سے متعلق اور ہر طرح مطلوب و مقصود ہوں تو خود یہ کام بھی اُن مقصد کی اہمیت اور ضرورت کی مناسبت سے کم یا زیادہ مطلوب قرار پائیں گے۔ البتہ یہ کام جو ذریعہ بن رہے ہیں) اپنی مطلوبیت میں اُن مقصد کے ہم پلہ نہیں۔ اگر یہ کام ایسے ہیں کہ ان کے انجام یا مطلوب مفاسد ہوں تو یہ خود بھی انھیں مفاسد کی حرمت کی مناسبت سے حرام قرار پائیں گے، اگرچہ اس شدت کے ساتھ نہیں جس شدت کے ساتھ کہ خود یہ مفاسد حرام ہوں۔

اس سلسلہ میں اصل اہمیت کام کرنے والے کی نیت اور ارادے کو نہیں بلکہ اس کے کام کے اثرات و نتائج کو حاصل ہے۔ آخرت میں جزا و سزا کا مدار بلاشبہ کام کرنے والے کی نیت اور ارادے پر ہے۔ لیکن کسی کام کو سبھلا یا بُرا قرار دینے یا اُسے مطلوب یا ممنوع قرار دینے کا مدار تمام تر اس کے عملی نتیجہ پر ہے۔ دنیا کا نظام بندگانِ خدا کے مصالح کے تحفظ، عدل، انصاف و توازن پر مبنی ہے اور ان امور کا تقاضا ہے کہ حسن نیت اور ارادہ ثواب پر نہیں بلکہ کاموں کے عملی اثرات و نتائج پر نظر ڈالی جائے۔ جو شخص خالصتہً لوجہ اللہ بتوں کو کالیاں دے وہ اپنے تئیں محض ہو سکتا ہے، لیکن اگر اس کے اثرات و نتائج میں منہ کی منہ ضرب ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کالیاں دینے لگیں تو اس شخص کو خدا، اللہ تعالیٰ نے ایسا کرتے سے منع کر دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام: ۱۰۸)

”یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں کالیاں نہ دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو کالیاں دینے لگیں۔“

اللہ تعالیٰ کا یہ قول موجود ہے کہ:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ
مَلْحَمَةٍ (الانعام: ۱۰۸)

”یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ
جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔“

روایت ہے کہ مشرکین نے مطالبہ کیا تھا کہ مسلمان ان کے خداؤں کو برا کہنے سے
باز آجائیں ورنہ وہ ان کے خداؤں کو برا کہنے لگیں گے۔
نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا زَعِيمًا نُنْظَرُ وَلَا وَاسِعُوهَا
(البقرہ: ۱۰۴)

”اے ایمان والو! زعمانہ کہا کرو بلکہ اُنظرنا کہو، اور توجہ سے بات کو سنو۔“
مسلمانوں کا ارادہ نیک تھا لیکن یہود نے اس نفا (زعمنا) کو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو گالی دینے کا ذریعہ بنالیا تھا۔

سنت میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت
سے ارشادات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے متعلق فتاویٰ اس کی نظیر ہیں
مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے قتل سے اسی لیے منع کیا کہ کفار کو
یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خود کو مقدمہ دھن سے بڑی قبول کرنے سے منع فرمایا ہے
اذا یہ کہ وہ اسے قرض میں سے وضع کر دے۔ وجہ یہ ہے کہ بدیہ دینے سے مقرض کی
غرض یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اسے ادائے قرض میں تاخیر کا بہانہ بنائے۔ یہ ٹھٹھا ہوا سود
ہوگا کیونکہ قرض خواہ کا اصل تو اسے پورا پورا اسی ملے گا اور جو کچھ تحفہ کے طور پر
اسے دیا جائے وہ مزید ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ جنگ میں (چوری کی سزا کے طور پر) ہاتھ کاٹنے سے

منفعہ نرہیا ہے، مگر اس نے ہو کر یہ سزا سزا ہوتے کے دشمن سے جا ملنے کا باعث بن جاتا ہے۔ اسی معصمت کی بنا پر جنگ میں مدد نہیں مانگ کی جاتی کہ یہاں سرور و بخت حرم ہوگئی ہیں نہ مبتدا کر رہے ہیں نہ ازہ حالت جنگ میں بالکل سامنے ہوتا ہے۔

مبارزین و انصار میں سے سبھیں آپس کا ہاتھ باندھتے ہیں کہ جس عورت کو اس کے شوہر نے رضامندی سے طلاق دے دی ہو اس سے اس مرد کے روتہ کا رہنا ہے وہ بہت مستحق قرار دیتے تھے کیونکہ وہ پرہیزگار تھا جس کا رہنا ہے کہ اس نے عورت کو اس لیے طلاق دے کر وہ روتہ سے محروم ہو جائے۔ محروم کرنے کا روتہ ثابت تو نہیں کیا جاسکتا۔ مطلق حملہ اس کا ذریعہ بنتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے:

من احسب منھو خ طق (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

”جس نے احتکار کیا اس نے غلط کام کیا“

انتظار فرما، یہ بات زندگی کا ذخیرہ کر کے لوگوں پر تنگی کرنے کا ذریعہ ہے اسی لیے جس چیز کی ذخیرہ اندوزی حرام کے لیے تنگی کا باعث نہ ہو اس کا احتکار ممنوع نہیں مثلاً سامان بنیت و آرائش جنھیں ضروریات میں نہیں شمار کیا جاتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے والے کو اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کے خریدنے سے منع فرمایا ہے خواہ وہ چیز عام بازار میں فروخت ہوئی ہوئی ملے۔ مقصود یہ ہے کہ کسی ذریعہ سے بھی اس چیز کو واپس لینا ممکن نہ رہے جو اللہ کی راہ میں دی جا چکی ہو، خواہ ذریعہ خریداری ہی کیوں نہ ہو۔ جب آپ نے بالعوض ایسی چیز کو واپس لینے سے روک دیا ہے تو بلا عوض واپس لینا بدرجہ اولیٰ ممنوع قرار پائے گا۔ صدقہ کی ہوئی چیز کو قیمت دے کر حاصل کر لینے کی اجازت دینے سے اس بات کی گنجائش نکل آتی کہ کوئی کسی فقیہ کے ساتھ جیل بازی کرے۔ وہ اسے ایک چیز صدقہ کے طور پر دے پھر اسے اصل قیمت سے کم پر خریدے اور فقیر بچلا

یہ سمجھ کر کہ اُسے کچھ نہ کچھ تو مل ہی رہا ہے خوشی خوشی اسے کم داموں یر فر دخت
کر دے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے اس طرح کے بھڑت نظائر منقول
ہیں۔ علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں تقریباً نوے نظائر پیش کیے ہیں جن میں
سب ذرائع کی خاطر کسی چیز سے منع کیا گیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ آدھے اسلامی قوانین سب ذرائع پر مبنی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ مصالحِ مرسلہ اور سب ذرائع کے یہ دو اصول ایسے ہیں کہ ان کو ان کے
وسیع معانی کے ساتھ زیرِ عمل لایا جائے تو یہ حاکم کو بہ طرح کے اجتماعی مفاسد کے ازالہ کا اختیار
مطلق عطا کرتے ہیں، خصوصاً جب کہ اس میں دولت پر ٹیکس لگانے کا اختیار شامل ہے۔ یہ اختیار
اگر کسی قید کا پابند اور کسی شرط سے مشروط ہے تو صرف یہ کہ امت کے عام مفاد و مصالح کی رعایت
ملحوظ رکھی جائے اور مکمل اجتماعی عدل کے قیام کو ہدف قرار دیا جائے۔

ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہے کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا اصول اس بات
میں مانع نہیں ثابت ہوگا کہ ریاست نفع یا خود سرمایہ میں سے ایک حصہ وصول کر لے۔

شرط یہ ہے کہ اسلامی نظام کے بنیادی اصول کی پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے۔ وہ اصول
یہ ہے کہ افراد کو ذاتی ملکیت رکھنے کا حق حاصل رہے اور اس میں اضافہ کے شرعاً جائز طریقوں کے
مطابق انہیں اس کے ثمرات حاصل ہوتے رہیں۔ نجی املاک میں سے محصول اسی حد تک وصول
کیے جائیں جس حد تک پیش آمدہ ضرورت کا تقاضا ہو، اور ایسا طریقہ نہ اختیار کیا جائے کہ
لوگ گھبرا اٹھیں اور ان میں پیداواری اعمال بھانسنے اور دولت میں اضافہ چاہنے کا رجحان کمزور
پڑ جائے۔ اور ان باتوں سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ افراد کو اپنی روزی کی طرف سے
الطمینان باقی رہے اور وہ ریاست کے ایسے غلام نہ بن جائیں جنہیں ڈر ہو کہ اگر اس پر تنقید کریں گے
یا اس کی مخالفت کریں گے تو ان کی روزی بند کر دی جائے گی۔ کیوں کہ مسلمان پر — ہر مسلمان
پر — یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ حکماں پر نگاہ رکھے اور اسے اللہ کی تربیت سے انحراف
سے روکے۔ غملا اس ذمہ داری کی ادائیگی کس طرح بن پڑے گی اگر اس کی اپنی روزی اپنے ہاتھوں

میں نہ ہو، نہ اس کے پاس کوفہ، نہ داندک ہوں، بجز ان چیزوں کے جن کی ریاست اُسے اجازت دے۔

یہ عجیب رسم چل پڑی ہے کہ سارے زور صرف زکوٰۃ پر صرف کیا جائے۔ گویا اسلام میں مال کا حق صرف زکوٰۃ تک محدود ہے، بار بار صاف صاف بیان اس غلط رسم کا پردہ چاک کرنے اور ان پیشہ ور علماء کی حقیقت آشکارا کرنے کے لیے ضروری ہوا جن کا کاروبار آیات کی سستے داموں تجارت کرنے ہے۔ لوگ اپنے بیت جنہم کی آگ سے بھر رہے ہیں۔

ان لوگوں کی مغالطہ انگیزی کو دفع کرنے کے لیے یہ مکی وضاحت ضروری تھی جو سماجی تحفظ کی ان ضمانتوں کا، جو بحث کر بیان کرے ہیں، حواس میں نظام میں فساد کی گنتی ہیں۔ اور انہیں ناکافی قرار دے کر یہ رائے ظاہر کرنے ہیں کہ اسلامی نظام، درحافظہ کی زندگی کے تقاضے نہیں پورے کر سکتا۔ یہ ساری باتیں فرقہ انگیزی اور ریپگنڈ سے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ایسی باتیں کرنے والے اسلام کی حقیقت اور اسلامی زندگی کی زندگی کی ساری تاریخ سے یکسر ناواقف ہیں۔

اس کتاب میں ہم رامنو بوب بحث "اسلام کا اقتصادی نظام" نہیں ہے کہ ہم اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالیں۔ ہمارا موضوع اجتماعی عدل کے ضمن میں اقتصادی پالیسی کا بیان ہے... اگرچہ اسلام نے زندگی کے لیے جو مکمل نظام عطا کیا ہے اس کے ایک شعبہ کو دوسرے شعبہ سے الگ کرنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن اس کتاب کے موضوع کی نوعیت اسلام کے اقتصادی نظام کے بارے میں مزید تفصیلات کی متحمل نہیں۔

چنانچہ ہم ذیل میں اس نظام کے بنیادی اصول اختصار کے ساتھ بیان کر دینے اکتفا کریں گے۔

۱۔ یہ نظام "مشروعا نیابت" پر مبنی ہے۔ زمین کے جملہ وسائل و املاک کا خالق و مالک اللہ سبحانہ ہے۔ اس نے نوع انسانی کو اس زمین میں اپنا نائب مقرر فرمایا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس ملکیت میں اللہ کی شریعت کے مطابق تصرف کرے۔ اس شرط کی ہر خلاف ورزی تصرف کو کالعدم کر دیتی ہے اور نیابت کے معاہدہ کو ختم کر دیتی ہے۔

۲۔ یہ نیابت عام ہے۔ لیکن افراد کو ان کے عمل کے عرصہ انفرادی ملکیت کا حق حاصل ہوتا

ہے۔ چنانچہ شارع یعنی اللہ سبحانہ انہیں بعض متعین املاک کا مالک بنا دیتا ہے اور اس حق کو وہ عام تحفظات عطا کرتا ہے جن کے نتیجہ میں فرد کو اپنی روزی کی طرف سے اطمینان ہو جائے اور وہ دلچسپی کے ساتھ باعزت طریقہ پر زندگی گزار سکے، تاکہ وہ شریعت الہی کے نفاذ کے سلسلہ میں نگرانی اور احتساب کی وہ ذمہ داری ادا کر سکے جو اس پر عائد کی گئی ہے۔

۳۔ انفرادی ملکیت اگرچہ اس نظام کا بنیادی اصول ہے لیکن یہ حق حصول ملکیت، اس میں اضافہ چاہنے اور اس کے استعمال کے ضمن میں متعدد محدود قیود کا پابند کیا گیا ہے، جن کا منشاء فرد اور جماعت کے مصالح کا حصول اور دونوں میں سے کسی ایک کے حد سے تجاوز کر جانے کو روکنا ہے۔

۴۔ اُمت مسلمہ کی زندگی کا بنیادی طریقہ، انفرادی ملکیت کے اصول کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے، کفالت باہمی ہے۔ انفرادی ملکیت پر عاید ہونے والی جن ذمہ داریوں کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے وہ اسی اصول کفالت باہمی کا تقاضا ہیں اور انہیں شریعت نے واضح کر دیا ہے۔ کفالت باہمی پُرل کے لیے شریعت کی عائد کردہ یہ ذمہ داریاں کافی ہیں۔

۵۔ اس نظام کے ذریعہ اُس سے کہیں زیادہ اور بہتر اجتماعی عدل قائم ہوتا ہے جتنا انسان کے وضع کردہ کسی دوسرے نظام کے ذریعہ ممکن ہے جس میں صحیح اور غلط دونوں کی آمیزش ہوگی۔

باب ہفتم

تاریخ اسلام سے چند مثالیں

تاریخ اسلام سے چند مثالیں

تاریخ اسلام میں وہ روح کا ردِ ماننا پڑتی ہے جسے ہم سب بطور پر "اسلام کی روح" کہہ سکتے ہیں اس دین کے مزاج اور اس کی تاریخ کا جو شخص بھی صحیح طریقہ سے مطالعہ کرے گا، اس کی روح کی پالتے گا۔ اسے یہ روح اسلام کی ہدایات اور قوانین کے پیچھے کام کرتی اور ان کے اندر جاری و ساری ملے گی۔ یہ روح اتنی واضح اور مؤثر ہے کہ کوئی انسان اس کا اثر یہ دیکھ کر اس کی نفس میں محو ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن ہم بنیادی اور گہرے احساس اور بے کلمی اور بلند فکر کی طاقت اسے بھی محدود انفا میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ روح رجحانات اور مقاصد میں اپنی جھلک دکھاتی ہے، واقعات و حوادث اور رسوم و رواج میں جلوہ افروز ہوتی ہے، مگر اسے محدود الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے۔

یہی روح اس فرقِ اعلیٰ کے نقش و نگار واضح کرتی ہے جس کی طرف اقدام کی اسلام اپنے پیروں کو تلقین کرتا ہے۔ یہی مقام بلند ہے جس تک پہنچنے کے لیے اسلام انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ صرف فرائض کی تعمیل اور شائستگی اسلامی کی پابندی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی طبیعت کے تقاضے سے، راضی خوشی، مزید کوشش بھی کرے۔ اس بلندی کی راہ کٹھن اور دشوار گزار ہے اور اس تک پہنچ کر اس پر قائم رہ جانا اس سے زیادہ مشکل ہے حیاتِ انسانی کے طبعی میلانات و ضروریات زندگی کا دباؤ ان مقامات بلندی کی طرف پیش قدمی میں اکثر انسانوں کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ اگر وہ وفور شوق اور خروش جذبات کے سہارے کبھی اس تک پہنچ بھی نہیں تو یہ چیزیں زیادہ عرصہ اس مقام کی دشواریوں

ہے۔ یہ اسی کا فیض ہے کہ اسلام، جو ایک عقیدہ اور ایک تصور کا نام تھا، شخصیتوں اور تاریخی واقعات کی شکل میں مجسم ہو کر سامنے آیا۔ اب یہ مجتہدین و نظریات کا نام نہیں رہ گیا، نہ محض ارشادات و مواظبات کا پشتدار اور نہ صرف تصورات و خیالات کا مجموعہ۔ اب یہ جتنے جاگتے انسانی کردار و عمل دنیا کے حقائق اور ایسے اداروں اور کارناموں کا جا رہے ہیں چکا تھا جو آنکھوں سے دیکھے جاسکتے تھے جنہیں کان سن سکتے تھے۔ انہیں نے عملی زندگی اور تاریخ انسانی پر گہرا اثر چھوڑا ہے، جیسے کوئی نئی روح تھی جو ان شخصیتوں میں پڑ کر ان کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیتی، پھر انہیں ایک نئے رنگ میں رنگ کر ایک نئی زندگی دے کر اٹھاتی۔

یہی صحیح توجیہ ہے ان عجیب شخصیتوں کی جن کا ریکارڈ تاریخ اسلامی کے شروع اور اس کے بعد کے ادوار پیش کرتے ہیں۔ یہی بات ان سارے واقعات کی کنہ تک پہنچاتی ہے جو آپ کو بلند ہی تخلیق کے گھر سے ہوئے افسانے معلوم ہوتے ہیں جو کبھی پیش نہ آئے ہوں، نہ واقعات نے ان پر گواہی دی ہو اور نہ تاریخ نے انہیں اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہو۔

یہی چیز پاکیزگی، زہد، شجاعت، نفس، ایثار و قربانی، مقصد میں فنا ہو جانے کی کیفیت فکر و روح کی غیر معمولی بلند پروازیوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان عظیم کارناموں کی بھی توجیہ کرتی ہے جن کا پوری طرح اس طے کرنا تاریخ کے پس سے باہر ہے۔ جو کارنامے اور غیر معمولی واقعات تاریخ کے صفحات پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے اور اسلام کی قومی اور فعال روح کے درمیان ہیں ایک گہرا ارتباط تسلیم کرنا پڑے گا یہی روح اس طاقت کا منبع ہے جس کے مافیہ تاریخ اسلام میں پارسو پسلا نظر آتے ہیں۔

اگر ہم ان کارناموں کا اس منہ پر چشمہ سے صحیح ربط و تعلق سمجھے بغیر انہیں الگ الگ دیکھیں گے تو قومی اندیشہ ہے کہ ہمارا مطالعہ ناقص ہے گا اور یہ غلط مطالعہ ہم کو ان قوتوں کے بارے میں سخت مفاد نہیں میں بنایا کر دے گا جو کائنات و حیات میں حقیقتاً کافر ماہیں۔ اس نتیجہ یہ ہو گا کہ ہر شخص کی عظمت کا راز اس کی عبقریت میں ختم قرار دیا جائے گا، اور اس روح کو نظر انداز کر دیا جائے گا جو اولین محرک، و موثر ترین عامل ہے جو ان عظیم افراد کے قلب و ضمیر پر اثر انداز ہوئی جس نے زمانہ کی گاڑی کا رخ بدل دیا، واقعات و حوادث کی باگیں خود سنبھال لیں۔ اور ان

سب کو خوش زندگی سے لبریز ایک تیز رو اور شکامہ خیز و صر سے کے سپرد کر دیا جس کی موجودگی کے سبب یہ عبقری اور یہ کارنامے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

اگر ہم عبتہ تین کے ظہور اور ان کارناموں کے صدور کو تمام تر اس طاقتور اور فعال رشتہ کا فیضان قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ دراصل یہ ذات ایک کائناتی طاقت ہے جو کارناموں اور شخصیتوں کی ان قوتوں سے آگے مٹی ہے جو بظاہر انہی ادوی مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے آتی ہیں۔ ان میں سے ہر فرد کی عبقریت کا معیار اس کائناتی فیض کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے جس کا اس نے بظاہر کیا۔ اب اگر بلند ترین رتبہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا قرار دیا جاتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہی وہ ذاتِ گرامی تھی جس نے اس فیض کو تمام کمال جذب کر لیا۔ اس کو پوری عمر اپنا لیا۔ اور اس بلند مقام پر وہ درازہ تک فائز رہی جو ساری عمر میں ایک یاد و عارضی اتفاقات کے علاوہ اس مقام بلند سے ایک لمحہ کے لیے نہ ہٹی۔ یہی وہ اتفاقی لمحات ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کو تختی کے ساتھ تہذیب و مائی۔ ان دو مواقع کے سوا اپنی زندگی کے سارے لمحات میں اس بشر کی روت نے اس کائناتی فیضان کو پوری طرح جذب کیے رکھنے کا عظیم کارنامہ کر دکھایا۔ کیوں نہ ہو، روح انسانی بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک کائناتی قوت ہے نہ کہ انفرادی۔

مقام نبوت کے بعد بلندی مراتب کے مختلف درجے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف صحابہ کرام کو، اور بعد کی تاریخ کے ادوار میں ان کے پیروؤں کو نصیب ہوتے ہیں۔ جو خدا اس عظیم دین کی روح کو جس درجہ جذب کر سکا اُسے اُس کے مناسب رتبہ ملا۔

یہ جامع مطالعہ ہی ہمیں بتا سکتا ہے کہ اس آپس نے انسانی روجوں کو کس طرح متاثر کیا، کس طرح اُس نے خوابیدہ عبتہ تینوں کو بیدار کیا اور متحد اور فعال بنایا، عظیم اور عجز العقول کارناموں کو جنم دیا اور بالآخر تاریخی انسانی کارٹ بدل دیا۔

اس روت کی تاثیر کا پتہ ہمیں تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اور روزمرہ زندگی میں پیش آنے والی باتوں، دونوں کے اندر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ روحانی عظمت کو مقدار اور طول و عرض میں نہیں ناپا جاسکتا بلکہ اس کا تعلق کیفیت سے ہے، اس کا اندازہ صرف آثار و قرائن کے ذریعہ رکایا جاسکتا ہے۔

جزیرہ عرب سے مٹی سجھ انسانوں نے بہت مختصر مدت میں قیصر اور کسریٰ کی دو عظیم سلطنتوں پر غلبہ حاصل

کر لیا۔ تاریخ انسانی مختلف ہی مدت میں اتنی بڑی فتح کی کوئی اور نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے لیکن اس عظیم واقعہ کی عظمت میں کوئی کمی نہ آسکتی ہے۔ اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ یہی عظمت ہلال حبشی نامی غلام کے اس صبر میں بھی پائی جاتی ہے جس کا مظاہرہ آپ نے قریش کی ایذا رسانی کے مقابلہ میں فرمایا۔ (رضی اللہ عنہ) قریش نے ہلال حبشی کو ان کے دین سے بچھ دینے کے لیے دو کلیفیں دیں جن کو برداشت کر لینا انسان کے بس سے باہر ہے۔ بچے سے ان کو تپتے ہوئے سنگریزوں کی گرمی مجلسا رہی تھی، پیٹ اور سینہ پر پتھروں کا بوجھ تھا، بھوک اور پیاس کی شدت بھی تھی اور دوسری کلیفیں بھی دی جا رہی تھیں، لیکن ناقابل برداشت عذاب کی اس دہکتی ہوئی سبھٹی میں بس آپ کے منہ سے جوابات نکلیں وہ تھی "احمد، احمد!"

یہی اسپرٹ ہے جو راہ چلتے عامی میں ساریت کر جاتی ہے تو اسے مختار کل سلطان وقت کے سامنے لاکھڑا کرتی ہے، جہاں وہ کھڑی کھڑی بات سنتا ہے اور راہ خدا میں کسی کی سلامت کی پرواہ نہیں کرتا یہی روح اس خلیفہ راشد میں نظر آتی ہے جس کی حکمرانی بہت سے ممالک پر پھیلی ہوئی ہے، لیکن وہ قناعت، خاکساری اور بے نیازی کے اعلیٰ معیار پر قائم رہتا ہے۔ دونوں افراد ایک ہی چشمہ سے سیراب ہونے میں، اور وہ ہے یہ طاقتور، فعال اور موثر روح اسلام۔

قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں پر یہ بوں کے غلبہ کا ذکر آگیا ہے تو مناسب ہو گا کہ ہم اس روح کی قوتوں کا صحیح طور پر اندازہ کر لیں۔ یہ ان بے پناہ قوتوں پر کیسے غالب آگئی جو اس جنگ کی خاطر ان سلطنتوں میں اکٹھا کی گئی تھیں، جن پر اہل عرب کو بغیر اس روح کے ہرگز غلبہ نہیں نصیب ہو سکتا تھا۔ یہاں اسلام کی فتح دراصل ایک روحانی نظریہ کی فتح تھی جس نے انسانوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ واقعہ تاریخ کی روحانی تعبیر کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہاں مادی تعبیر سے کام نہیں چل سکتا۔ وہ اس غیر معمولی فتح کی توجیہ نہیں کر سکتی۔

واضح رہے کہ وہ عظیم نفسیاتی انقلاب جو اسلام نے عربوں کے فکر و عمل، مقصد اور نصب العین اور سماجی اور معاشی تنظیم میں برپا کیا، اس کا درجہ ان فتوحات سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ وہ روح اسلام کی قوت و عظمت پر ان فتوحات سے زیادہ واضح طور پر گواہی دیتا ہے۔ آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی وفات کے درمیان جزیرہ عرب کے معاشی حالات میں کون سی بنیادی تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں جنہوں نے عربوں کے فکر و نظر، حرکت و عمل، اور اجتماعی تنظیم کے اندر ایک انقلاب

برپا کر دیا۔ ان سارے کارناموں کا خالق ہی رب فی ثنوتہ تھا۔

یہاں ہمارے یہ سائنقلاب کا تفصیلی احاطہ ممکن نہیں، ہم صرف اس کی ایک جھلک دکھانے پر قنفا کریں گے۔ یہ جنگ اس بیان میں لڑائی ہے جو اس زمانہ کے عرب نے اس بین الملکین کی موجودگی میں دیا تھا جس کی وہ ٹوٹ کوئی تردد نہ کر سکتے تھے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب دعوت اسلامی اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی اور قریش کی یہاں سال سے بچ کر اپنے مین کو سلامت رکھنے کی خاطر مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے۔ قریش کو نہایت ہوا کہ مسلمانوں کو دائر الہجرت میں اطمینان کا سانس لینے کا موقع نہ مل جائے۔ چنانچہ اس نے حبشہ کے نجاشی کے پاس دو سفیر بھیجے تاکہ وہ ان جبارینہ کو وہاں سے نکلادیں۔ یہ دو سفیر عبید بن العاص اور عبید اللہ بن ابی ربیعہ تھے۔ انھوں نے جا کر یہ کیا:

”اے بادشاہ، ہمارے یہاں کے کچھ بھوکے بک کر تیرے ملک میں آ رہے ہیں انھوں نے اپنی قوم کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور تیرے دین کو بھی نہیں اپنایا ہے، بدتر اپنی جانب سے گھر کر ایک ایسا دین لائے ہیں جو ہمارے دین بھی جنسی ہے اور تیرے لیے بھی بہتر ہے۔ ان قوم کے معزین نے جن میں ان بڑوں کے باپ، چچا اور دوسرے مرزا بھی شامل ہیں تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ تو انھیں ان کے پاس واپس بھیج دے۔ وہ ان لڑکوں سے زیادہ بائع مذاق ہوئے ہیں اور یہ ہمیں حیرت کی بات، عتہ من کرتے اور انھیں بڑبھلا کہتے ہیں۔ ان کو وہ ان سے بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔

جب نجاشی نے مسلمانوں سے دریافت کیا:

”یہ دین کیا ہے جس کی خاطر تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور نہ تو میرے دین میں داخل ہوئے نہ کسی اور دین میں؟“

تو جعفر بن ابی طالب نے جواب دیا:

”اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں مبتلا تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے اور بدکاریاں کرتے تھے، خونی رشتوں کا پاس دیکھنا نہ کرنا اور پردہ کی حق سے غافل رہنا ہمارا شعار تھا۔ ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزوروں کا خون چوستا تھا۔ ہم اس حال میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک کو ہماری جانب پیغام بربنا کر بھیجا

ہم اس کے حسب و نسب، اس کی صداقت شعاری، امانت داری اور پاک بازی سے
 اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا۔ اُسے ایک جاننے اور سچی عبادت
 کرنے کی تلقین کی۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم ان پتھروں و ریتوں کی پوجا ترک کر دیں جن کو
 ہم اور ہمارے آباء اجداد کے سو یو جتے رہے ہیں۔ اُس نے سچے بولنے، امانت داری،
 صلہ رحمی اور پڑوس کے ساتھ حسن سلوک کی، درخون ریزی اور بے مرضی سے باز رہنے
 کی تلقین کی۔ اُس نے فحش، دروغ گوئی، تیرہ کھاں کھانے اور شہیہ عورتوں پر تہمت
 طرازی کرنے سے منع کیا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی
 کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور روزے رکھیں..... الخ۔

قریش کے دونوں سفید دربار میں موجود تھے۔ اُن میں سے ایک عرب بن العاص تھے جن میں نہ
 تو پوہیسی کی کمی تھی نہ ملائقتِ لسان کی۔ مگر جعفرؑ نے اسلام کے قبل عرب کی حالت کا جو نقشہ کھینچا
 یا اس نئے دین کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی دونوں میں سے کسی نے تردید نہ کی۔ یہ اس بات
 کا ثبوت ہے کہ عرب کے ماضی اور حال کا بیان بالکل ٹھیک تھا۔

یہ تاریخ کے صفحات میں سے صرف جزیرۂ عرب کی بابت ایک گوی تھی۔ درجید کا ایک غیر مسلم

اس وقت کی پوری دنیا سے متعلق ایک ایسی ہی گواہی دیتا ہے۔ جے ایچ ڈیسن J. H. Deason

اپنی کتاب "جذبات بحیثیت اساس ہندوب motions as the basis of civilization

میں لکھتا ہے:

• پانچویں اور چھٹی... صدی میں ہندو دین نراٹھ کے ایک ناپائدار اور پُرخطر گراؤ پر
 کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ نظیرِ اشدن تمدن جس کی تعمیر پر چار ہزار سال کی
 انتھک کوششیں صرف ہوئی تھیں، پارہ پارہ ہوا چاہتا ہے اور انسانیت، وحشت
 و بربریت کے اس دور کی طرف دوبارہ لوٹا چاہتا ہے جو اس سے پہلے گذر چکا تھا۔ مختلف
 قبائل خونیں جنگوں میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ نہ کوئی قانون یا تہ رہ گیا تھا
 نہ کوئی نظم۔ مسیحیت نے جس نظم کی طرح ڈالی تھی وہ اتحاد و تنظیم کی بجائے انتشار و تفریق
 کا باعث بن رہا تھا۔ اس وقت ہندو دین کی حالت ایک تناور درخت کی سی تھی جس کی

شہیں دور دور تک پھیلی ہوں دربار کی دنیا میں کے ساتھ سے آجائے لیکن خدیجی اندر
اے ٹھن ٹھن کر کے گود سے تک سریت کر دیکھا ہو۔ اس ہر گز فساد کے منہ
کے درمیان دو شخص پیدا ہو جس نے سارے عالم کو یک سر دکھایا۔

یہ کہانی یہی ہے، یہ کہانی کتاب کا موضوع، اسلام، ہمیں بکرا اسلام میں اجتماعی عدل
ہے۔ ہذا اب ہم تم میں اس عنوان سے متعلق کچھ تاریخی مشاہدات کرنے لگے۔

بیداری خیمہ کے نمونے

لیکن ان تاریخی نظائر سے پہلے ہم نہرونی سمجھتے ہیں کہ اس سے اہم تر موضوع یعنی اسلام
کے خیمہ پر روشنی ڈالنے والی بعض مثالیں سامنے لیں کہ سی خیمہ پر اسلام کی ساری عمارت قائم ہے
اسلام خود کے خیمہ کو بتا دیتا ہے اور اس کے شعور کو جتنا زیادہ حساس
دیکھنا پاتا ہے اس کا ہر ہر اہم پرکھ ہے۔ سدق تاریخ نے اس بیداری خیمہ، رشذات احساس کے
اتنے نمونے محفوظ کر رکھے ہیں کہ وہ ان صنعت میں نہیں سما سکتے۔ یہاں بہت سی مثالوں کے سہ سے چند
مختلف القوت نمونے پیش کیے جا سکیں گے۔

بریدہ سے وہی ہے کہ انہوں نے کہا: ما عذبت مالک بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے
اور کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے پاک دیکھتے ہیں، آپ نے فرمایا: "تیرا بڑا ہوا، لوٹ جا اور اللہ کے حضور
توبہ واستغفار کر لے" راہی بتا ہے وہ بھڑی، در تک واپس گئے، پھر لوٹ آئے اور آپ سے پھر یہی کہا
کہ: اے اللہ کے رسول! مجھے پاک دیکھتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی جواب دیا: "تین بار ایسا ہی
ہوا۔ چوتھی بار رسول اللہ نے فرمایا: "میں تجھے کس چیز سے پاک کر دوں؟" وہ بولے: "زنا سے۔ رسول اللہ
نے لوگوں سے پوچھا: "یہ شخص پاک تو نہیں؟ آپ کو بتایا گیا کہ وہ پاک نہیں ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا:
کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ ایک شخص نے اٹھ کر ماعز کے منہ کی بوسہ لگھی تو اسے شراب کی بو نہ ملی۔

آپ نے پھر ان سے پوچھا: کیا تم نے نہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: "ہاں۔" اس پر آپ نے حکم صادر فرمایا اور ان کو سنگسار کر دیا گیا۔

اس واقعہ کو دو تین دن گزرے ہوں گے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے فرمایا: "مذہبِ مائیک کے یہ مغضت کی دعا کرو۔" میں نے یہی دعا کی تب جو ایک بنو نضیر کے درمیان تقسیم کر دی جائے تو ان سب کے لیے کافی ہوئے۔

پھر آپ کے پاس قبیلہ اُزد کے بٹن، مدی کی ایک عورت آئی اور اس نے کہا: "اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کر دیجئے۔" آپ نے فرمایا: "تیرا بڑا بھوٹا لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ استغفار کر لے۔" وہ بولی۔ "کیا آپ مجھے مائیک کی طرف سے بھیجتے ہیں؟ یہ زنت ہے۔" آپ نے فرمایا: "ہاں۔" آپ نے فرمایا: "کیا تو ان سے ملتا ہے؟" اس نے کہا: "ہاں۔" آپ نے اس سے کہا: "وضع حمل تک انتظار کر۔" راوی کہتا ہے کہ پھر آپ نے اس عورت کو بچہ جنمنے تک کہ حصہ کے لیے ایک نسل بھی کی گئی ہو۔ اس سے پہلے کچھ حصہ بعد اس انصاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کر تائے کو طبع کا نام نہ لیا۔ عورت بچہ جنم لگی۔ آپ نے فرمایا: "نکھر برسیا نہیں کریں گے کہ اسے سنگسار کر دیں۔" اس کے شیعہ شمار تھے۔ کو انہیں چھوڑ دیا کہ کوئی اُسے دودھ پلانے والا نہ ہو۔ اس پر ایک انصاری نے اٹھ کر یہ کہا کہ: "اللہ کے نبی! اس کے دودھ پلانے کا انتظام میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔" اسی وقت سے کہ رسول اللہ نے اسے سنگسار کر دیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ: "تو بتا۔" جب بچہ جنم لینا نہ آتا، جب وہ بچہ جنم لینے کے بعد آتی تو آپ سے فرمایا: "جہاں سے دودھ پلا جب دودھ پلا، جہاں سے پلا۔" جب وہ دودھ پلا تو بچہ کے پاس کے پاس سے بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے آپ سے کہا: "رسول خدا! میں نے اس کا دودھ پلا ہے۔" یہ کہنا کھانے لگا۔ آپ نے بچہ کو کسی مسلمان کے حوالہ کر دیا اور اس عورت کے زیم کا حکم میں درج فرمایا۔ جب بچہ اس کے سینہ تک پہنچا تو ایک عورت کا گود گیا۔ پھر آپ کے ستر سے لوگوں نے اسے شاکر کر دیا۔ خاتمہ بن ولید نے ذرا آگے بڑھ کر ایک پتھر اس کے سر پر مارا جس سے خون کے چھینٹے اڑ گئے۔ ان کے جیسے یہ ہے اس پر انھوں نے اس عورت کو برے احسان سے یاد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

... اس وقت کی تصویریں کہ انہوں نے بنائی ہیں، اس وقت کے سنی تہذیب
کی ہے تو یہ ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...

... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...

... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...

... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...

... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...
... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...

... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ... اس وقت کے ...

میرے کہنے پر یہ ہے کہ اختلاف اس میں تھا کہ اس موقع پر کیا پالیسی اختیار کرنا چاہیے۔ ان
 دونوں فرقوں کے مابین جو فرق تھا اس کے پیش نظر یہ اختلاف بالکل قدرتی تھا۔ عوام
 نے لچک بھرا ہوا ہونہار تھا۔ ان کے ایک نمائندے ایک مسلمان مذہب کا تعلق تھا۔ وہ
 سے پہلے میں ہی ہوں۔ یہ سنا تھا کہ یہاں اب اس قدر مہیا رہنا کسی کے ساتھ
 نہیں۔ یہ سچ نہیں یہاں ہر گز یہ موقع نہ ملے گا کہ مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس میں
 کی نگاہ میں نہ لے۔ وقت کھٹ جائے گا۔ انہوں نے اس کے ساتھ جو کوئی کرنا چاہا وہ سنا
 دیا۔ اس نے تمہیں بتا دیا کہ یہ تسلیم بھی کرنا پڑے گا کہ ایک کے معاملہ میں اس سے ایک
 مہذبہ میں ملنے والی تھی۔ اگرچہ غرض اسے کہی نہیں تسلیم کر سکتے تھے۔ تو بھی انہوں
 نے اس کی بیانیہ دلیل کے ساتھ جو کچھ کیا وہ آپ کے نزدیک اس بات کے یہ کافی تھا کہ ان
 مذہبوں کی بات ہے۔ یہ بات کہ وہ سیف اللہ ہیں اور ایک ایسے کمانڈ ہیں کہ فتح کا یہ رعب
 میں ملتا ہے۔ اس کے لیے سر نہیں مل سکتی تھی اگر اس طرح کے غرض تسلیم کر جائے اس کا
 مطلب یہ ہوتا کہ خالد اور ان جیسے لوگوں کے لیے حرام چیزیں مباح قرار دے دی گئی ہیں۔
 ایسا کرنا مسلمانوں کے سامنے اقوام کتاب اللہ کی بہت بڑی مثال پیش کرنے کے مترادف
 ہوتا ہے۔ اس بات کی وجہ سے غرض کہ اگر کوئی بار بار توبہ دلاتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے
 خاندان کو بلا کر ان کی حرکتوں پر سمجھتا ہے۔

ابو جہر کے نزدیک موقع نماز یا دعا نہ ملے تھی۔ اس طرح کی توجہ سے ان
 جہان کی تھی۔ اس کی مہمت تھی۔ کے نزدیک میں اور ملد عرب میں یہاں طرف جہان
 اس کے لیے بڑے بڑے اٹھارے تھے۔ ایسی حالت میں اجتہاد غلطی سے بڑھتا ہے۔ یہاں
 اس کے لیے قتل کی کیا اہمیت؟ یہ کمانڈ جس پر غلطی کا الزام ہے۔ خطرات سے دفاع
 اس کے لیے نہ صرف اس لیے تھی کہ اس عورت سے نکاح کر لینا بلکہ اس سے بیوی بن
 پاک ہونے سے پہلے اس سے صہت کرنا اس عورت کے عادات و اطوار سے بہت تھی

لے اگر واقعی آپ کی رائے یہی ہوتی ہے تو یہی ملافت سے زمانہ میں خالد پر مدد جاری کی جوتی

زیادتی کرنے کا التزام نہیں رکھ سکتا تھا۔

یہ بیسویں صدی کے پہلے پانچ سو کا دہائی کا ہے جسے وہ قول کے تحت عمر بنی احمد
منہ کے ساتھ پورے رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ غارت کے سلسلہ میں بھی ایسا کر چکے ہیں۔
یہ بات یہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی روح یہ بکریں و مویشی کی رون کو چھو بھی نہیں سکی ہے جو اسلام
کی ابتدا میں کچھ مسلمانوں نے اپنے کے ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہی بیسویں صدی کی نیاں باتوں سے پاک
نہیں ہو سکتا ہے۔ اس دور کے بعد کے دور سے یہ فریب پڑ گیا ہے، غم، صداقت، دین، سب
اس ہشتاد و نئے میں ہی واقع ہوئے ہیں اس دہائی میں پھر آئے۔

آخر پہلی نے مرض کو سمجھا کیا ہے؟ اس حالت خستہ ہونے کے یہ واقعہ میسر ہوتا تو کیا
مرض خاں کو چھوڑ دیتے ہیں؟ اس کا لیکچر ہمیں پہلی پانچویں پانچویں کی تصویر کے مطابق انہیں پورا
یقین تھا اور ان کا غم اس پر ظہور تھا۔ فی الحال اس کا بن نوید کے حق میں اور پھر اللہ اور اس کے
دین کے حق میں۔ اس خطا کار اور گنہگار تھا!

ان باتوں کا لحاظ کرنا اور ان حالات کے آگے سپر تال لینا کیا اس مرض کا کام ہو سکتا تھا
کہ یہ لوگوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دے لیکن اپنی راہ نہ مٹاتی تھے جس کا یہ ان کے عیسویوں کا رٹ ہو رہا
کیونکہ وہ نہ مٹے۔؟

اس قسم کے کام ہوا مینہ، نہ جتا اس نے بدشاہتوں نے کہیں اور جگہ سے ان کی ڈبلوں
اور ہوشیاری پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہ ہو سکتا اس سے بہت بند ہیں۔ اگرچہ ان کے ان
دونوں حضرات کے بارے میں بھی اسی طرح کہتے ہیں کہ اس کا حسرت و پشیمانی اور پشیمانی
کی کمزوری اور اس کے معیاروں کا نیست ہونا ہے۔

میں نے اس طرز فکر کو پیش کرنے اور اس کی لغویت واضح کرنے میں قدرے تفصیل سے کام
لیا ہے تاکہ اس کھلی ہوئی مہلک غلطی کی نشان دہی ہو سکے جس میں بعض لوگ آج کل مبتلا ہیں۔ روح
اسلام کے زمانہ عروج میں جو طرز فکر پائے جاتے تھے ان کی تصویر کشی یہ لوگ آج کے مادی دور کے
طرز فکر کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں جو اس مادی بیداری سے کوسوں دور ہے۔ میں اس غلط فہمی کا
ازانہ کرنا چاہتا ہوں جو اس غلطی کے نتیجے میں نہ تو انسانی ضمیر اس کی بیداری اور برقی کی ان غلط فہمیوں

ان تینوں واقعات کا ذکر کھولنے والی شاد کلید یونس بن عبید کا یہ جملہ ہے کہ: ”تجھے شرم نہ آئی تجھے خدا کا خوف نہ لاحق ہوا“ بے شک ان تمام واقعات کے پیچھے کام کرنے والی اصل قوت اپنے ضیئے آگے نہ مانا، سراسر ڈرنا ہے۔ جب نفس، انسانی اسباب کو اپنا لیتا ہے اور یہ روت رک و پت میں۔ ایت کر جاتی ہے تو اسلام اس کے اندر پوری قوت کے ساتھ یہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ بن چند نمونوں کے علاوہ سینکڑوں نمونے اور ہیں۔ لیکن یہ چند مثالیں اس مقام بلند کی طرف ہمارے ہمنامی کے لیے بہت کافی ہیں جو اسلام خیمہ انسانی کی طبیعت و ترقی کے لیے اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اس کو جہان کی مذکور بات، تعلقات سے اور جان و مال اور عز و جاہ کی قربت سے بلند ہونا سکھاتا ہے وہ چاہتا ہے کہ انسانی خیمہ ان ذمہ داریوں کو نبھائے جو ہمہ وقت بیدار و ہوشیار رہنے درشدت و حسرت کا حامل ہونے کا تقاضا ہیں۔

اب ہم اطمینان کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور اجتماعی حلال کے بارے میں اسلام کی عملی تاریخ کے بعض پہلو سامنے لاتے ہیں۔ اس کام میں ہمارے رہنما اسلامی تاریخ کے مذکورہ بالا بلند اور روشن نمونے ہوں گے۔

مساوات کے نمونے

اسلام جی ثبات انسان کے درمیان کامل مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا۔ وہ انسان کے خیمہ کو ان تمام قدروں کی غلامی سے آزاد کرنے آیا تھا۔ اس مساوات میں خلل پیدا کر سکتے ہیں اور ہم مساوات اور آزادی کے بارے میں اسلام کا اندازہ وضاحت کے ساتھ پیش کر چکے ہیں اور ان نصوص کو سامنے لے چکے ہیں جو اس انداز کی گواہی اور سند کے ہیں۔ دی سب کی سب کی برتری و برتری پر دلالت کرتی ہیں۔ اب یہ ہم دیکھیں گے کہ یہ نظریہ عملی زندگی پر کس طرح مطبق کیا گیا۔

اس زمانہ میں ساتویں دنیا میں اسلام، آزاد انسانوں سے ایک ایک گناہ ہفتہ تہا، یہی حال تہذیب و تمدن میں بھی تھا۔ اس سلسلہ میں حبیب محمد صمد علی علیہ السلام کا بیان یہ ہے کہ: ”میں تو ہمیں خدا جانتا تھا کہ آپ نے اپنی چھوٹی زاد بہن زینب بنت جحش کی جو قدیش کے ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، شادی اپنے آزاد کردہ غلام زید کے ساتھ مردی شادی تک ایسا نازک مسئلہ ہے

اس مجلس میں موجود تھے اور سب سے پہلے آپ ہی نے اسے نوٹ کیا تھا، ابن مسعودؓ سے علقمہ نے، علقمہؓ سے اسود نے اور اسود سے ابراہیم نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "اللہ اور اس کے رسول کے سامنے میں اپنی خواہش کے مطابق تسبیح پڑھنے والے کچھ لوگ ہیں جن کے لیے کل کو، رات کو، صبح کو، اور ہر لمحہ میں کاتب ہو پادشاہوں کے دربار کا ایک ہمہ مشق حاشیہ نشین تھا، بول اٹھا: یہ اموئین سے اس طرح کا کلام: مسیحا نے ڈانٹ کر کہا: "خاموش! کیونکہ دعویٰ نے ہمارے کو بلا کر کیا اور ہمارے فرعون کو۔ اس پر زور کلہ حق کا اعلان کر کے سفیان باہر چلے آئے۔"

جاہل سرزمین کی تباہیت کتنی ہی بڑھ جائے، کسی ایسے شخص پر بات تو ڈالنا ان کے بس سے ہے۔
تھا جس کے دل کی دنیا آباد ہو اور ضروریات سے بلند ہو کر اللہ کے لیے یکسو ہو چکا ہو۔

واثق کا شمار بھی جاہل سرزمین میں ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک بار اساتذہ مشکمین میں سے ایک صاحب آئے۔ انہوں نے اسے سلام کیا لیکن اس نے جواب میں سلام کرنے کی جگہ یہ کہا: "سَلَامُ اللہِ عَلَیْکَ رَشِدٌ تَجِبُ عَلَی سَلَامَتِی نَبِیِّی"۔ سنئے ہی ان صاحب نے، واثق کو یہ ڈانٹ پڑی: تمہارا اساتذہ نے تمہیں بڑی بڑی تمیز سکھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تم کو سلام کیا جائے تو تم اس سے بہت سلام کرو یا اسی جیسا جو بے در۔ (وَرَدَ حَتِّیْتُمْ بِحَتِّیْهِ فَحَتِّوْا بِأَحْسَنِ مِنْهَا أَوْ رُدُّوْهَا)۔ لیکن تم نے مجھ پر نہ تو میرے سلام سے بہت سلام بھیجا نہ اس کا جواب دیا۔

ابو یوسف عدالت کی بات پر بیٹھے ہیں۔ ایک شخص ان کے سامنے مقدمہ لاتا ہے۔ بنا اس پر شاہ بادی سے ایک بانٹ کے بارے میں شک ہے۔ ابو یوسف یہ رسے قائم کرتے ہیں کہ حق اسی شخص کے ساتھ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ بانٹ کے پاس گواہ ہیں۔ انہوں نے کہا: ترقی کا مطالبہ ہے کہ بادی قسم کا یہ کہ ان کے گواہ ہیں۔ بادی نے قسم کھائی کہ اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس سے انکار کر دیا اور بانٹ بانٹ دے کو واپس کر دیا۔ اسی طرز پر ایک اور مقدمہ میں جس میں آپ کے مذہب سے

کس کے طور پر، کاش کا دوسرا ایسے فیصلے پر جا سکتا ہے۔۔۔ ہم ان باغی کا دوسرا کس
 بات کی بات کرتے ہیں جب کہ وہ ہر سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ کتنے تھے ہمارے تو مجھے ڈانٹ کی کوئی
 رو نہیں دے۔ بات مجھے سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ کتنے تھے ہمارے تو مجھے ڈانٹ کی کوئی
 اور میرے ساتھ وہ بھی نہیں ہے۔ اسے فاضل کے بیچ میں جو بھی ہو سکتا ہے، اس کے لئے ایک
 یہ خبر اور یہاں سے بہت زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ اس کے سپرد کرتا ہوں، اس نے اپنے غور سے
 کے ساتھ سے کوئی دخل ہے۔ میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اس نے حکم دیا ہے کہ یہ بات نہیں جو حق ہے
 اور میری دینا مدت ہے۔ اسے دینا مدت کی بات ہے۔ یہ ہر حال میں سب سے بہت رکھتے ہیں
 اور میں وہ باتیں غور میں ہوں۔ اسے ان باتوں میں بھی نہیں دینی ہوں۔

یہی اسی مشفق نہ رہ کر کے سب کو فحشہ کا کھیتے رہے مگر یہ بننے آپ کی سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ
 رہتا رہا کہ وہ بہت زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ اس کی ضرورت تھی۔ سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ
 فحشہ کا کھیتے تھے۔ انھوں نے وہی جو کہہ دیا تھا جو وہ جیتیں تھا مگر یہ بھی سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ
 وہ سے اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے انھیں بد بھیج دیا۔ اس پر سب نے اس خط کیے ہیں اس پر یہ بھی دیکھا
 کر دیں، اگرچہ پہلے آپ اس سے بہت مشفق نہ ہو سکتے تھے کہ اس موقع پر آپ نے بہت خوب
 جواب دیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ قیدی بند ہو گا۔ اس کا نام اس وقت سے پاس چو بھی نہ
 تھا، پھر اس نے تجھ پر یہ کیا۔ تجھے بات دینا یہ اس نے سن ہے کہ تیرے پاس نہ رہا ہے۔ اس میں یہ معاملہ
 یہ غلام کے ہاں مذہبی کام کیے ہوئے ہیں۔ یہ سے پاس میں سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ
 نہ رہا ہے۔ اس میں یہ معاملہ اس کے پاس میں سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ
 مرنے لیا ہے۔ یہ جہاں میں بھی فحشہ کا کھیتے تھے۔ اس سے اس کا کھیتے تھے۔ اس سے اس کا کھیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ۔ سن کر غصہ تھا۔ اس نے کہا کہ تم میرے ملک (دشمن) سے حل جاؤ۔ آپ نے فرمایا کہ حکم
 کی نہیں کروں گا۔ چنانچہ آپ نے اس کے پاس میں سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ
 یہ ہمارے کا بہتر ہے۔ اس میں یہ معاملہ اس کے پاس میں سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ
 واپس بلا لیجئے۔ چنانچہ سب سے زیادہ تر ہی جیتیں۔ اس میں یہ معاملہ
 کر دیا اور کہا کہ جب تک یہاں سے وہاں ہے میں نہیں آؤں گا۔ مہینہ بھر بعد ظاہر کا انتقال

ہو گیا۔

ماضی قریب کی تاریخ میں بھی اس بلند فنی بیعت کی متعدد شاہیں ہیں۔ ہم ان میں سے صرف دو واقعات بیان کرتے ہیں جن کو میں نے سنانے والوں سے سنا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ صرف قرطاس پر منتقل ہو سکے ہیں یا نہیں یہ بلوا واقعہ مجھ سے سماجی دور کے مشہور مورخ احمد شفیق پاشا دم نے بیان کیا تھا۔ دوسرا واقعہ حال میں خدیو توفیق کے زمانے کا ہے جس کے راوی بکثرت ملتے ہیں۔

پہلا واقعہ ان دنوں کا ہے جب اسماعیل کے جبر حکومت میں سلطان عبدالعزیز مصر آیا تھا۔ اسماعیل اس امر کی بڑی فکر تھی کہ وہ نیک خدیو کا لقب حاصل کرنے کی سکیم میں اس امر کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ نیز اس امر سے مصر کے سپہ سالاروں کو بہت سی خصوصی مراعات ملنے کی توقع تھی۔ اسی امر سے متعلق ایک پروگرام یہ بھی تھا کہ سلطان محل میں علماء کو شرف باریابی بخشے گا۔ اس باریابی کے ساتھ بہت سے آداب و رسوم بھی وابستہ تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ آنے والے زمین بوس ہو کر تین بار بڑکی طریقہ کے مطابق کونشس بجالائے۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کون سے دقبانوسی اور سپت قسم کے غیر اسلامی رسوم و آداب تھے۔ چنانچہ محل منتظمین پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ کئی دن تک علماء کو باریابی کے ان آداب کی مشق کرائیں تاکہ وہ سلطان کے سامنے کوئی غلطی نہ کریں۔

جب یہ موقع آیا تو حضرات علمائے کرام اندر داخل ہوئے اور کہاں دین فرموشی و دنیا پرستی اپنے ہی جیسے ایک بندہ مخلوق کے آگے جھک جھکا۔ آداب بجالائے۔ زمین سے ابتدا کرتے ہوئے سر تک پھر منہ کے پاس، پھر سینہ تک، ہاتھ، کمر، سلاک، ریم، او کی، جیسا کہ انھیں ملتا یا گیا تھا سلطان کی طرف رُخ اور روزہ کی طرف بیٹھ گئے اٹھے قدموں واپس ہوئے۔ اس عنت سے صرف ایک عام بچارہ یعنی شیخ حسن العدوی انھوں نے دنیا پر لات ماری، دین کو یاد رکھا اور اپنے دل میں یہ شعور بیدار رکھا کہ ساری قوت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ آزاد انسانوں کی طرف سے اٹھے اندر داخل ہوئے اور سلطان کے با مقابل آکر اسلامی طریقہ کے مطابق "السلام علیکم" یہ المومنین کہہ کر سلام کیا۔ پھر جیسا کہ حاکم سے ملاقات کرتے وقت عالم کو کرنا چاہیئے۔ اس کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے، اس کے عذاب سے ڈرنے اور اپنی

لے استاذ ابو زہرہ کی کتاب "ابن تیمیہ" سے۔

اور نہ کہاتھا۔ شیخ حسن الطویل باتھ میں عڑی لیے خدیو کے سامنے آئے اور بڑی جمہیت خاطر کے ساتھ کہا کہ مجھ سے لوگوں نے کہا ہے کہ مجھے لازماً جتہ و قفطان کے ساتھ حاضر ہونا ہوگا چنانچہ میں اپنے قفطان کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ کو جتہ و قفطان چاہیے تو یہ رہا، اور اگر حسن الطویل چاہیے تو یہ ہے حسن الطویل۔

قدرتی طور پر خدیو نے یہ جواب دیا کہ 'حسن الطویل چاہیے!'

یہ مومن بندے ہیں جن کو اسلام کی عزت کے سوا کوئی اور عزت نہیں مطلوب جن کے وجدان اور ضمیر پرست اور کھوکھلی قدموں اور رخصتی منادات کے مارے سے بری ہیں۔ انہوں نے اسلام کو سب سے اصل حقیقت کے ساتھ سمجھ لیا اور اسے میرے کان پر پڑا ہے۔ جن کو سدم کی خستہ بلندہ تہ وری قتل و دہک مارک حاصل کر لینے کے بعد کچھ بھی سب کی فزارت نہ پڑی کہ اس انسان کو خوش کرنے کی فکر کریں حقیقی اسلام یہی ہے۔

ممالک مفتوحہ کے ساتھ برتاؤ

نسائی مساوات، جہان کی آزادی اور عدل مطلق سے ذہنی تعلق کے پیش قدم مناسب ہوگا کہ ہم اس طریقہ عمل کا مطالعہ کریں جو ایک متمدنہ و اسلامی ممالک میں غیر مسلم قومیتوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ عرب و مسووت کی تقسیم و دیکے بڑے سے نکل کر رہو ہوں اور سدم کی حدود سے کے بڑھ کر رہی انسانیت سے تعلق رکھتی ہے۔

ممالک مفتوحہ پر غنڈہ گردوں اور پرہیزگاروں کے سامنے اسلامی فتوحات کی فحقی نوعیت اور اس کے سبب و غایات کا مفہوم رکھنا ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے کہ اس سے صرف اس حد تک غرض کریں گے جو ان پر ہو، جس کا تعلق انسانیت کے وسیع دائرہ میں اپنی عملی حد سے ہو۔ و موت اسلامی قتل و جہان و فوجیوں ہے، قبیلہ و ممالک کے باطل پاک ہے۔ اس میں نفسیاتی قبہ کو بھی ذریعہ نہیں بنایا جو انسان و عبادہ کریم کے اعلیٰ خوارق عادات کی شکل میں ادیان سابقہ کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ اسلام وہ آئین دین ہے جس نے انسان کو اس کی شعور کا احرام کرتے ہوئے اعلیٰ خوارق کے ذریعہ مایہ زبرد کھانے اور نفسیاتی طور پر اس کو موعوب کرنے کی بجائے

کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو نہیں پسند کرتا۔

پھر وہ دقت آیا کہ پورا جزیرہ عرب اسلام کی آغوش میں آگیا اور فتوحات کے سلسلہ

نے عرب کے بابہ قدم رکھی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فتوحات کی غرض و غایت کیا تھی۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اسلام خود کو ایک عالمگیر نظام اور آفاقی دین قرار دیتا ہے

وہ خود کو کسی جزیرہ کی محدود میں تصور نہیں کر سکتا۔ وہ اپنا مقصد دنیا کے ہر گوشہ اور ساری انسانیت

تک پہنچنا چاہتا ہے۔ لیکن راستہ میں قہر و کسرت کی دو عظیم سلطنتوں کی قوت حاصل نہ آتی ہے جو اسکو

دن کر دینے کے لیے کفایت رکھتے ہوئے ہیں۔ یہ قوت دعوتِ اسلامی کے بلند درجہ میں چل پھر کر

لوگوں کے سامنے اس دین کی حقیقت واضح کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اب اسلام کے لیے اس کے سوا کوئی

چارہ نہ رہا۔ حکومت کی جو طاقت ہر ایت اہل اور انسانیت عامہ کے درمیان مائل تھی اسے بٹا دے

اور اس کی بجائے اسلامی نظام قائم کر دے جو انسانوں کے صفِ خدائے واحد کی بندگی کرنے اور ان کے

انسانوں کی اندامی سے نکلنے پر مبنی ہے، تاکہ وہ اپنی بے لوث بات سب تک پہنچا سکے۔ پھر حکومت

کی مادی طاقت کے درمیان سے ہٹ جانے اور اللہ کی شریعت اور اس کے نظام کے غلبہ کے ذریعہ

اطاعت کے اللہ کے لیے خالص ہو جانے اور بندوں کی اندامی ختم ہوجانے کے بعد جو چاہیے ارادہ و

اختیاری پوری راہی کے ساتھ اسے نئے اور جس کا حق چاہتا ہے اُسے دقتوں کرے۔ کیونکہ خود کو

اپنا روتہ خود متعین کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ قرآن کے فرمان :

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونُوا فِتْنَةً وَيُكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ بِسْمِ اللَّهِ

(الفتح ۳۹)

”ن کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ

کے لیے ہو جائے۔“

میں دین کے تمام تر اللہ کے لیے ہو جانے کا ہی مطلب ہے، کیونکہ یہاں دین کے معنی اطاعت کے ہیں

مقصود یہ ہے کہ لوگ نہ اللہ کی مملکت کے تحت ہوں، بندوں کی مملکت سے آزاد ہو جائیں۔

پھر بغیر کسی جبر واکراہ کے وہ اپنا عقیدہ خود منتخب کر سکیں گے۔

اس وضاحت کی روشنی میں ظاہر ہے کہ ان اسلامی فتوحات کی نوعیت اُن جنگوں سے بالکل

گزشتہ رسکیں۔ وہ ساری سمجھ سہولتوں کی آئندہ تسلیوں سے متعلق تھی۔ یہ ہے۔ میں سب نہیں بھیڑ۔
 ساری زمینیں موجودہ زمینیں ہیں۔ یہ دور آئندہ تسلیوں کو سہولتوں کے فائدے سے محروم کر دیں۔ اس سے پہلے
 یہ تھا کہ ان زمینوں سے خراج وصول کیا جائے۔ وہ بہت کمالات کا زمانہ تھا۔ یہاں رہنے والے آئندہ
 بھی مستحقین کو مناسب حق ملے رہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مفتوحہ ممالک کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے، اس سے بہت زیادہ برکت ملتی ہے۔
 بہت انہیں اپنی خوبوں سے استفادہ کا موقع دیا اور انہیں ان کے ان کو اسلام کی خصوصیات کے
 اپنے دور میں نہ کرتے تھے۔ یہ سب ہونے کی اجازت دی۔ اس نے ان کی دعوت دینے میں بھی کوئی دقیقہ
 نہ اٹھا رکھا کہ وہ لوگ ان خوبوں، خصوصیات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں اس نے
 کسی کے لیے بھی اس کے ملک، نسل، زبان یا مذہب کو رکاوٹ نہ بننے دیا۔ یہ ایک نیا سائنس کا موقع ملا کہ
 وہ اجتماعی، جمہوری نہ ہو جو برسرِ سرِ سرے۔ وہ سب کو ملے۔ یہاں تک کہ اس نے اس کے ایک نیا شعبہ
 یعنی فقہ و قانون سازی میں ممالک مفتوحہ کے باشندوں کو شامل کرنے کی تیاری مقام حاصل کیا تھا
 یہاں تک کہ کوئی دلیل، تعصب نہیں رہتا۔ مگر وہ ان سب کے فکر و عمل کا بہت بڑا ثمر تھا۔ یہاں
 تک کہ امارت، وراثت کے سبب بھی ان لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ اس کے محاصل پہلے اس
 ملک کے مصالح پر نہ پڑتے تھے۔ مگر اس سے اس کو اس کا فائدہ، وراثت، محاصل وہاں تھا جو
 فاضل ہوتا۔ ان مفتوحہ ممالک کی حیثیت نوآبادیات کی نہ تھی کہ انہیں ان کے باشندوں کے بہانے
 و مال کو اپنے عیش، عشرت کا ذریعہ بنایا۔

اس ہی واضح حقیقت وہ آزادی ہے جو اسلام نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو اپنے
 مذہبی مہم کی ادائیگی کے سلسلہ میں ملانی تھی۔ اس نے ان کی مبادیات کا جو، کلیساؤں اور خانقاہوں
 نیز ان کے علماء اور راہبوں کی شناخت کا ذمہ خود اپنے سر لیا۔ اس نے ان سے کیے ہوئے معاہدوں کی
 اتنی دیانت داری کے ساتھ بندن کی جس کی مثال میں انومی تعلقات کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ آج
 بھی اس معاملہ میں اسلام کی ہی ہوتی رہے زندہ اور قائم ہے۔

جب ہم اسلام کا مقابلہ دورِ جاہلیہ کی تہذیب اور اس کے اس بڑاؤ کے ساتھ کرتے ہیں جو
 یہ تہذیب ان ممالک کے ساتھ کرتی ہے جو بدقسمتی سے استعمار کے چبھوں میں چبھ جاتے ہیں تو اسلام

اپنی تاریخ کے ہر دور میں زیادہ وسیع، بلند اور پاکیزہ نظر آتا ہے۔ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تعلیم و تربیت اور معاشی تعمیر و ترقی کے باب میں مغربی تہذیب کی خوبیوں سے ان ممالک کو قصداً محروم رکھا جاتا ہے تاکہ جتنی طویل مدت تک ممکن ہو یہ ممالک مغربی استعمار کے لیے ایک دودھاری گائے بنے رہیں۔ اس کے علاوہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے انسانی شرف و عزت کو ذلیل و پامال کرنا، قصداً اخلاقی فساد پھیلانا، گروہی اور جماعتی فتنوں کے بیج بونا اور انہیں پروان چڑھانا اور قوموں، اور جماعتوں اور افراد کو ہر ممکن طریقہ سے ٹوٹا کھسوتا، استعماری طاقتوں کا شیوہ بن گیا ہے۔

اہل مغرب آج جس مذہبی آزادی کا دم بھرتے ہیں اس سے پہلے ان کے یہاں وہ دور بھی گزر چکا جس میں اُندلس کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی بہیمانہ سزائیں اور مشرق میں صلیبی جنگوں کی سفاکیاں ملتی ہیں۔ آج بھی یہ مذہبی آزادی محض ایک دکھاوا ہے۔ چنانچہ جنوبی سوڈان میں سچی مشنریوں کو سلطنت کی ساری قوتوں کی تائید حاصل ہے لیکن مسلمانوں کا داخلہ بھی ممنوع ہے۔ وہ تجارت کی غرض سے بھی وہاں نہیں جاسکتے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں ایک انگریز کمانڈر آئین بی (Allenby) نے بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت یہ کہہ کر یورپ کے ہر فرد کا ذہن کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا تھا کہ "صلیبی جنگیں درحقیقت آج ختم ہوئی ہیں۔ فرانسیسی جنرل کاترو مشنریہ میں دمشق کے گزشتہ انقلاب کے موقع پر وہاں کھڑا ہو کر یہ کہتا ہے: "ہم صلیبی مجاہدین کے پوتے ہیں، جسے ہماری حکومت نہ پسند ہو وہ یہاں سے نکل جائے۔ اس سے ملحق جلتی ایک بات اس کے یک بہ مشابہت نے ۱۹۴۵ء میں الجزار میں بھی کہی۔ رہا کمیونسٹ بلاک تو وہاں مسلمانوں کو مشادینے کی کوششیں جو رہی ہے۔ جوتوں کی تیزی کے مختصر سے عرصہ میں روس میں مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ دو لاکھ سے کھٹ کر ایک کروڑ چھ لاکھ رہ گئی ہے۔ آج کل انہیں ان راشن کارڈوں سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے جس کے بغیر وہاں اشیاء ضرورت کی فراہمی خالی ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تم جب چاہو تمہیں نہ رپڑھنے کا حق حاصل ہے۔ مگر حکومت تم کو کھانا نہیں دے گی۔ تم اپنے خدا سے کھانا مانگو۔ یہی سلوک ان کے سانویو گوسدوین و روسی منگیوں پر بھی کیا جاتا ہے۔

اسلام پر گئے انسانی عدل اجتماعی کی وہ بلند چوٹی رہا ہے جس تک اور یہ تہذیب نہ پہنچی ہے نہ پہنچ سکے گی۔ کیونکہ یہ جامع مادہ کی تہذیب ہے جو قتل و غارتگری، خون ریزی اور زبردستی پر مبنی ہے۔

۱۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "الاسلامی دین" اور مصنف کی کتاب "دراسات اسلامیه" لاہاب
۲۔ اسلامی فتوحات کا مزاج ۵

تم عزیز رکھتے ہو۔“

خلافت سے قبل حضرت عثمانؓ کے پاس شام سے ایک تجارتی قافلہ آتا ہے۔ یہ گھوڑوں، روغن زیتون اور منقہ سے لدے ہوئے ایک تیار اونٹوں پر مستعمل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ قحط کی وجہ سے مسلمانوں پر بہت سخت دن گزر رہے تھے۔ بہت سے تاجر آپ کے پاس آکر یہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کی ضرورت مندی سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ ماں ہمارے ہاتھ فروخت کر دیجئے۔ آپ فرماتے ہیں: بڑی خوشی کے ساتھ، یہ بتاؤ کہ مجھے قیمت خرید پر کتنا نفع ہوگا؟ تاجروں نے کہا کہ دو گنے دام لے لیجئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے تو اس سے زیادہ کی پیش کش کی جا چکی ہے۔ وہ لوگ بھونچے ہو کر پوچھتے ہیں کہ ابو عبد اللہؓ کے سارے تاجر تو اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ کوئی دوسرا آدمی ہم سے پہلے آپ سے نہیں ملا ہے، آخر یہ کون ہے جس نے آپ کو یہ پیش کش کی ہے؟ آپ جواب دیتے ہیں، اللہ نے مجھے ایک کے دس دینے کا وعدہ کیا ہے، کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ عثمانؓ نے اللہ کو گواہ ٹھہرا کر اعلان کر دیا کہ اس قافلہ کا سارا مال لشکر کی رہ میں فقراء اور مسکین کے لیے صدقہ ہے۔

علیؓ اور ان کے گھر والوں کے پاس ایک دن ستویں بنی ہوئی تین روٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ روٹیاں انھوں نے ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی پر صدقہ کر دیں۔ یتیم اور قیدی شکم پیٹ ہو گئے اور یہ خود فاقہ کر کے سو رہے۔

حسینؓ پر قرض کا بار بڑھ گیا ہے۔ ابی ترکا نے شمر آپ کی طرف سے مکر آپ اس سے نہیں فروخت کرتے کہ اس سے نہ یہ مسلمان بچپان کا کام لیتے ہیں وہ نہ بیویں کے، ستمناں میں آئے اور آپ بنو ہاشم کے اعلیٰ ترین خاندان کے چشمہ و چراغ بنوتے ہوئے قرض کا بار اٹھانے میں مدینہ میں انصار نے مہاجرین کو اپنے مال اور مکان پر چیزیں شریک ٹھہرایا۔ ان کو اپنا بھائی بنالیا۔ ان کی طرف سے دیت ادا کی۔ ان کے قیدیوں کا فدیہ دیا۔ غرض یہ کہ ان کو بالکل ایسا سا جیسا کہ قرآن خود فرماتا ہے:

وَلَا يَجِدُونَ فِي صَدَقِهِمْ فَرْحًا جَدًّا مِمَّا أَذْنَوْا لُؤْلُؤًا وَنُورًا
عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (الحشر: ۹)

نوح بہاؤ بنوہا سے سب سے پہلے میں تنگی نہیں پاتے اور انھیں اپنے اوپر غم نہ
رکھتے ہیں خود بخود فاقہ کشی میں مبتلا ہوں ؟

جب تک سداۓ مہربان مغرب کی مادی تہذیب کے اثرات سے پاک رہتے ہیں۔ زندگی کے اس
رستہ میں اسلام کی رات کا فرما رہتی ہے۔ اُسناد عبد الرحمن بن عمر رضی اللہ عنہما کتاب الرسالۃ الخالدة میں
لکھتے ہیں :

”میں نے تمہاری فریاد سنی ہے، مرقہ، لٹاؤ، لٹاؤ، یہ بھی تعادلات ہیں، یہ بھی غم کی یہ بھی زندگی ہے۔
کرتے، چھتے، سب سے پہلے کوئی دیکھ کر موت ہی ذات کے لیے نہیں بلکہ مری تمہارے کہ یہ
زندہ رہنا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا کہ کلام یہ ہے جو وہ تمہارے موت کے لیے
رہتا ہے۔ مرنے والے کی موت میں طرہ بند ہے، نہ کہ ایک شے ہی، مستعدہ
فلسفہ کی یہاں سے ہجرت کر کے ان لوگوں کے درمیان میں یہ قیامت کریں
جو وہ سب سے پہلے دیکھ کر سب سے پہلے زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ مطلب
قائم ہے، یہ بات سمجھ کر سب سے پہلے دیکھتے ہیں، اپنے گھر، سب سے
سداۓ گروہ کے پاس چھوڑ دے، قسمت سے سب سے پہلے دیکھ کر سب سے پہلے سب سے
سب سے پہلے میں مدد کا حساب ہو کر رہا ہے۔ مرنے والے کی موت ہی وہ ہے گھر و گھر کے
پاس واپس جاسکے لیکن دو وقت، ایک سال کے بعد میرے پاس پہنچ آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ
اپنے گھر والوں کے پاس سے آ رہا ہے، لیکن اُس نے تردید کی اور کہا کہ میں اب اس قابل ہو گیا
ہوں۔ اپنے گھر والوں کے پاس سے سب سے پہلے دیکھ کر سب سے پہلے دیکھ کر سب سے پہلے دیکھ کر سب سے
مدد گاہ سے وقت غنیمت ہو کچھ ملے گا، اس سے میں نے فارغ ہو کر کیا اور اب میرے پاس اسنا
تہہ ہو گیا ہے۔ میں نے مرقہ کے پاس واپس جاسکوں۔ میں نے چاہا کہ تم اپنے ہاں بچوں کے
پاس واپس جاؤ، مرقہ کے پاس؟ اس نے کہا کہ میں۔ یہ مرقہ کے پاس جاؤں گا
کیونکہ انھوں نے میری غیر ضروری کے دوران میرے ہاں بچوں کو ٹھکانا دیا۔ اب میں
جا کر ان لوگوں کے بچوں کی کفالت کروں گا جو غیر ضروری ہوں، اور مجھے اللہ نے جو کچھ دیا ہے
اسے اپنے اور اپنے پڑوسیوں کے بچوں کے درمیان تقسیم کروں گا، میں نے اس سے چاہی کہ

کیا تمہارے سماج میں پڑوسیوں کے باہمی تعلقات کسی نوعیت کے خیر ہیں جس طرح کے
تم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رکھتے ہو؟ اس نے کہا کہ ہم سب اچھے برے ہیں میں ایک
دوسرے کے برابر نہ یکساں رہتے ہیں۔ جو ضروریات سے نازل ہوتا ہے وہ رکمانے والے
مالک کا حق ہوتا ہے ہم میں سے ہر شخص کو اس بات سے خبر نہ آتی ہے کہ وہ خانی، تھوڑا گھر
واپس جائے۔ بچے گھر والوں سے شرم نہیں آتی بلکہ ان پڑوسیوں سے جو بہار اسی طرح
انتظار کرتے ہیں جس طرح گھر والے؟

اپنا یہ مشاہدہ بیان کرنے کے بعد مصنف اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حقیقت واقعہ کی بہت
صحیح ترجمانی کرتا ہے:

یہ اجتماعی اسپرٹ طوارق کی اس جماعت یا انہی جیسے ہردوں اور صحرائی باشندوں
بیک محدود نہیں۔ نہ یہ ان کی گردہی معصیت کا ثمرہ ہے۔ یہی وہ اسلامی اہل بیت ہے جو آج
ان مردہوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو ہمدرد، قیامت کی فکر سے دور رہتے ہیں۔
میں نے اس رات کو نہ تعب و زحمت میں بھی تعالیٰ اور کارخانہ پابا جو آج سدھی رنگ
میں رکے ہوئے ہیں، خواہ ان کے باشندے ملی ہوں یا علی گڑھ سے ہوں یا کالے اور
خواہ یہ مقامات مشرق میں ہوں، مغرب میں۔ میں نے بہت سے مقامات پر مسلمانوں کو
اب بھی تعاون باہمی اور ایک دوسرے کی فہم دہی میں ہاتھ بٹانے والی بھلی زندگی گزارنے
دیکھا ہے۔ ان کروڑوں انسانوں کی بہ نسبت جو مغرب کی مادی بندوبست فرماتے ہیں یہ لوگ
اب بھی صالح سماج سے بہت قریب ہیں جو اسی قوم، اسی تہذیب، اسی مملکت کو مغلوب
تھا۔ مغرب زدہ لوگ صرف بچے، مطلب سے ذوق رکھتے ہیں یہ ہے جو امت کا شیرازہ
بجھ جائے۔ یہ بچے ہوس کی نگہیں کو خود اپنے گھر والوں کے ساتھ شرم سکے پر مقدم رکھتے
ہیں، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سائل کا نوسواں ہی نہیں پیدا ہوتا۔

یہاں کفالت جس کی تعلیم اسلامی اسپرٹ دیتی ہے، صرف انفرادی اور اجتماعی رعبان کے رحم
و کرم پر نہیں چھوڑ دی گئی۔ حکومت بھی اسے نافذ کرے اور عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کرتی تھی۔ چنانچہ
عزیز بن خطاب نے بیت المال سے دو سو چار سو بچوں، جوڑھوں اور بیماروں کے لیے وظائف مندر کیے

اشنی ص کی طرف توجہ کرو۔ خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم اس کی جوانی دیکھائی کھائیں اور بڑھاپے میں اُسے دعتکار دیں۔ زکوٰۃ فداء اور مساکین کے لیے ہے اور یہ اہل کتاب کے مساکین میں سے ہے آپ نے اس فرد اور سر جیسے دوسرے افراد کو جو یہ سے یہی قرار دیا ہے۔

جب آپ نے دمشق کا سفر کیا تو ایک ایسی بستی سے زرے ہوں کچھ جہرام کے مریض جیسا کہ بتے تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کو زکوٰۃ کی مرد سے مراد دی جائے اور ان کے لیے رشن جاری کیے جائیں تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزرا جب کہ سلام کی رُوح نے عمر کو انسانیت کے س بلند مقام پر پہنچا دیا تھا کہ انھوں نے سماجی تحفظ کو ایک انسانی حق قرار دے دیا کہ کسی مخصوص مذہب یا فرقہ کے ساتھ مشروط نہ تھا جس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا کہ محتاج کا عقیدہ کیا ہے اور وہ کیس شریعت کا پابند ہے۔

یہ وہ مقام بند ہے جس کی طرف اقدام میں آج انسانیت کے قدم تھک چکے ہیں اور وہ اب

بھی بہت دور ہے

سیاسی نظام

ریاست کے باضابطہ سیاسی ورمعاشی نظام کے سلسلہ میں اسلام کی زندگی میں ایک نشانی اور گزرا ہے جس پر تاریخ گواہ ہے۔ افسوس صد افسوس کہ یہ دور زیادہ دیر چل نہ سکا۔ آئندہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اس کا سبب کیا تھا۔ تاکہ مروجہ سببوں کے سبب ہی اور معاشی نظام کی عین لذت میں داخل ہیں جیسا کہ بعض حضرات کا دعویٰ ہے یہ وہ شمار نہ ہوتی اتفاقات میں ہے جس کا اس نظام کے مزاج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سبب سبب سے یہ گھسیٹو نہیں گئے کیونکہ مایہ پائسی عملاً ہمیشہ اس کے تحت اور اس کے مزاج کے تابع رہی ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب ہوا تو آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو بلا بھیجا کہ وہ نماز میں امامت کریں۔ جب حضرت عائشہؓ نے یہ حذر پیش کرنے سے نظر ثانی کی درخواست کی کہ ابو بکرؓ رقیق القصب آدمی ہیں، نماز پڑھنے کھڑے ہوں گے تو لوگ ان کی آواز نہ سن سکیں گے تو آپ کو غصہ آگیا۔ آپ نے نہ ذاتِ یوسفؑ کو پہنکانے والی عورتوں کا ذکر کیا اور حضرت

کو امامت کے لیے بلانے پر اصرار کیا۔

کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ نے اپنے رفیق و رکن کو خلیفہ مقرر کر دیا؟ کیا مسلمانوں

نے اس سے اعتراض ہی سمجھا تھا؟

ہمارے نزدیک یہ دونوں مفروضے دور از قیاس ہیں۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو

خلیفہ مقرر کرنا ہوتا تو اگر خلیفہ بنا کر جانا اس دین میں فرض ہوتا تو جس طرت آپ نے اپنے دین

کے ۱۰۰ سے زائد اصول و احکام بتا دیے تھے اسی طرت خلیفہ بنانے کا کام بھی اسی طرت سے کرنا چاہیے تھا۔

اگر مسلمانوں نے صرف طور پر یہ سمجھ لیا ہوتا کہ آپ ابو بکرؓ کو خلیفہ مقرر فرما رہے ہیں تو سقیفہ میں

مباہلہ اور انصار کے درمیان کسی بحث کا سوا ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ انصار ایسے نہ تھے

کہ رسول اللہ کے فیصلہ پر اعتراض کرتے۔

درحقیقت یہ معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیا گیا تھا تا کہ لوگ خود اطمینان

حاصل کر لیں۔ وہ ۱۰۰ اصول و احکام کو بھی مطمئن کر لیں کہ خلافت کا سب سے زیادہ مستحق کون فرد ہے۔ اگر

سقیفہ کے موقع پر بحث اس نتیجہ تک پہنچی کہ خلیفہ مباہلہ میں سے ہو تو یہ اسلام میں فرض نہیں تھا

بلکہ مسلمانوں کی جماعت میں کس و کھس کے بعد اتفاق رائے سے طے پانے والا ایک فیصلہ تھا۔ انصار

اس فیصلہ کو رد کر سکتے تھے، ان پر اعتراض کوئی نہیں کر سکتا تھا لیکن عملاً یہ ہوا کہ انصار حضرت ابو بکرؓ

کی خلافت پر راضی ہو گئے۔ کیونکہ آپ خلافت کے لیے دوسروں سے زیادہ اہل تھے۔ ان کے سامنے

وہ مقامی عوامل بھی تھے جو مدینہ میں آپ و خیرات کے مابین کام کر رہے تھے۔

اس موقع پر اس متفقہ فیصلہ کا کہ خلافت مباہلہ میں رہے گی یہ مطلب نہیں تھا کہ

خلافت لازماً ذہبی کے انور رہے۔ اگر معاملہ کی نوعیت یہ ہوتی تو حضرت عمرؓ اصحاب ثوری کا

تقریر میں لائے وقت یہ نہ فرماتے کہ ”اگر ابو حذیفہ کے موالی سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ

مقرر کر جاتا“۔ ظاہر ہے کہ سالم مذہبی نہیں تھے۔ پھر سالم کی ردج بھی اس بات سے ایا کرتی ہے

کہ ذہبی کو بعض اس وجہ سے وہ سب سے مسلمانوں سے بڑتر قرار دے دیا جائے کہ وہ ”قریش“ اور

رسول اللہ انصاری کے نسب سے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود یہ فرمایا ہے کہ:

”من ابلا بھ عملہ لھ یسرع بھ نسبہ۔“ (مسلم ابوداؤد۔ ترمذی)

”جس کو اس کے عمل نے چھپے رکھا اُسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھائے گا“

حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر فرما گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو پابند کر دیا تھا۔ اُن کو پورا حق حاصل تھا کہ اس تقرر کو رد کر دیں۔ حضرت عمرؓ اس بناء پر خلیفہ نہیں ہو گئے کہ ابو بکرؓ اُن کو نامزد کر گئے تھے، بلکہ آپؐ کی خلافت لوگوں کے آپ کے ہاتھ بیعت کرے پر منعقد ہوئی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنے بعد چھ اُزاد کی ایک شور مقرر فرمادی جو خلافت کے لیے اپنے اندر سے ایک فرد کا انتخاب کرنے کی ذمہ دار تھی۔ مسلمان اس کے پابند نہ تھے کہ لازماً انھیں چھ میں سے کسی ایک کو منتخب کریں، بلکہ انھوں نے خود سے یہی فیصلہ کیا کیوں کہ حقیقت واقعہ گواہ تھی کہ یہ چھ اُزاد بہترین اُزاد تھے اور عمرؓ کا انتخاب اس حقیقت کے مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے انہی چھ کے اندر سے کسی کا انتخاب مناسب سمجھا۔

حضرت علیؓ کے لیے بیعت میں ایسا ہوا کہ کچھ لوگ اس پر رضی تھے اور کچھ لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں پہلی بار مسلمانوں میں آپس میں جنگ ہوئی۔ اس کے بعد وہ ایسے رونما ہوئے جنہوں نے اسلام کی رُوح، اس کے سیاسی اور اقتصادی اصولوں اور دوسرے شعبوں میں اس کے تصورات کو اور بری طرح مجروح کر دیا۔

اس سب سے جوازہ سے حکومت کے بارے میں اسلام کا اصل نظریہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کا آزادانہ انتخاب وہ واحد چیز ہے جو کسی کو حکمران بنا سکتی ہے۔ حضرت علیؓ کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے، اُن کے داماد اور اُن کے سب سے قریبی رشتہ دار تھے خلافت کے معاملہ میں مؤخر کرتے وقت مسلمان اس حقیقت کو نہ بھجھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ علیؓ کو مؤخر کرنا بالخصوص عمرؓ کے بعد ان کی حق تلفی کر رہا ہو لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس تاریخ کو اسلام کے نظریہ حکومت کی صحیح ترجمانی کے باب میں بہت اہمیت حاصل ہے اس میں یہ مصیحت مضمر تھی کہ رشتہ کا شائبہ بھی اس منصب کے قریب نہ آئے کیونکہ یہ اسلام کی رُوح اور اس کے بنیادی اصولوں سے بعید ترین تصور ہے۔ خلفائے امام کے ساتھ جو حق تلفی بھی ہوئی اس نظریہ کا عملی انداز بہ بہ حال اس سے زیادہ اہم تھا۔

اس کے بعد بنو امیہ کا دور آیا اور انھوں نے اسلامی خلافت کو بنو امیہ کے اندر محصور رہنے والی

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یہ ہے کہ معاویہؓ کے حفاظتی دستہ کے سالار نے حجاز کے ان تمام اہل مدین کے سر پر وہ دو آدمی مسلط کر دیئے جو اس تجویز کے خلاف تھے۔ معاویہؓ نے سالار کو حکم دے دیا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی ذر مبینہ مخالفت میں ایک ہبل بھی منہ سے نکالے تو اس کو یہ دونوں آدمی تلوار کا نشانہ بنادیں۔

پھر معاویہؓ منبر پر آئے اور یہ کہا:

”یہ دو مسلمانوں کے سردار و رہنما ہیں جن کے ہتھکنڈے ان کے لئے کے ہیں کوئی معاملہ نہیں ملے گی اب ان کے دستور کے خلاف کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ان دو لوگوں نے یزید کی خدمت پر رنجی ہو کر بیعت کر لی، تم لوگ بھی شد کا نام لے کر بہت کر لو گے۔
نیا نچو نہ مے بیعت کر لی۔“

یزید کی حکومت اس بنیاد پر قائم ہوئی تھی کہ وہ بنی دجسہ اسلام کبھی بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور خود یہ یزید کون ہے؟ یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں عبد اللہ بن مسفلہ کہتے ہیں:

”خدا کی قسم یزید کے خلاف اس وقت کھڑے ہوئے جب ہمیں یہ اندیشہ ہو چلا کہ ایسا نہ ہو کہ ہر پر آسمان سے پھر سرسائے جائیں۔“ ————— پانچویں، آٹھویں، نویں اور دسویں سورتیں

”ایک ساتھی کا ج کتنا ہے، شہاب بن ابی ذرؓ درمنازیں ترک کرتا ہے۔ خدا کی قسم اگر اور لوگ برے ساتھ نہ ہوتے تو جی میں تھوڑے روز میں نہ ورق باقی دیتا۔“

ہو سکتا ہے کہ یہ یزید کے ایک دشمن کی مبالغہ آمیزی ہو۔ لیکن بعد میں یزید نے عملاً جو کچھ کیا، شہادت حسین رضی اللہ عنہ کو استناب سے طریقہ سے قتل کرنا، بیت اللہ کا محاصرہ اور اس پر شک باری و غیرہ وہ اس بات پر گواہ ہے کہ یزید کے دشمنوں نے ذرؓ بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ صحیح صورت سال کچھ بھی رہی ہو، کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں میں

سے ابن ابی شیبہؓ نے شہرہ جری۔ یہ یقین کے ساتھ بات دینے والا ہے۔ لیکن خود اسلام کے نفع کو بگڑنے سے بچانے کے لیے منافقوں کو کہیں گے کہ تم یہ وہ آیات سمجھتے ہو تو ایسا کرنا اسلام میں نظام حکمرانی کے خلاف ہے۔ ان کے منافی معاہدے ہیں یا خدا اس طرز عمل کو درست نہیں قرار دے سکتا۔

میں صحابہ کرام اور تابعین کے ہوتے ہوئے خلافت کے لیے موزوں ترین ذریعہ تھا۔ اصل غرض یہ تھی کہ حکومت اموی ساندن میں آجائے اور راتقی ملے ختم ہو جائے۔ یہ راجی ن صدام، اسامی شام اور اسلامی راجی ن کے دس میں نیم ہونے کے متذکرہ تھے۔

ان متعاقب نو مجر نے اس لیے پیش کیا ہے کہ صدم میں مورانی بادشاہت کا جو نیا طریقہ بغیر کسی سند کے شروع کیا گیا تھا اس سے صدم کا اس کی روت اور اس کے بنیادی اصولوں کا ہر ہی ہونا واضح ہو جائے۔ اور صدم میں حکمرانی کا تصور اپنی اصل حقیقت کے مطابق سامنے آجائے۔

طرز حکمرانی کے نمونے

اس حقیقت کی نہ تک پہنچنے کے لیے طرزی ہے کہ ہم طرز حکمرانی کے کچھ نمونے مختلف ادوار مثلاً حضرت ابو بکرؓ کے دور، عید حضرت عثمانؓ کے دور، عثمان کے عید اور عید حضرت علیؓ کے عید اور مس طات شاہان ہوائیہ ورن کے بعد بنو عباس کے دور سے سامنے لائیں جو اس وقت آئے جب کہ اسلام کو اس کے ابتدائی دور میں ہی تین زبردست صدم پہنچ چکا تھا

حب مسلمانوں نے نہ تے بوجہ کونہ نہ تے لا معصب منعبانے کو با تو ان کی نظر میں چا کا اس کے مو اور کچھ نہ تے مسلمانوں میں سترے ہیں اور اس کی شہیت کو نافذ کرنے کی ذمہ داری دیکر اس طات کا کوئی خیال ان کے پاس بھی نہیں تھا کہ یہ منسوب ان کے لیے کچھ ایسی چیزیں کو مباح کرتا ہے جو ہوں جب وہ رعیت کے یک طرفہ تھے، بات نہیں تھیں، یا انھیں کوئی نیا حق دیتا ہے جو کل تک نہیں حاصل تھا، اس ذمہ داریوں میں سے کسی ذمہ داری کو ماقصد کرتا ہے۔ — جو کل تک ان کے سر پر تھیں، جی ہے ان ذمہ داریوں کا تعلق آپ کی اپنی ذات سے ہے، یا خاندان و اولاد سے ہو، یا اللہ تعالیٰ سے ہو۔ مقصد میں جب آپ کے ہاتھوں پر جیت ہو چکی ہو کھڑے ہو کر فرمایا:

”اگر میں اپنے فرائض نہ تے سدا سے انجام دوں تو میری مدد کر، ورنہ راجی ختم ہو جائے“

تو مجھے حیدر گرویا سچائی امانت ہے اور جو بے خیانت ہے۔ تم میں جو کمزور ہے

وہ میرے نزدیک طاقتور ہے، اگر میں اس کا حق اسے پہنچا دوں، انشاء اللہ۔

اور جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے، اگر میں اس کے حق وصول کر لوں

انشاء اللہ۔ جب بھی کسی قوم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے جہا چرایا ہے اللہ نے اسے

ذلیل و خوار کر دیا۔ جب بھی کسی قوم میں فحش کا دور دورہ ہوا اللہ نے بلا استثناء سب پر مصیبت نازل کر دی۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں تم لوگ میری اطاعت کرنا، اگر اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر یہی اطاعت کی ذمہ داری نہیں۔

حضرت ابو بکرؓ کا مکان مدینہ سے قریب منج میں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا معمولی مکان تھا۔ جب آپ خلیفہ ہو گئے تب بھی آپ نے نہ مکان بدلانہ خود اس مکان میں کوئی تبدیلی عمل میں لائے منج میں اپنے مکان سے مدینہ تک صبح و شام پیدل آتے اور جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایک گھوڑا سواری میں ہوتا مگر وہ گھوڑا بیت المال کا نہ تھا بلکہ آپ کا تھا۔ جب کام کا بار بڑھ گیا تو آپ مدینہ منتقل ہو گئے۔ تجارت کر کے اپنی رزقی کماتے تھے۔ (منیہ منتخب ہونے کے بعد) صبح ہوئی تو جاکہ کاروبار کے لئے جائیں۔ مسلمانوں نے روک لیا اور کہا، یہ ذمہ داری تجارت کے ساتھ پوری طاعت ادا نہیں کی جاسکتی اس پر آپ نے پوچھا، ایسے انداز میں جیسے کہ رزق منے کے کسی دوسرے طریقہ سے بالکل نا آشنا ہوں! پھر میں کیسے کدرا کروں گا؟ لوگوں نے معاملہ پر غور کیا اور ان کے کاروبار نہ کر سکنے اور فرائض منصبی کے لیے وقف ہو جانے کے عوض بیت المال سے ان کی اور ان کے اہل و عیال کی خوراک کے لیے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کر دیا۔

اس کے بعد جب آپ کی وفات ہوئی تو آپ نے مسلمانوں کے مال سے بری رہنے کی خاطر تو رعایا حکم دیا کہ آپ نے بیت المال سے جو کچھ لیا ہے اس کا حساب کیا جائے، رعایا آپ کی زمین اور دوسرے اموال سے لیکر بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔ صدر نے حاکم و محکوم کے خیمہ کو جس جہ دم بیدارن کا مکلف بنایا ہے اور ہر ذمہ دار کو جو حساس شعور مفا کیا ہے۔ اس کے زیر اثر آپ کا حال یہ تھا کہ رعایا کے ہر ذمہ داریات کے بارے میں خود جواب دہ اور ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں آپ اس حد کو جا پہنچے تھے کہ تنج میں آپ کے پڑوس میں جو ضعیف اور بے سہارا لوگ رہا کرتے تھے ان کی گریوں کو وہ ہنسا آپ نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ جب آپ نے خلافت کا منصب سنبھالا تو ایک لڑکی کو یہ کہتے سنا، اب تو تم ہمارے لیے بکریاں دودھا کر دے گے، آپ نے فرمایا، کیوں نہیں، اپنی جان کی قسم میں تمہاری خاطر انھیں دودھا کروں گا۔“

میں سے کھاؤں گا؟

ایک بار آپ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے ماں میں سے آپ کے لیے کتنا لینا حلال ہے؟ آپ نے فرمایا: ”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں اپنے لیے اس میں کتنا مال سمجھتا ہوں۔ میرے لیے دو کپڑے لینا حلال ہے۔ ایک برقعے کے لیے، ایک گری کے لیے۔ اور حج و عمرہ کرنے کے لیے سو رکعتیں میری اور میرے گھر والوں کی خوراک وہ ہوگی جو قریش کے کسی متوسط گھرانے کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں امام مسلمہ نوں کی طرح ایک مسلمان ہوں، جو ان کو ملے گا، مجھے بھی ملے گا۔“

آپ نے کسی حالت زندگی گزارائی مگر اللہ آپ نے ان چیزوں کے معاملہ میں بھی شدت برقی جن کو اپنے لیے حلال قرار دے چکے تھے، ایک دن بیابان پر گئے۔ خدا کا شہر تھوڑا دیر کی گئی۔ بیت المال میں شہد کا ایک ٹکڑا موجود تھا۔ جب منبر پر تشریف لائے تو فرمایا: ”تم لوگ اجازت دو تو اسے استعمال کر لو۔ ورنہ وہ میرے لیے حرام ہے۔“ لوگوں نے اجازت دے دی۔

مسلمہ نوں نے یہ شدت پسندی دیکھی تو کچھ لوگ آپ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس گئے اور یہ کہا: ”اگر آپ نے اپنے درپردہ شدت اور تنگی کی حد تک پہنچی ہے، اب اللہ تعالیٰ نے رزق میں فراموشی عطا کر دی ہے۔“ ان کو چاہیے کہ اس نئے میں سے حسب خواہش فراموشی کے ساتھ لے لیا کریں۔ مسلمانوں کی طرف سے ان کو ایسا کرنے کی پوری اجازت ہے۔ جب حضرت حفصہ نے آپ سے اس بارے میں گفتگو کی تو جواب دیا: ”اے عمو! میں حفصہ بنو نے اپنی قوم کا ساتھ دیا مگر اپنے آپ کے ساتھ جو بی بی کی۔ میرے گھر والوں کا میرے جان و مال یہ حق ہے مگر میں اور مانتا ہوں نہیں ہے۔“

آپ نے دراپنی رعیت کے درمیان مسرت و بہت اہمیت دینے تھے۔ جب عام ایادہ ہا مشہور رخصت پڑا اور لوگ بھوک کا شکار ہوئے تو آپ نے قسم کھائی کہ جب تک ٹوک بھال نہ ہو جائیں گے کھیں اور گوشت نہ بن پڑے رکھیں گے۔ آپ نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ تیل کھاتے کھاتے بدن کی جلد سوکھ کر سیاہ ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد بازار میں گئی کا ایک ٹکڑا اور دودھ کا ایک مشکیزہ فروخت ہو رہا تھا تو آپ کا ایک غلام اسے چالیس درہم میں خرید لیا۔ اس نے دالیں، کر آپ کو بھایا کہ اب اللہ نے آپ کی قسم پوری کر دی۔ کیونکہ بازار میں گھی کا ایک ٹکڑا اور دودھ کا ایک مشکیزہ ایک کوڑا تھا اور میں نے اسے آپ کے لیے خرید لیا۔ مگر جب آپ کو وہ معلوم ہوئے تو فرمایا کہ بہت افسوس ہے، دونوں چیزیں صدقہ کر دو۔ مجھے اسے ان کر کے کھانا پسند نہیں ہے۔ یہ جھکا کر تھوڑی دیر سوچتے رہے۔ پھر فرمایا: ”جو کچھ رعیت پر گزرتی ہے اگر وہی مجھ پر

نہ گزرے تو مجھے اُن کے مسائل کی صحیح اہمیت کیسے محسوس ہوگی؟

آپ کا نقطہ یہ تھا کہ جس چیز سے رعایا محروم ہو اس سے خود کو بھی محروم کر لیں تاکہ اس کے مسائل کا صحیح اندازہ ہو سکے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا۔ دراصل آپ کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ حکومت کی ذمہ داریاں اٹھ لینے کی وجہ سے آپ کو کچھ ایسے امتیازی حقوق بھی مل جاتے ہیں جن سے دوسرے محروم ہیں۔ آپ سمجھتے تھے کہ اگر اس معاملہ میں عدل پر نہیں قائم رہ سکے تو لوگوں کی اطاعت کے مستحق نہیں رہ جائیں گے۔ اس سے پہلے ہم یمنی چاندوں کا قصہ بیان کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ کس طرح آپ نے خود یہ فرما دیا تھا کہ آپ عدل پر نہ قائم رہ جائیں تو آپ کی اطاعت کی ذمہ داری ساتھ ہو جائیگی یہ بات اسلام کے نظم و نگرانی کا ایک اہم اصول واضح کرتی ہے، یعنی یہ کہ امام غیہ عادل اطاعت کا مستحق نہیں۔ خواہ وہ اللہ ہی کی حاکمیت کا قیام کرنے والا درجہ کی شریعت کو، فخر کرنے والا ہو مگر اپنے فیصلوں میں انصاف نہ کرتا ہو۔

آپ کے ذہن میں یہ سلامتی شعور بہت راسخ تھا۔ ہاں آپ کو اس کا حساس رہتا تھا۔ چنانچہ ایک بار آپ نے ایک آدمی سے ایک گھوڑے کا سول بھاؤ کیا۔ پھر آڑہ کر دیکھنے کی خاطر اس پر سواری کرنے لگے۔ گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہو گیا۔ آپ نے چاہا کہ اسے اُس کے مالک کو واپس کر دیں، لیکن اُس نے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ دونوں یہ مقدمہ لے کر قاضی شریعہ کی عدالت میں گئے۔ انھوں نے دونوں ذوق کے دلائل سننے کے بعد کہا: "ایہ لمہ منین، جو چیز آپ نے خریدی تھی اُسے لے لیجئے، ورنہ جس حال میں اُسے لیا تھا اُسی میں واپس کر دیجئے۔" عدالتوں نے اُسے کہتے ہیں فیصلہ کرنا، "پھر آپ نے شریعہ کو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کے بدلے کوفہ کا قاضی بنادیا۔"

جب سیاست و حکمرانی کے باب میں حضرت عمرؓ کا تصور یہ تھا تو اس کا کرتی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ حکمران کے لئے مزہ و دلق باہ کو رعیت کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں کوئی امتیازی مقام حاصل ہو چنانچہ جب آپ کے صاحبزادے عبدالرحمن نے شہنشاہ بنی تو صحر جباری کو زامانہ می ہو گیا۔ اس سلسلہ میں آپ کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اسی واقعہ میں انھوں نے بڑے بڑے ایک مصری پر زیادتی کی توقعات نہ درج قرار پایا۔ ماں کے بارے میں آپ کی پالیسی یہ رہی کہ عمال حکومت بہ اس اضافے کے بارے میں جواب دہ قرار پائے جو اُن کے اموال میں منصب پر آنے کے بعد ہوا ہو۔ ایسا اس اندیشہ کے تحت کیا گیا کہ یہ اضافے

مسلمانوں کے مال کو نقصان پہنچا کر یا اپنے منصب سے بے جا فائدہ اٹھا کر تو نہیں گئے گئے۔ یہ سوال کہ یہاں سے حاصل ہوا؟ وہ بنیادی اصول ہے جس کے تحت آپ نے جب بھی حقوق و جوہ پاسے اپنے ایک ایک عامل پر گرفت کی۔ چنانچہ وائی مسعود بن العاص کے مال میں سے اسی اصول کے تحت دھا حصہ بیت المال میں لے لیا گیا۔ یہی سلوک آپ نے کوفہ میں اپنے والی سعد بن ابی وقاص کے ساتھ بڑنا۔ اس لیے آپ نے ابو بکرؓ کا مال ضبط کر لیا جو بحدہ میں آپ کے والی تھے۔

حضرت عمرؓ نے تصور حکمرانی کا خلاصہ یہ ہے کہ رعیت دین کی حدود میں رہتے ہوئے اطاعت و فاداری اور خیر خواہی کرے اور راعی عدل اور بہی خواہی کرے۔ چنانچہ آپ نے اپنی رعایا کے ایک فرد کی اس بات کو بجا تسلیم کیا کہ اگر ہم نے تیرے اندر کج دیکھی تو اسے اپنی تلواروں سے سیدھا کر دیں گے۔ گویا آپ نے یہ سوال تسلیم کیا کہ رعیت کو حاکم کی نصیحت اور رہتی کا حق حاصل ہے۔ یک دن آپ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: میں نے تم پر اپنے تمام کلمات سے یہ نہیں کیا ہے کہ تمہارے منہ پر ہانچے مارے۔ تمہاری عزت و آبرو پر حریف رکھیں اور تمہارے اموال غصب کرتے پھریں۔ میں نے انہیں اس پر مقرر کیا ہے کہ وہ تمہیں تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں۔ اب اگر کسی شخص پر کوئی عامل ظلم کرتا ہے تو اس کو میری طرف سے اس کی مطلق اجازت نہیں، اس شخص کو چاہیے کہ معاملہ کو میرے سامنے رکھے تاکہ میں اس معاملے سے بددلوں۔ اس طے آپ نے تمام کے ان حدود اختیار کی نشان دہی فرمادی جن سے تجاوز صحیح نہیں۔

حاکم کی ذمہ داریوں کی گہرائی کا بھی شدید احساس تھا جس کی وجہ سے آپ نے یہ نہیں گوارا کیا کہ خطاب کے خاندان میں سے اس بار کو اٹھانے والے ایک شخص دہریوں۔ چنانچہ آپ نے صاف صاف منع کر دیا کہ آپ کے بیٹے بعد ازاں اس کے لیے نہ چن جائے۔ مگر چچہ آپ نے انہیں اصحاب شوریٰ میں شامل رکھا تھا۔ اس موقع پر آپ نے وہ مشہور رجمدہ باب جو آپ کے تصور خلافت کی بہت صحیح ترجمانی کرتا ہے:

”ہم کو تمہارے معاملات کی ذمہ داری اپنے سر پہنے گا، رکھی شوق نہیں۔ میرے خود لیے اچھا نہیں پایا کہ اب اپنے خاندان میں سے کسی اور کے لیے اس کی تن کرے۔ اگر یہ واقعی خیر ہے تو ہم اس میں سے پنا حصہ پا چکا، اور اگر یہ شر ہے تو آں عرض کے لیے یہی کافی ہے کہ ان میں

کے ایک آدمی سے مل سکا ہے۔

حضرت عثمانؓ کا طرزِ حکمرانی

بہ شک کر دینا حقیقت ہے کہ اس میں یہ تصوف حضرت عثمانؓ کے مہذب کچھ بدل گیا تھا،
مکتبہ میں تب ہی ہے۔ یہ وہ دور ہے کہ نہ ہی تھا۔

نعمان کا بارِ رحمت تھا کہ اس وقت جب آپ کوئی بار مجھے پہنچے تھے اور ان کی تیار
وہ وہی احمد بابت سے معصوم تھے یہ سب سے پہلی بار وہی احمد بابت سے معصوم تھے
عبداللہ سیفیت اور پھر شہداء اور ان سے آپ کی یہ معصومیت و شفقت ان کو باوجود
بغض اپنے قد و قامت کے بھی نہ کر سکتے تھے نہ ان کے بارے میں جو آپ کے پاس موجود
تھے ان کو اس کے ساتھ ساتھ جو اس وقت میں بھی دہل رہے تھے اس کے باوجود

صدرِ مکتبہ

حضرت عثمانؓ نے اپنے دور میں ان کی شہادت کے ساتھ ہی ان کے ہر ایک عمل سے ان کو درجہ عطا
کیے۔ انھیں جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی
و یہ خواہش تھی کہ ان کو ان کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی
معصومیت و رحمت سے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی
و یہ ہے کہ جب کہ اس وقت کا دور تھا کہ اس وقت میں جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی
و ہاں شہداء و مسلمانوں کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی
ہر دور باہر ہو گیا۔ اس نے اس اس خفاق کے عوض یہ ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
زندگی میں آپ کی رحمت سے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی
پر غصہ آگیا۔ اس کا خمیہ نہ سیفیت و مسلمانوں کے لئے جوئی و مسلمانوں کے لئے جوئی
کی بھی گنجائش نہیں یا ماننا تھا۔ انھوں نے زمر بن رقیع سے کہا: ”ابن رقیع تم کہتے ہو کہ وہ آدمی
مل جائے گا۔“

اس واقعہ کے توثیق کی مثالیں حضرت عثمانؓ کے یہاں بہت ملتی ہیں۔ آپ نے ایک دن ذیہر کو

چھ لاکھ عطا کیا، طلحہ کو دو لاکھ دیا اور مدان بن احمد کو اونیس لاکھ عطا کر دیا اس پر بھی بے کی ایک جماعت نے جس کے سید حضرت علیؑ تھے آپ پر مدح کیا تو آپ نے جواب دیا کہ: ”میرے بھی کچھ منبر اور اور شہداء اور میں زمین کے ساتھ مجھے حسن سلوک کرنا چاہیے، تو کوئی نے میں کو قابلِ مہمان قرار دے ہوئے سوال کیا، ”کیا ابو بکرؓ و عمرؓ کے عزیز و رشتہ دار تھے؟“ آپ کا جواب یہ تھا کہ ابو بکرؓ و عمرؓ اپنے رشتہ داروں کو محمد و مرکو کر اللہ سے اجر کے متوقع ہوتے تھے اور میں ان کو مصیبت سے کرہر کی توقع کرتا ہوں، اس پر یہ لوگ غصہ ہو کر یہ کہتے ہوئے اس کے پاس سے تشریف آئے کہ: ”خدا کی قسم اگر یہ بات ہے تو ان دونوں کی روش ہمیں آپ کی روش سے زیادہ محبوب ہے۔“

مال کے علاوہ منصب و ریت کا حال یہ تھا کہ ممان کے اعزاء پر اس کی بارش ہو رہی ہے ابھی لوگوں میں معاویہؓ بھی شامل ہیں جن کی سبقت میں خاندان کے حضرت عثمانؓ نے فلسطین و دمشق کو بھی شامل کر دیا۔ ان کو چاروں فوجوں کا کمانڈر بنا دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس بات کے لیے رد ہوا کرہی کہ مال و فوجیں تنہا کر چکے تھے حضرت علیؓ کی خدمت کے زمانہ میں سلطنت کے دعویٰ درج کر کھڑے ہو سکیں۔ ابھی لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رد کردہ صلہ بن عامر بھی شامل تھا جس کو حضرت عثمانؓ نے پناہ دی تھی اور جس کے لڑکے مدون بن احمد کو پناہ بخشی رہا یہ مقرر کیا تھا اور اس کا رضائی چائی عبداللہ بن سعد بن ابی اسد بھی۔

معاویہؓ کرہم سلطان کا تاج کے حامل ان فرمانات کو دیکر دوڑ دوڑ کر مدینہ آتے تاکہ اسلامی روایات کو بکڑانے سے روک لیں مسلمانوں کو زبانی سے بچائیں۔ مکہ میں کچھ سال یہ تھا کہ بڑھاپے اور زہیفہ العی کے سبب مدون پر ان کا کوئی کسب و کار نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اندر صحیح اسلامی سہت کے کارفرما ہونے کا سبب ہے ان کے اہل و عیال کا رہنا یا شبہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ بات بھی اس سے کہہ کر دیکھیں کہ وہ نہیں سہت سے پاک قرار دیں غلطی کا سبب ہمارے نزدیک مدان کی وزارت اور حضرت عثمانؓ کا بڑھاپا تھا

ایک بار لوگوں نے جمع ہو کر حضرت علیؓ بن ابی طالب کے یہاں قیام کی ڈالی کہ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس جا کر ان سے گفتگو کریں۔ آپ ان کے پاس گئے اور یہ دمایا:

”میرے پیچھے ہوام میں جنہوں نے مجھ سے آپ کی بابت گفتگو کی ہے مگر صد کی قسم

”خدا کی قسم میں خوب جانتا تھا کہ وہ کسی کچھ کہیں گے جو تم نے کہا۔ سنو! خدا کی قسم اگر میری جگہ تم ہوتے تو نہ میں تم پر سخت گیری کرتا نہ غیب ہمارا نہ ابرو تنہا نہ کسے کے لیے، اکیدا چھوڑ دیتا۔ میں یہ اعتراض لے کر نہ کھڑا ہوتا کہ تم نے صلہ رحمی کیوں کی؟ کسی حاجت مند کی حاجت روائی کیوں کی؟ کیوں کسی خستہ حال بڑے کو سہارا دیا؟“ کیوں ایسے لوگوں کو دوایت کا منصب دیا جس قسم کے لوگوں کو جو بھی یہ منصب دیا کرتے تھے؟ علیؑ میں تمہیں خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں، کیا تم نہیں جانتے کہ مغیرہ بن شعبہ اس منصب پر فائز ہے؟“

انہوں نے کہا: ”ہاں! خوب جانتا ہوں۔“

عثمانؓ نے کہا: ”جانتے ہو نا کہ اسے عمر غزوے والی بنایا تھا؟“

علیؑ: ”ہاں۔“

عثمانؓ: ”پھر اگر میں نے رستہ دہری اور تو بہت کی وجہ سے ابن عامر کو دوا بنایا تو تم اس پر غصے کیوں ملامت کرتے ہو؟“

علیؑ: ”میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حقیقت حال کیا ہے۔ عمر غزوے کی بنائے تھے ان کا جوتا اس کے سر پر ہوتا تھا، اس کے خلاف ایک حرف بھی نہ تھا نہ بتایا تو اسے نو سادہ ہونے کا ٹکڑہ دیتے۔ یہ سادہ کو ان کی مدت پنہا کر دے دیتے۔ یہی چیز ہے جو آپ نہیں کرتے۔ آپ نہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نرمی برتتے ہیں۔“

عثمانؓ: ”اور تمہارا سے قربت دوسرے کے ساتھ بھی تو۔“

علیؑ: ”بلکہ سب ان کا مجھ سے قریبی رشتہ ہے۔ یہیں دوسرے ان سے فاصل ہیں۔“

عثمانؓ: ”تم جانتے ہو کہ عمر غزوے کی معرفت کے بعد اسے صلہ رحمی میں مدد دی گئی کوئی بنا ہے رکھا۔ پھر میں نے بھی نہیں دی۔ برقرار رہا۔“

علیؑ: ”میں آپ کو خدا کی قسم دلا کر بتا رہا ہوں، آپ جانتے ہیں نا کہ مسادہ غزوے اس سے زیادہ ڈرتے تھے جتنا عمر غزوے کا غلام یہ قاعہ اس سے ڈرتا تھا۔“

عثمانؓ: ”میں۔“

حق پر ہمارے دل سے یہ سچا ہے کہ ہم نے جتنے بھی دیکھے ہیں وہ
 سچے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یہ سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 یہ سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ یہ سچا ہے کہ

بارگاہِ حق کے بارگاہِ حق میں حق و باطل اور حق و باطل
 کی تمیز میں سب سے زیادہ سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 مسلمانوں کو سمجھنے میں سب سے زیادہ سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 یہ سب سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ

موت کے بعد بھی حق میں سب سے زیادہ سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 جب کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 یہ سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 تو ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 یہ سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 علیہ السلام کی موت کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 یہ سچا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ

اس کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ

سب کے سب ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ہم نے دیکھا ہے کہ
 دوسرے میں لگ میں قدم جمالینے کا موقع مل گیا۔ مگر برحق یہ ہے کہ آئندہ بیان کیا جائے گا، حضرت
 عثمانؓ کی پالیسی کے نتیجے میں وہ انتقام بڑھ گیا اور آپ کے خلاف شورش نے انتہا اسلامیہ کی بنیادوں
 کو بالکل ابتدائی دور میں ہلا کر رکھ دیا۔

اس عرصہ کی تاریخ اور اس کے حالات اس دین کی جن خوبیوں پر گواہ ہیں ان کے ساتھ ہی وہ زندگی

اور حکومت نے حکمرانوں اور رعایا کے حقوق کے بارے میں انسانوں کے تصورات میں یک زہر دست انقلاب کا پتہ دیتے ہیں۔ لہذا جو فتنہ رون ہوا اس کی خط ناک اور اس کے دہر میں نثرات کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔

حضرت عثمانؓ کے بعد

حضرت عثمانؓ اپنے یہودی کارکنی آغوش رحمت میں جالیے۔ وہ موی سلطنت ملاق نم ہو چکی تھی۔ اور اس کے سیلاب خود انھوں نے فہم کیے تھے۔ ساری مملکت بالخصوص شام میں ان کو فہم دینے کا موقع ملا۔ آپ نے بنو امیہ کے اپنے اصولوں کو جو سلامی رون کے منافی تھے، شہداء غنیمت، منافع و رد و سہی طر کے اموال کو اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لینا، بجائی چارہ، ایتار اور کفالت باہمی سے نا پر داسی برتنا وغیرہ..... کار فاما بنے کا موقع ملا۔ اس چیز نے ملت اسلام کے اندر دینی رون کو بہت کمزور کر دیا۔ وہ جذبات بھی کم ہونے لگے جو رستہ کے دن سب کھی ہی طور پر اور کھی بے جا طور پر ان باتوں کے رد عمل میں پیدا ہوئے۔ غلیظہ نے رشتہ داروں کے ساتھ تراجی سلوک روا رکھا ہے، انھیں لاکھوں کی رقمیں انعام میں دیتا ہے، رسول اللہ کے دشمنوں کو دلی مہر رکھنے کے لیے آپ کے صحابیوں کو معذوں کر دیتا ہے، اور اب ذرا جیسے جیوں یزید و اس نے سختی کرتا ہے کہ وہ منا کو جمع کر کے نزنوں میں رکھنے اور اس عیش پرستی کی مخالفت کرتے تھے جس میں ہل ثروت ڈوبے ہوئے تھے ابو ذرؓ نے اس انفاق، حسن سلوک اور پاک بازی کی دعوت بلند کی جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی تھی۔ اس قسم کے جذبات سب عام ہو جاتے ہیں تو ان کا قدرتی نتیجہ صحیح باخطا بہ حال ہی ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے اندر بعات کا مادہ ابھرنے لگتا، رنج کے نمر بھٹا پیدا ہو جاتے جن لوگوں کے دلوں میں دین کی رون گھر کر چکی ہوتی ہے وہ ان باتوں پر ن موش کو ناہ سمجھنے لگتے ہیں اور ان کے خلاف جذبات ان کو بعات پر ابھارتے ہیں، اور جن لوگوں نے اسلام کو محض یک لبادہ کے طور پر اڈرہ رکھا ہوتا ہے، جن کو دنیا کی ہوس نے پیچھے دوڑاتی رہتی ہے، جو بہ وقت ہوا کے رخ کے ساتھ اپنا رخ بدلنے کے لیے تیار رہتے ہیں، ان کے ذات بگڑ جاتے ہیں و ر بد عنوانیوں کی طر بھک جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ حضرت عثمانؓ کے بہر خلافت کے آخری زمانہ میں پیش آیا تھا۔

جب حضرت علیؓ مندر خلافت میں آئے و صلاحات حال کوئی آسان کام نہ رہ گیا تھا۔ عثمانؓ کے

عید میں جن سے نفع اندہ زریاں کی تھیں انہیں گھر ہوا بیتہ نے ابھی طاعت یہ جان لیا تھا کہ علیؑ ان کے معاملہ میں اپنے نہ بیٹھیں گے۔ اپنے مصالح کے تحت وہ قدرتی طور پر معاویہؓ کی طرف مائل ہوئے۔

میں نے ان سے کہا کہ تم لوگو! اس سے پہلے کہ ایک بار سحر سحر کے صلہ میں ان کو ان کا معاملہ بنائیں۔ آپ کا حال یہ تھا کہ آپ کی بیوی اپنے بھائیوں سے جو بیٹی تھیں اور وہ ہی آپ کی نندا تھی۔ ایک بار جوگی ایک بوری پر بکر رہے تھے۔ ذرا دیر میں اپنے پیٹ میں صرف وہی چیز داخل کرنا پسند کرتا ہوں جسے میں جانتا ہوں کہ حلال و طیب ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ کو چاہا کہ وہاں نہ رہنے کے لیے اپنی تہذیب و سنت کی بنیادوں پر وہاں قیام کرنا پسند نہیں فرمایا۔ ان کے بھائیوں کو وقت بیک وقت ان میں غریب ملک رہا کرتے تھے۔ آپ کی طرز معیشت کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے جو آپ کی بابت نفع بن منصور نے متبعین حاضر سے روایت کرتے ہوئے بیان کی ہے کہ جب اس مملکت میں یہ سلام کے پاس گیا تو ان کے سامنے کھڑا ہوا اور اس کی بوسے میں طلیف ہو کر اس میں رہائی دے گا۔ اسی کا ذکر بھی ہے کہ میں نے کہا: یہ مومنین کیا آپ ایسی چیزیں کھاتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا: ہاں، خوب رس، مدنی، اند علیہ وسلم اس سے زیادہ روکھ سوکھا کھاتے اور اس سے بھی زیادہ پیٹتے تھے۔ آپ نے اپنے لباس کی ٹوٹ شادی، اگر میں ان کی روش پر نہ چوں تو اندیشہ ہے کہ ان کے ساتھ نہ نصیب ہوگا۔ اسی طرح ہر بنی بنی نے اپنے باپ سے آپ کے بارے میں روایت کی ہے کہ: میں خورق میں مٹی کے پاس گیا، جاڑے کا موسم تھا اور ان کے بدن پر صرف ایک پٹری، نا طیبہ، ٹھکی (بہ) تھا۔ ان میں سے تھوڑا کھانا کھاتے تھے۔ میں نے عرض کیا: امیر مومنین! اللہ نے آپ کو آپ کے نعمتوں کے لیے اس میں کچھ حق متد رکھا ہے اور آپ اپنے سامنے یہ بڑا راز ہے کہ آپ نے فرمایا: اللہ میں تمہارا کوئی نقصان نہیں کروں گا۔ یہ یہ ادبی قبطینہ ہے جسے میں مدینہ سے لایا تھا۔

ابا نہیں صا کہ حضرت علیؑ اپنے اور اپنے گھروں کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے وقت اس حقیقت سے نا آشنا رہے ہوں کہ دین اس سے بہت زیادہ کی اجازت دیتا ہے۔ وہ یہ ضروری نہیں قرار دیتا کہ اپنے کو ہر بنی کے آس پاس سے محروم رکھ کر رکھ کر دیکھے سوکھے اور موٹے جوٹے پر قناعت کرتے ہوئے ایک ذرا بڑا زندگی گزار دی جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت بھی مسلمانوں کے

ایک عام فود کی حیثیت میں بیت المال سے ان کا حصہ اس سے کئی گنا زیادہ تھا جو وہ لے رہے تھے۔ نیز یہ بھی کہ بحیثیت ایک حاکم کے جو عوام کی خدمت کے لیے وقف ہو ان کا حصہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ چاہتے تو اتنا لے سکتے تھے جتنے عرفہ نے بعض مالک کے والیوں کے لیے مقرر کیا تھا۔ حضرت عرفہ نے جب عمار بن یاسر کو کوفہ کا وکیل بنایا تو ان کے اور ان کے معاونین کے لیے چھ سو درہم ماہانہ مقرر کیے۔ عام فود کی طرحت جو مطاء ان کے حصہ میں آتی تھی وہ علیحدہ، نیز روزانہ آدھی بکری اور آدھی بوری آماد یا جاتا تھا۔ اس طرحت آپ نے عبداللہ بن مسعود کو کوفہ میں لوگوں کی غلبہ اور بیت المال کی نگرانی پر مامور کیا تو سودرہم ماہانہ اور چوتھائی بکری روزانہ مقرر کیا۔ عثمان بن حنیف کے لیے اس سالانہ عطاء کے علاوہ جو پانچ سو درہم کے بقدر تھی، چوتھائی بکری روزانہ اور ڈیڑھ سودرہم ماہانہ مقرر کیا۔

علیؑ نے اپنے ساتھ جو کچھ کیا وہ ان باتوں سے ناواقف رہنے ہوئے نہیں کیا۔ دراصل وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ حاکم نمونہ بنتا ہے، اور اس پر شک کی بھی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ چوں کہ خزانہ عام اس کے تحت ہوتا ہے لہذا اس پر اس میں فرد ہر ذکا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے والیوں اور عام رعایا کے لیے احتیاط و پرہیزگاری میں نمونہ بنتا ہے۔ چنانچہ اپنے اپنے نفس کو ابو بکرؓ اور عرفہؓ کی عادتوں کا پابند بنایا۔ جو لوگ اللہ کے دین پر رسول اللہ کے نائب مقرر ہوئے تھے ان کے لیے یہ ادنیٰ معیار ہی موزوں تھا۔

حضرت علیؑ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ تمام حکومت ۱۰۰ بارہ سو سانس میں ڈھالیں جس میں بنی ہاشم علیہ وسلم اور آپ کے بعد آنے والے دونوں خلفاء نے اُسے ڈھالا تھا۔ انھوں نے اپنی زرہ یک عیب کی کے پاس پائی۔ اسے لے کر اپنے قاضی شیعہ کے پاس گئے اور رعایا کے ایک عام فود کی طرحت اس کے خلاف ایک مقدمہ پڑ کیا۔ فرمایا: ”یہ زرہ میری ہے اور میں نے نہ اسے فروخت کیا ہے نہ ہبہ کیا ہے۔“ شیعہ نے عیسائی سے دریافت کیا ”ایم المؤمنین جو کچھ رہے ہیں اس کی بابت تمہیں کیا کہنا ہے؟“ اس عیسائی نے کہا: ”زرہ تو یقیناً یہی ہے مداریم المؤمنین بھی یہ سے نزدیک جھوٹے آدمی ہیں۔“ شیعہ نے علیؑ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: ”ایم المؤمنین! کوئی ثبوت ہے؟“ حضرت علیؑ نے جواب دیا: ”یہ نے شکیک کہا، میرے پاس ثبوت تو ہے نہیں۔“

امام منتخب کرے نہ کہ فوق کی طاقت یا وراثت کے ذریعہ۔ آپ منتخب ہوئے اور یہ فرمایا:

”وگوئیجے اس دفعہ، رہی کی کرامتیں میں میری رائے لیے بغیر بلا طلب اور غرض مسلمانوں سے

متعارف کیے ہوئے مسئلہ کرنا گیا۔ میری ہیئت کا جوئی، دقتہا رہی گردنوں میں چڑا ہو ہے

اسے میں خود کہ کرتا ہوں اور نہ خود کسی کو منتخب کر رہا ہوں“

لوگ پکارا اٹھے: امیر المومنین! ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں۔ آپ کی امارت پر ہم سب راضی

ہیں۔ اللہ آپ کی امارت کو مبارک کرے۔ آپ صاحب امر بیٹے۔ اس طاعت آپ نے امارت کے معاملہ

میں اصل طریقہ کو پھر سے جاری کیا۔ یہی وہ بغیر مشورے، دروغ منہ کی امارت نہیں منقسم ہو سکتی۔

پھر آپ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”وگوئیجے اس دفعہ، رہی کی کرامتیں میں میری رائے لیے بغیر بلا طلب اور غرض مسلمانوں سے

متعارف کیے ہوئے مسئلہ کرنا گیا۔ میری ہیئت کا جوئی، دقتہا رہی گردنوں میں چڑا ہو ہے

اسے میں خود کہ کرتا ہوں اور نہ خود کسی کو منتخب کر رہا ہوں“

لوگ پکارا اٹھے: امیر المومنین! ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں۔ آپ کی امارت پر ہم سب راضی

ہیں۔ اللہ آپ کی امارت کو مبارک کرے۔ آپ صاحب امر بیٹے۔ اس طاعت آپ نے امارت کے معاملہ

میں اصل طریقہ کو پھر سے جاری کیا۔ یہی وہ بغیر مشورے، دروغ منہ کی امارت نہیں منقسم ہو سکتی۔

پھر آپ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”ابتدا خود اپنی ذات سے کی۔ فرمایا: مناسب ہے کہ اپنے سے پہلے کسی اور سے اس کی ابتدا نہ کروں۔ چنانچہ

آپ نے اپنے تحت جو آراضی اور دوسرے سامان تھے ان کا یہ نذرہ یہاں سب کے سب آپ کے قبضہ سے

نکل گئے۔ یہاں تک کہ باتوں میں ایک کوٹھی تھی اس کے ٹک کو بچا تا فرمایا: اسے ولید نے مغربی علاقوں

سے آنے والے اموال میں سے بغیر کسی حق کے چھوڑ دیا۔ باقی اپنے لیے اتنا واپس کر دیا۔ آپ کے پاس جتنی

بھاگیہ میں تھیں وہ سب آپ نے واپس کر دیں۔ آپ کے پاس رہا رہا میں چند بھاگیہ میں زمین میں مکیدیں اور

جہل اور مس اور فدک تھے ان سب کو آپ نے قبول فرمایا اور مسلمانوں کو واپس کر دیا۔ صرف سویدار میں ایک

چشمہ کو اپنے پاس باقی رکھا جسے آپ نے اپنی مرضی کی رقم سے کھردریا تھا۔ اس کے منافع ہر سال آپ کے

پاس آتے رہتے تھے جو کم و بیش ڈیڑھ سو دینار تھے۔“

کہا کہ: "عمر بن الخطاب کے پاس ذاتی مال کچھ نہیں تھا اور میرا حال یہ ہے کہ میری ذاتی مال ہی میرے لیے کافی ہو جاتا ہے۔"

آپ نے بنی مروان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ان کے پاس جو اموال ناحق انہیں ان کے اصل مالکوں کو واپس کر دیں۔ روایت ہے کہ حمص کا ایک ذنی آیا اور اس نے کہا: "ایہ امومنین! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں۔ آپ نے کہا کس معاملہ میں؟" اس نے بتایا کہ عباس بن ولید بن عبد الملک نے میری زمین غصب کر لی ہے۔ عباس وہیں پر بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے اس سے کہا: "عباس کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: "یہ زمین مجھے امیر المؤمنین ولید بن عبد الملک نے دی تھی، انہوں نے اس بارے میں مجھے ایک تھکیر لکھوائی ہے۔ آپ نے پوچھا: "ذنی! آپ کیا کہتے ہو؟" اس نے کہا: "ایہ امومنین! میں آپ سے کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کا مطالبہ کرتا ہوں۔" عمرؓ نے کہا: "ہاں! ولید بن عبد الملک کی تھکیر کے مقابلہ میں اللہ کا فرمان زیادہ جیسا ہے۔ عباس! تم اس کو اس کی چیز واپس کر دو، چنانچہ انہوں نے وہ زمین اسے واپس کر دی۔"

ولید بن عبد الملک کا ایک لڑکا تھا جس کا نام مروان تھا۔ اس نے باپ میں پرورش پائی تھی اور بالکل اعرابی معلوم ہوتا تھا۔ کچھ لوگ مروان کے پاس حمص میں واقع چند دوکانوں کی بابت مقدمہ لے کر آئے۔ یہ دوکانیں راسل ان لوگوں کی تھیں مگر روتوں کے باپ ولید نے اس کے نام لکھی تھیں۔ مروان نے اس سے کہا کہ ان کی دوکانیں واپس کر دو۔ روتوں نے جواب دیا کہ دوکانیں ولید کی دستاویز کے مطابق میری ملکیت ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ "ولید کی دستاویز تمہارے کام نہیں آئے گی۔ دوکانیں ان لوگوں کی ہیں، اس بات پر ثبوت فراہم ہو چکا ہے۔ اب مروان کی دوکانیں ان کے حوالے کر دو۔" پھر روتوں اور حمص کا ایک آدمی اٹھ کر دوکان سے واپس آنے لگے۔ راستہ میں روتوں نے حمص کو دھمکی دی۔ وہ لوٹ کر مروان کے پاس آیا اور کہا کہ: "ایہ امومنین! خدائی قسم! مجھے دھمکی دے رہا ہے۔" مروان نے کعب بن صامد سے جو ان کے محافظ ستوں کے سالر تھے حکم دیا کہ روتوں کے پاس باوجود ان کے دوکانیں اس کے حوالے کر دے تو خیر ورنہ اس کا سر کاٹ کر میرے پاس آؤ۔ یہ بات سن کر روتوں کا ایک بھی خواہ دربار سے باہر آیا اور روتوں کو عمرؓ کے حکم سے پانچ کر دیا۔ روتوں کے ہوش اڑ گئے۔ کعب اس کے پاس اس حال میں گئے کہ تلوار کو ایک بالشت کے بقدر نیام سے مابہ بکھینچا چکے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ چلو اور دوکانیں

مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ غصہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے وہ تحریر اٹھا کر پھینک دی جس میں چک مرقوم تھا۔ عمرؓ نے کہا کہ تحریر اپنے پاس رکھنے میں حرج نہیں، ممکن ہے تم پر کوئی ایسا حکم آئے جو اس مال کے سلسلہ میں مجھ سے زیادہ جری ہو اور اس چک کی تعمیل کرادے۔ چنانچہ میں نے اُسے اٹھالیا اور باہر نکل کر بنو امیہ کے پاس آیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ اس سلسلہ میں کیا ہوا۔ وہ بولی اٹھے کہ اس کے بعد کوئی امید نہیں رہی باقی تم جا کر ان سے درخواست کرو کہ ہمیں دوسرے ملاقوں میں جا بسنے کی اجازت دے دیں۔ میں آپ کے پاس واپس گیا اور کہا: امیر المومنین آپ کی قوم کے لوگ دروازے پر کھڑے آپ سے اس بات کے جوابات ہیں کہ جو وظائف پہلے ملا کرتے تھے وہ اب بھی ملتے رہیں۔ عمرؓ نے جواب دیا: بخدا! یہ مال میری ملکیت نہیں ہے اور نہ مجھے ایسا کرنے کی کوئی گنجائش نظر آتی ہے۔ میں نے کہا: امیر المومنین! ایسی شکل میں وہ آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ ان کو مختلف ممالک میں جا کر قسمت آزمائی کرنے کی اجازت دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جو چاہیں کریں، میری طرف سے اجازت ہے۔ میں نے کہا: میں بھی یہاں کرنے والا ہوں۔ آپ نے کہا: ہاں تمہیں بھی اجازت ہے مگر میری رائے یہ ہے کہ تم ٹھیکہ دو۔ تمہارے پاس نقد سرمایہ بہت ہے اور میں سلیمان کا ترکہ فروخت کرنے والا ہوں، ہو سکتا ہے اس میں سے تم کوئی ایسی چیز خرید سکو جس کے منافع سے تمہارے اس نقصان کی تلافی ہو جائے۔ غصہ کہتے ہیں کہ: چنانچہ میں وہیں مقیم رہا اور میں نے سلیمان کے ترکہ میں سے ایک لاکھ کا مال خریدا اور اُسے عراق لے جا کر دو لاکھ دینار میں فروخت کیا۔ وہ چک بھی زندہ محفوظ رکھا اور عمرؓ کی وفات کے بعد جب بنو ہاشم نے عبد الملک حکمران ہوئے تو میں سلیمان کی تدبیر ان کے پاس لے گیا اور انھوں نے اس کی تعمیل کرادی۔“

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے بنو مروان کو جمع کر کے یہ کہا کہ تمہیں شرف و عزت اور مال و دولت سب کچھ نصیب ہوا ہے۔ یہ اندازہ ہے کہ اس اُمت کی مجبوری دولت کا نصف یا دو تہائی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ لہذا لوگوں کے جو حقوق تمہارے قبضہ میں ہیں ان کو انھیں واپس کر دو، اور مجھے اس بات پر مجبور نہ کرو کہ میں تمام ناپسندیدگی تم کو ایسی باتوں پر مجبور کروں جو تمہیں ناگوار گزریں۔ لیکن کسی نے بھی اس کا جواب نہیں دیا۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ مجھے جواب دو۔ نو ان میں سے ایک شخص نے کہا: خدا کی قسم ہم ان اموال سے دست بردار نہیں ہوں گے جو کہ ہمیں اپنے آباء سے ملے ہیں۔ ہم اس طاع اپنے بیٹوں کو مفاسد بنانا اور اپنے آباء کی ناشکری کرنا نہیں گوارا کر سکتے۔ اتنا کہ ہمارے سترن سے جدا ہو جائیں۔ عمرؓ نے کہا:

زندگی قسم اگر مجھے سب بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ تم میرے خلاف انہی عوام کو سانف کر لو گے جن کے لیے میں ان حقوق کا مطالبہ کر رہا ہوں تو میں بہت جلد تم کو جیل کر رکھ دیتا۔ مگر مجھے فتنہ کا خطرہ ہے۔ اگر تم نے مجھے باقی رکھنا تو سنت، سدریں، حق، روبرو اس کا حق اور مردوں کا سچ

لیکن آپ اپنی خواہش کے مطابق ہی زندگی نہ پاسکے کہ سب کے حقوق واپس نہ لواسکتے۔ آپ کے جد وہ دگ آئے جو منہ سے بیٹھ کر میرے بیٹے کے طریقہ پر چلے۔ جب بنو قبا سے آئے تو وہ بھی بادشاہ بن کر آئے۔ وہ آئے خوف دہانہں پہنچے تھے۔ دگ اپنی حور و حق سے بہت دور چلے گئے کیوں کہ میں نے ایک طویل مدت تک انہیں اپنی دینی و فقیہ سے دور رکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بنو قبا کی عمر اسوی حکمرانوں سے چنداں بہتر نہ تھی۔ وہ بھی اسی طرح کی جاہل و شہنشاہ بن گئے تھے۔

بادشاہت

چونکہ سیاسی جمہور اسلامی حکومت کی نہیں بلکہ حکمرانی کے باب میں اسلامی اچھٹ کی تاریخ بیان کر رہے ہیں لہذا ہم اس وقت میں تبہ میں، انھیں ان کے منشا و سامنے لانے کے لیے بادشاہوں کے جہد کے تین خوبے پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ خلفاء کے جہد کے دو تین خطبے اور پندرہ چکے ہیں ان سے ان کا موازنہ اور ان کے درمیان فرق عظیم کو بخوبی واضح کر دے گا۔

سنت کے جہد میں دین نے ہر ذمہ دار کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

”کہ نہ بے شہدہ کیا تیار خیاں ہے یہیں سے نہ زور و قوت اور حج کی نیت سے جنگ

کی نہ ہر ذمہ دار میں بنو نبوی جانتا تھا کہ تم نماز پڑھتے ہو، زکوٰۃ دیتے ہو اور حج بھی

کرتے ہو۔ لیکن میں نے تم سے اس سے جنگ کی کہ تم پر تمہاری گردنوں پر اپنا حکم چھاؤں

اللہ نے کہا: ”یہ نہ ہر ذمہ دار کے ہر ذمہ دار کی۔ آگاہ رہو کہ اس فتنہ میں جو کچھ

جانی اور مالی نقصان ہو گا کوئی بڑا یا معوضہ نہیں دیا جائے گا۔ درمیں نے

جس شیطانی بھی نے کی تمہیں وہ میرے ان دونوں قدموں تلے پاؤں ہیں۔“

اسی طرح انھوں نے مدینہ و انہوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا،
 ”اما بعد! خدا کی قسم میں نے امارت تمہاری کسی محبت کے نتیجہ میں نہیں پائی جس کا
 مجھے علم ہو۔ نہ تم کو اس پر کہ فی خوشی ہوئی، بلکہ میں نے تم سے اس تلوار کے ذریعہ کشت مکش کی
 ہے۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی طبیعت کو ابن جحافہ کے طرز عمل پر آمادہ کرنا چاہا، چاہا
 کہ وہ عمر کی روش اختیار کرے، مگر میں نے شدت کے ساتھ کہا کیا۔ پھر میں نے چاہا کہ
 وہ غمناک سے توسعات پر ہی راضی ہو جائے مگر وہ اس پر بھی نہیں آمادہ ہوئی۔ بندہ میں
 نے اسے ایک ایسی راہ پر ڈال دیا ہے جس میں یہ ابھی سمجھتا ہے اور تمہارا بھی۔ خوش اسلوبی کے
 ساتھ مل جل کر کھانا پینا ہو گا، اگر تم مجھے اپنے میں سب سے بہتر نہیں پائے تو بھی حکومت
 کرنے کے لیے تمہارے لیے بہتر ہوں۔“

منصور عباسی نے ذیل کا خطبہ اس وقت دیا ہے جب کہ اُموی سلسلہ حکمرانی کے تصور
 کو ہر شکل دے سکتا تھا دے چکا تھا۔ یہاں تک کہ عباسیوں کے عہد میں یہ تصور بادشاہت کے
 ایک متقدس اور منہج بنالذوق ہونے کے تصور میں بدل چکا تھا جب کہ اسلام اس تصور سے
 نا آشنا ہے۔ اس نے کہا،

”وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَحْمِلُونَ الْعَرْشَ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ تَعَالَى“
 ”وہ لو کہ میں اللہ کی زمین پر اس کا سلطان ہوں۔ اس کی تائید اور توفیق سے تم یہ حکومت
 کروں گا۔ میں اس کے مال پر اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا میں نظر ہوں۔ اس کی مشیت
 اور اس کے مطابق اس میں تصرف کرتا ہوں اور اس کے اذن کے تحت اس میں سے
 عطا میں دیتا ہوں۔ اُمید ہے مجھے اس (خود) کا فعل بنایا ہے۔ اگر وہ مجھے کھول دیتا
 چاہتا ہے تو تم کو عطا دینے یا تمہارے درمیان رزق تقسیم کرنے کے لیے کھول دیتا
 ہے اور بند کرنا چاہتا ہے تو بند کر دیتا ہے۔“
 یہ تو طرز حکمرانی اسلام اور اس کی تعلیمات کے دائرہ سے باہر نکل گیا۔

مالی نظام

مالی نظام، نظام حکمرانی، تابع نظام۔ حکام حکمرانی کا جو تصور رکھتے تھے اور مالی

اور صورت سے نہ ملے۔ رہے یہ جس صورت سے ان کی ہلی پالی بھی ہوئی تھی۔ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شیخین درمیانی میں جب زخمی شدہ کے دوزخ میں سلامی لگے تو ظاہر ہے۔ یعنی یہ کہ اس مال کا مباحلت کی حکایت ہے۔ حاکم بنی ذات ورمینہ و قارب کے یہ سہ ماہیہ پچھلے وہی وقت ہوا۔ یہ جب سے باقی ثابت ہو جائے۔ اس بات پر اس بات کو، بندہ کیا کہ شیخین کو اٹھائیے۔ جہاں سے وہ، یعنی حق ہو، کہ اس معاملہ میں حاکم اور دوسرے لوگ یکساں ہیں۔ اس شان زخمی شدہ کے دوزخ میں سمجھنا کہ اس بنیاد پر جو وہی مال کو، اپنے اصولی دور سے کے پورے ملتے ہیں۔ اپنے غائب مال کی ترقی و ترقی سے بہت دور کے مقدرہ دی گئی ہے۔ یہ کہ بعد کی کافی پچھتاہی، ضعیفہ کانیات تھا، اپنے غرض و دوسرے جن لوگوں کو وہ چھوٹے کے سارے اس صوبہ کے مطابق منسلک کا اسے پورا پورا اختیار تھا۔ اس کے بعد جب حکمرانی جاہر بادشاہ کے ہاتھ میں چلی گئی تو سارے حدود و قیود اٹھائے۔ درحکم حوام کو محدود کرنے یا معاذ اللہ کے باب میں خود کو باطل قرار دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ حق کے مطابق ہوتا تو اسے، بیشک علی، حق ہوتا مسلمانوں کے مال میں حکام، ان کی اولاد، ان کے نو شادریں اور شایہ بزرگوں کے لیے پیش و مشرت کیسے ضرور مناسب کنہاست نکل تھی۔ نیز کار حکام میں غارت مال کے معاملہ میں اسلام کی مقرر کی ہوئی تمام حدود کو پھاندتے چلے گئے۔

۱۔ یہ صورت حال کا اجمالی نقشہ۔ اب ہم چند تاریخی نفاذ کے ذریعہ اس کی تفصیلات سامنے لائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے بیت المال کے جو ذرائع آمدنی چلے آ رہے تھے وہ یہ تھے: ذبیحہ زکوٰۃ، جو مسلمانوں پر ان کے اموال کی مختلف قسموں میں عاید کیا گیا ہے مثلاً سونا، چاندی، زرعی اجناس، چم، مویشی، سامان تجارت، دھنیں اور خزانے وغیرہ۔ عام طور پر اس محصول کی اوسط شش ماہیہ حاصل ہوتی ہے۔ یہ محصول اپنی آٹھ سو روپے ترات میں صرف کیے جاتے ہیں۔ جو ذمی جزیہ ادا کرنے کی شرط پر ضعیف کر لیں ان سے جزیہ، جو اس زکوٰۃ اور جانی قربانی کے بالمقابل ہے جو مسلمان ادا کرتے ہیں۔

۲۔ یعنی وہ مال جو مسلمانوں کو مشرکین سے لڑائی کے بغیر بلا محنت مشقت اٹھائے مل جاتے۔

قرآن کی نفع صریح کے مطابق یہ سارا مال اللہ اور اس کے رسولؐ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

مالِ غنیمت، جو مشہور ہے جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے اس ۲۵ حصہ جنگ کرنے والوں کے لیے ہے اور باقی ۵۱ حصے کی طاعت ہے اور انہی مدت میں صرف ہوتا ہے۔
یا غنیمت کی جگہ پر آج، جو زمینوں پر عاید کیے جانے والے محضوں کا نام ہے جو مشہور ہے
قبضہ میں تھیں اور مسلمان جنگ کے ذریعہ ان پر قابض ہو گئے تھے۔ یا جن کو مشہور ہے قبضہ میں باقی رکھتے ہوئے ان پر ان سے صلح کر لی گئی ہو، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فارس کی زمینوں کے سلسلہ میں کیا تھا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بیت المال کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔ مہاجرین اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آئے تھے اور انصار نے انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے مال و متاع میں شریک کر کے سبائی بنالیا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد بھی محدود تھی۔ غزوات سے پہلے بیت المال کا واحد ذریعہ آمدنی رضا کارانہ اتفاق فی سبیل اللہ تھا۔

جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا اور ہجرت کے دورے سال زکوٰۃ فرض ہوئی تو اصل ذریعہ آمدنی یعنی زکوٰۃ اور ایک اور ذریعہ یعنی غنیمت کا اضافہ ہوا جس کا ۵۴ لڑنے والوں کو دے دیا جاتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے کو ایک حصہ اور سوار کو دو حصہ، یا ایک روایت کے مطابق تین حصہ دیا کرتے تھے۔ گویا آپؐ نے یہ اصول قرار دیا کہ "ایک کا حصہ اس کی قربانی کے مطابق" اسی طاعت آپؐ تنہا آدمی کو ایک حصہ اور بیوی والے کو دو حصے دیتے تھے۔ اس طور پر آپؐ نے اس اصول پر بنایا کہ "ایک کا حصہ اس کی ضرورت کے مطابق"۔ غنیمت کا باقی ۵۱ ان مدت میں صرف ہونا جن کا اوپر ذکر گزر چکا ہے۔

پھر ایک نئی بات یہ ہوئی کہ غزوہ بنی نضیر میں پہلی بار نئے حاصل ہوئی۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے لیے مخصوص کر دیا۔ انداز میں سے آپؐ نے صرف دو غریب آدمیوں کو اس سے حصہ دیا۔ اس کے بعد قرآن نے ایک آیت میں اس بنیادی اسلامی اصول کا اعلان کیا کہ کُلِّ لَا يَكُونُ دَوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ۔

بیت المال کی آمدنی بے درجہ فتنوں اور زمین پر اسلام کی حدود میں وسعت کے ساتھ بڑھتی

رہی۔ وراثی اور خیراتی حالت میں نہ کسی مرد کے مرگ جان میں کیسے اور نہ چاہے جو کئی کیونکہ سب کے
مقرر کردہ حقوق کے مطابق وہ سب بیت المال کی آمدنی میں برابر کے شریک تھے۔

سب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم رضیق تھے جس سے چاہے وہ کچھ لوگ متحد ہو گئے، روز و رات
اور رات و روز، اور ان کے اعتبار سے یہ جو ریشہ ہیں سب برابر تھے۔ یہ نہ جان جائے کہ
کون

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وسلم لا قاتلہ بعدہ شیء بعدہ۔

خدا کی قسم اگر آپ کے پاس میں ہاتھی جانے دی ایک تھی جسے رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ادا کرتے رہے ہیں، دین سے نکال دیا جائے، میں اس سے کون
پر ان سے جنگ کروں گا۔

اس معاملہ میں آپ نے علم فہم بن خطاب کی رائے کے خلاف موقف اختیار کیا۔ بعد میں وہ
حلف کر کے کہہ گئے کہ میں نے جو موقف اختیار کیا ہے، لیکن شہادت میں ان کی رائے یہ
تھی کہ یہ آپ کے لئے ایک حد و دائرہ ہے جس میں یہ ان کے خلاف جنگ جائز نہیں۔ ان کا اختلاف
تین تہائی تھا کہ نبیوں نے قدرے یہ بلجور میں کہا کہ ہم ان لوگوں سے جنگ کیسے کر سکتے ہیں جب کہ رسول خدا
صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہیں،

امروا ان اقاتل الناس حتی يقولوا لا اله الا الله وان محمدًا
رسول الله۔ من فعلن بعد عصم مني ماله ودمه الا بحق الاسلام
وحسابه على الله۔

”ختم کر دیا یہ ہے۔ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ یہ نہ کہہ دیں کہ
لا اله الا الله اور یہ کہ محمد رسول الله۔ جس نے یہ کہہ دیا اس نے اپنی جان و مال کو میری
طرف سے محفوظ کر لیا، جس کے کہ اسلام کی رو سے ان کے جان و مال پر اسحق ثابت
ہو جائے۔ ان کی زمینوں کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔“

اس پر حضرت ابو بکرؓ نے پورے اعتماد کے ساتھ ان کو یہ جواب دیا کہ ”خدا کی قسم جو نماز

اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے گا اس سے میں ضرور جنگ کروں گا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال میں واجب ہوئی ہو الا
حق ہے۔ حضرت عمرؓ اسی وقت پکار اٹھے: خدا کی قسم میں نے محسوس کر لیا کہ اللہ نے ابوبکرؓ کے دل کو جنگ
کرنے پر پوری طاعت مطمئن کر دیا ہے، اب میں نے بھی سمجھ لیا کہ یہی صحیح ہے۔

اس لافانی موقف کو اختیار کر کے آپ نے تاریخ میں عملی طور پر اسلام کی پالیسی کے ایک اہم اصول
کو نافذ کر دکھایا۔ یعنی یہ کہ مال میں سے اللہ تعالیٰ نے جماعت کا جو حق جن حدود میں اور جن مقداروں کے
ساتھ مقرر فرما دیا ہے اسے وصول کرنے کے لیے جنگ کرنا اور قتل کرنا حق بجانب ہے۔

ابوبکرؓ زکوٰۃ کی آمدنی کو اس کی مقرر کردہ مدت میں صرف کرنے کے سلسلہ میں اور اسی طاعت خمس
اور دوسری آمدنیوں کے صرف کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر چلتے رہے۔ خود اپنے لیے
آپ وہی معمولی سی رقم لیتے جو مسلمانوں نے آپ کے لیے مقرر کردی تھی۔ کہا گیا ہے کہ یہ رقم صرف دو درہم یومیہ
تھی۔ اس کے بعد آپ لوگوں کو ان کے مقرر کردہ وظائف دیتے۔ یہ بیت المال میں جو کچھ بچ رہتا اسے
جہاد کی خاطر فوجیں تیار کرنے میں صرف کرتے۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا جس پر آپ اور حضرت عمرؓ کے درمیان اختلاف
ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ تقسیم اموال میں سابقین اولین اور بعد میں اسلام لانے والوں، آزلو
اذا د اور موالی، مردوں اور عورتوں سب کو مساوی قرار دیا جائے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کی ایک جماعت
کا اصرار تھا کہ بن لوگوں نے اسلام کے سلسلہ میں پیش قدمی کی ہو ان کو حسب مراتب مقدم رکھا جائے۔
اس پر حضرت ابوبکرؓ نے یہ فرمایا کہ: تم نے جس اولیت اور افضلیت کا ذکر کیا ہے اس سے میں بخوبی واقف
ہوں۔ مگر یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا ثواب اللہ جل شانہ عطا فرمائے گا۔ یہ معاش کا معاملہ ہے، اس
میں مساوات برتنا ترجیحی سلوک کرنے سے بہتر ہے۔

اس مساوات پر عمل ہوتا رہا اور جیسے جیسے آمدنی بڑھتی گئی فوجی اور خوش حالی سارے
مسلمانوں کو یکساں فیضیاب کرتی رہی یہاں تک کہ عہد بن خطاب کا دور آیا۔ وہ اب بھی اپنی سابقہ رائے
پر قائم تھے یعنی یہ کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی ہے اسے میں ان لوگوں کے
مساوی نہیں قرار دوں گا جو آپ کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں۔

ایک دن تھین میں آپ کے گورنر ابوبکرؓ یہ خبر بہت سنا مال لے کر آئے۔ ان کی روایت ہے کہ

پہلے داخل ہوا، اس کا لحاظ کیا جائے گا۔ اسلام کی حالت میں آدمی کے ماں دار ہونے یا فخریت مند ہونے کا بھی لحاظ رکھا جائے گا۔ خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صنعا کی پہاڑی پر موسیٰ پڑانے والے چرواہے کو بھی اس مال میں سے اس کا حصہ اسی جگہ پر پہنچ جائے گا۔ قبل اس کے کہ اس کے لیے بھاگ دوڑ کرنے میں اس کا چہرہ تہمتا اٹھے۔

”آپ نے یہ اس شخص کے لیے جو جنگ بدر میں شہید تھا پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا۔ ان تمام لوگوں کے لیے جن کا اسلام اہل بدر کے اسلام جیسا تھا، مثلاً حبشہ کو ہجرت کرنے والوں اور جنگ احد میں شرکت کرنے والوں کے لیے چار ہزار درہم سالانہ۔ اہل بدر کے لڑکوں کے لیے آپ نے فی کس دو ہزار مقرر کیے۔ البتہ حضرت حسن اور حضرت حسینؑ کو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قربت کے سبب ان کے والد کے بقدر و عظیمہ دیا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا۔ یہ اس شخص نے لیے جس نے فتح سے قبل ہجرت کی تھی۔ آپ نے تین ہزار درہم سالانہ مقرر کیے اور جو لوگ فتح ہونے پر ایمان لاتے تھے ان کے لیے فی کس دو ہزار مہاجرین و نصاریٰ کے لڑکوں کو بھی آپ نے تنابہ دیا۔ عام لوگوں کے لیے عطایا کی تعیین میں آپ نے ان کے رتبہ، علم قرآن اور راہ اسلام میں جہاد کو معیار بنایا۔ باقی تمام لوگوں کو آپ نے ایک صف میں رکھا۔ چنانچہ جو مسلمان مدینہ آتے اور ان قیام کرتے ان کے لیے پچیس دینار مقرر کر دیا تھا۔ اہل یمن کے لیے جسے شام اور عراق کے مانند قرار دیا گیا تھا، دو ہزار دینار، نو سو پانچ سو اور تین سو کے عطایا مقرر کیے گئے تھے۔ تین سو تک کسی کو نہ ملتا تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ اگر مال میں فراوانی اور ہوئی تو میں ہر ایک کے لیے چار ہزار درہم مقرر کر دوں گا، ایک ہزار سو کے لیے، ایک ہزار گھروالوں کے اخراجات کے لیے چھوڑ جانے کی خاطر اور ایک ہزار اس کے گھوڑے اور خچر کے لیے۔“

عطایا کی تقسیم کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے جو اصول مقرر کیا تھا اس کی پابندی بعض افراد کے سلسلہ میں ضروری نہیں تھی۔ ان افراد کو آپ نے انہی کے درجہ کے دوسرے افراد سے زیادہ عطا کیا۔ عمر بن ابی سلمہ کے لیے آپ نے چار ہزار درہم مقرر کیے۔ یہ عمر ام المومنین ام سلمہؓ کے صاحب زادے

تھے محمد بن عبد بن جعفر نے اس راہت صلیا اور یہ مؤمنین سے ہوا آپ کس بنا پر مکرور سے زیادہ دے رہے ہیں جب کہ ہمارے باپ نے بھی جوت کی تھی اور وہ بھی جنت ہدیہ میں شریک تھے۔ ابن خطابؓ نے فرمایا: آپ ایک تھیں ان کو اس وقت سے زیادہ زیادہ ہے، ہاں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان کو صل نہیں۔ پچھلے میں مسند میں مجھ پر اعتراض کیا کہ: ہاں وہ مسند میں ہیں، اے میں اس کی بات مان لوں گا؟ آپ نے اسامہ بن زید کے یہ چار بڑے بھائی تھے، اس پر عبد بن جعفر نے کہا: "آپ نے میرے لیے تو تین بڑے بھائی تھے، اسامہ کے یہ چار بھائی، سلاطین میں ایسے معتمدوں میں بھی شریک رہے ہوں جن میں سارے شریک ہوئے تھے یہ حضرت عثمانؓ کو جواب دیا: "میں نے نہیں سمجھا تھا کہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تم سے زیادہ محبوب تھے آپ کے باپ بھی آپ کو محبوب رہے باپ سے زیادہ محبوب ہے؟ آپ نے حضرت ابو بکرؓ کی بیوی، اسی بخت میں کے یہ ایک بڑا درہم، اور حضرت بنت عقبہ کے ایک بڑا درہم، اور عبد اللہ بن مسعود کی ماں کے یہ ایک بڑا درہم کی قمیص متروک مائیں۔ ان کی عورتوں کو آپ نے ان کی مخصوص پوزیشن کے باعث نہیں جیسی دوسری عورتوں سے زیادہ محبت کیا کیونکہ یہ سب عورتوں کی بیویاں مائیں تھیں جن کو دوسروں پر فضیلت حاصل تھی نہ

گویا مال کی تقسیم کے مسند میں یہ اورائیں ہیں۔ ابو بکرؓ کی رائے اور عمرؓ کی رائے عمرؓ کی رائے اپنی پست پر ایک سند بھتی تھی جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی ہے ان کو میں ان لوگوں کے مثل نہیں قرار دے گا جنہوں نے آپؐ کے ساتھ ہجرت جنگ کی ہے۔ یہ اصول کہ جو شخص اسلام کی راہ میں جان آزمائشوں سے گزرے اس کا حق فایا جائے گا اسلام میں اس رائے کے لیے ایک بنیاد موجود ہے اور وہ ہے محنت اور اس کے بدل میں مسادات کا حصول۔ اسی طرح ابو بکرؓ کی رائے بھی اپنی سند رکھتی ہے: "لوگ اللہ کے لیے اسلام لائے ہیں اور ان کے اجر بھی اس کے قدر ہیں، وہ قیامت کے دن انہیں پورا پورا اجر عطا کرے گا۔ یہ دنیا قدر کفایت سے زیادہ نہیں۔"

لیکن ہم ہر کسی کا نسل اور ترقی کے حضرت ابو بکرؓ کی رائے کو ترجیح دیں گے کیونکہ یہ مسلمانوں کے باہم مسادات پیدا کرنے کی خاطر زیادہ موزوں ہے۔ اور مسادات اس دین کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول

ہے۔ یہی پالیسی ان خطرناک نتائج سے بچنے کے لیے بھی زیادہ مفید اور مؤثر ہے جو اس تفتات کے نتیجے میں رونما ہوئے۔ مثلاً، ایک طلبہ کی دولت کا بہت بڑھ جانا اور سال بہ سال منافع کے ذریعہ بڑھتے چلے جانا۔ اقتصادیات کی رو سے یہ ایک جانی جوگی حقیقت ہے کہ نفع میں اضافہ اس المال کے اضافہ کے تناسب سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس پالیسی کے یہی وہ نتائج تھے جن کو حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خود دیکھ لیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ اگر وہ اگلے سال زندہ رہے تو سب کے عطایا مساوی کر دیں گے۔ اس موقع پر آپ نے یہ بات بھی جو کافی مشہور ہے:

لو استقبلت من امری ما استقبلت لولا ان لا خلاق من الاغنياء

فضول اموالہم فردد تصاعلی الفقراء۔

» جو فیصلے میں پیسے، چمکا ہوں انہیں اگر اب میرے کرنے کا موقع ملتا تو میں اغنیاء سے

زائد از قدرت مال لے کر اسے فقراء کے درمیان تقسیم کر دیتا۔

مگر افسوس! وقت گزر گیا اور زمانہ غم سے آگے نکل گیا، اور وہ المناک نتائج رونما ہوئے

جنہوں نے اسلامی سماج کا توازن درجہ برہم کر دیا۔ اس کے بعد جب مروان کے تصرفات شروع ہوئے جن کو عثمانؓ کو ارا کرتے جاتے تھے تو ان ہی نتائج نے فتنہ کا دروازہ کھول دیا۔

گویا حضرت عمرؓ نے اپنی اس رائے سے کہ مسئلہ نول کے درمیان تقسیم عطایا میں امتیازی سلوک برتا جائے، اس کے بڑے نتائج دیکھنے کے بعد رجوع کر کے حضرت ابوبکرؓ کی رائے اختیار کر لی تھی۔ حضرت علیؓ کی رائے بھی خلیفہ اول کی رائے کے مطابق تھی۔ واضح رہے کہ حضرت علیؓ کی خدمت کو شیخین کی خدمت کا ایک فتنہ مسلسل وارد ہے کہ حضرت عثمانؓ کے عہد کو جس میں مروان کا حکم چلتا تھا، ایک خلاہ سمجھتے ہیں جو ان کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے ہم اب حضرت علیؓ کے عہد پر گفتگو کریں گے اور اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے عہد کے حالات پر روشنی ڈالیں گے۔

حضرت علیؓ نے تقسیم عطایا کے باب میں مساوات کا اصول اختیار کیا۔ آپ نے اپنے پہلے

ہی خطبہ میں اس کی صراحت کر دی تھی۔ فرمایا:

» مسنوا رسول اللہ کے صحابیوں میں سے، با جبرین یا انصاری، جو شخص بھی۔

رائے رکھتا ہو کہ صحبت کی بنا پر اسے دے دوںوں پر فضیلت حاصل ہے اسے یہ

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ نصیحت کل کہ اللہ کے یہاں کام نہ لے لی، ورامی کا جزا شائب بھی
 دینی سے کا، خوب محکوم جس شخص نے بھی اللہ کے یہاں کی دعوت پر سبک کہا، بار
 ملت کی تصدیق، ہمارے دین میں، خل ہو اور ہمارے قیام کی طرف رخ کیا، اس نے
 اپنے آپ کو اللہ کے سامنے پیش کیا، یہی کرنا چاہیے۔ اور اصل سبب اللہ کے ساتھ ہو اور یہ
 ماں اللہ کا ہے تمہارے زمین میں مسابقتی تقسیم کیا جائے گا، اس کے معاملہ میں کسی
 کو کسی سے پر کوئی نصیحت حاصل نہیں۔ بہت متقی لوگوں کے لیے اللہ نے یاسن
 بہترین جزا ہے۔

یہی صحیح اسلامی اصول ہے جو اسلامی مساوات کی رُوت سے پوری طمانہ آمنگ ہے۔ یہ
 اسلامی سوسائٹی میں توازن قائم رکھنے کا ضامن ہے اور دولت کی افراطیوں کے کسی قدر موافق باقی رکھتا
 ہے جس قدر کہ محنت و شغف کے ذریعہ ممکن ہے۔ یہ کسی کو نفع تو رکاموں کے لیے دوسروں سے زائد
 مال فراہم کر کے دوسروں سے زیادہ مواقع نہیں دیتا۔

حضرت مولانا نے اپنی تحریروں میں اس اصول کی طرف رجوع کرنے والے تھے، لیکن ان کی قضا
 سبقت کر گئی اور آپ کی شہادت واقع ہو گئی اور آپ اپنا یہ ارادہ، بلکہ اپنے دو ایسے ارادے نہ پورے
 کر سکے جن کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے۔ ایک ارادہ اس بات کا تھا کہ مال داروں سے ان کا فاضل مال سیکر
 غبار میں تقسیم کر دیں گے، کیونکہ یہ فاضل مال زیادہ تر تقسیم عطایا میں عدم مساوات برتے کے نتیجہ میں
 وجود میں آیا تھا۔ دوسرا ارادہ یہ تھا کہ تقسیم عطایا کے باب میں مساوات کا اصول اختیار کر لیں تاکہ یہ
 تفاوت دوبارہ نہ رونما ہو سکے اور اسلامی سماج میں انتشار کا جو عمل شروع ہو گیا تھا وہ ستر مندر
 تکمیل نہ ہو۔

جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان دو فیصلوں میں سے ایک کو بھی قابل عمل
 نہیں سمجھا۔ فاضل مال کو مال داروں کے پاس رہنے دیا۔ اسے واپس نہیں لیا۔ اور عطایا میں تفاوت کو بھی
 برقرار رکھا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے لوگوں کو عطائیں دینے میں خوب ذخائر دلی کا ثبوت دیا۔ نتیجہ مال دار
 لوگ اور زیادہ مال دار ہو گئے۔ غبار کو بھی کبھی کبھی کچھ فراخی نصیب ہو جاتی تھی۔ آپ نے ان لوگوں کو
 ٹریڈری رقیس عطا کرنا شروع کر دیا جن کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ پھر آپ نے قریش کو اس کی کھل

چشمی دے دی کہ اپنے جمع کردہ سرمایہ کے ذریعہ زمین کے گوشہ گوشہ میں تجارت کرتے پھریں اور اس طرح اُسے کئی گنا بڑھالیں۔ آپ نے بڑے بڑے مال داروں کے لیے یہ بات بھی رد رکھی کہ سواد کے علاقہ میں دوسرے ممالک میں خوب عمارتیں اور زمینیں خریدیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ کے دورِ خلافت کے آخری زمانہ میں پورے اسلامی سماج میں دولت کی تقسیم میں زبردست تغاوت پیدا ہو گیا۔ اند آپ پر رحم فرمائے۔

حضرت بوکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ اس پالیسی پر شدت کے ساتھ عمل کرتے تھے کہ اکابر قریش کی ایک جماعت کو مدینہ میں مستقر رہنے پر مجبور کریں۔ یہ حضرات اُن لوگوں کو مفتوحہ ممالک میں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت اس لیے نہیں دیتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ جب ان کے گزیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قرابت، اسلام کی راہ میں اُن کی قربانیوں اور جہاد میں اُن کی پیش قدمی کے باعث اعوان و انصار جمع ہو جائیں تو ن سواروں کی نظریں مال دولت اور اقتدار و حکومت کی طرف اٹھنے لگیں واضح رہے کہ آزادی کے اسلامی تصور کے تحت ایسا کرنے کو کسی طرح بھی انفرادی آزادی کو پامال کرنے کے ہم معنی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیوں کہ اسلام میں یہ آزادی اجتماعی مصالح اور سماجی خیر خواہی کے حدود کی پابند ہے۔ جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو آپ نے ان لوگوں کو زمین میں نقل و حرکت کی کملی آزادی دیدی صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے انھیں اس پر اُسی را کہ اپنے سرمایہ کو ممالک مفتوحہ میں مکانات اور زمین خریدنے میں لگائیں۔ جب کہ آپ ان میں سے بعض لوگوں کو رکھوں کی رقمیں عطا کر چکے تھے۔

بلاشبہ یہ سب مسلمانوں اور بالخصوص ان کے اکابر کے ساتھ حسن سلوک اور مہربانی کے طور پر کیا گیا تھا۔ لیکن اس پالیسی نے ایسے مفاد کو جنم دیا جو ابوبکرؓ و عمرؓ کی دور بین نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس نے اسلامی جماعت میں زبردست معاشی تغاوت اور سماجی امتیازات پیدا کر دیئے۔ نیز اس نے ایک ایسے طبقہ کو جنم دیا جو خود بے عمل رہتا اور بغیر کسی محنت مشقت کے اس کو اس کا رزق ہر چہاں بجانب سے آکر ملتا رہتا۔ اس طرح وہ عیش کوشی ایک بار بچہ نہ بنا ہوگی جس کے خلاف اسلام اپنی ہدایات اور اپنے قوانین دونوں کے ذریعہ مسلسل اعلان جنگ کرتا رہا تھا اور حضرت عثمانؓ کے قبل کے دونوں خلفاء بھی اس سے برسرِ پیکار رہے اور کوشش کرتے رہے کہ اسے سُر اٹھانے کا ذرا موقع بھی نہ ملے۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو بعض لوگوں کے اندر روحِ اسلامی نے جوش کیا۔ اُن میں نمائندہ شخصیت ابوذرؓ کا ہے جو اُن میں سب سے زیادہ انقلابی تھے۔ یہ وہی حلیل الغدر صحابی ہیں جن پر

عالم ہی میں منہ کے ڈاکٹر الہ فستاء نے برسہا برس خدایہ فتویٰ کرنے کی ضرورت محسوس کی اور یہاں
 کیا کہ وہ دین میں بوڈر سے زیادہ بصیرت رکھتا ہے۔ یہ سب سائنس دانوں نے تو اس نے یہاں فتویٰ ہی
 دیا اور ان کے رتبہ کی، سید میں فتویٰ صادر کرویا۔ جیسے خدا کی بات ہو جسے یہ
 ادارہ خواہشات کے بازار میں فروخت کر رہا ہو۔

بوڈر نے عیش پرستی، کائنات کی سب عیش پرستی، پڑھنا، کھانا، سونے کے لیے کمر لگا دیا
 تسلیم تھی۔ انھوں نے خاص طور پر نبو امیہ اور معاویہ کی سب پالیسی یہ اختیار کی کہ وہ
 دن کو راکر رہے تھے بعد اس کا ذرا دیکھ دیتے تھے اور اس میں خود بھی بڑی بات سمجھتے تھے۔ تب نے
 خود حضرت عثمان کے اس طریقہ کو قابلِ ستائش قرار دیا کہ وہ بیت المال سے دن کو انھوں کی قیس
 انعام میں دیں اور اس طرح دولت مندوں کی دولت و عیش کو تنہا کی عیش کو شہی میں انہوں نے دیں۔
 ان کو معلوم ہوا کہ عثمان نے یہ بن سکھ کو اذیت دینے کا پانچواں سہارا رکھتا ہے۔ اس کے بعد
 دو لاکھ درہم اور زید بن ثابت کو ایک لاکھ درہم عطا کیے ہیں۔

ابوذر کے نمبر کے لیے یہ باتیں ناقابلِ برداشت تھیں، وہ ٹوٹ پھوٹے ہوئے دروگوں سے
 کہنے لگے۔

اب ایسے کام کیے جانے لگے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ خدا کی قسم نہ اس کے
 میں ان کی کوئی سند ہے نہ اس کے نبی کی سنت میں۔ خدا کی قسم میں ان کو رہا ہوں کہ
 حق یہ کہ کیا جا رہا ہے۔ باطل کو زبردستی جتایا جا رہا ہے۔ پتے آدمی و جھٹلایا
 جا رہا ہے اور غیر حقوں کے لوگوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ اے دولت مندوں
 غریبوں کے ساتھ بھائی چارہ کرو۔ اور جو لوگ سناچاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور
 انھیں خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرنے کا اشارت دے کہ ان کے بیتوں پہلوؤں
 اور پستوں پر آگ سے دھواں نکلتے جائیں گے۔ اے مال جمع کرنے والے
 جاننے والے کہ مال میں تین شکوک ہیں: اولاً تمہارے ہوتے ہوئے جائز نہیں ہے کہ تمہاری
 یا موت کے ذریعہ تیرے مال کا اچھا حصہ لے جائے یہ بڑا حسد، شایانہ ارتھ ہے جو
 منتظر ہے کہ تیری آنکھیں بند ہوں اور وہ مال پر قبضہ کر لے اور تو خود مجلس رہ جائے گا

میرے نمبر پر تیرا حق ہے۔ اگر یہ ممکن ہو تو زمینوں میں سے سب سے کمزور شریک بن کر نہ رہے تو ضرور اس کا اہتمام کر۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۖ

”تم نیکی کے درجہ کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان چیزوں کو (راہِ خدا میں) خرچ نہ کرو گے جو تمہیں محبوب ہیں۔“

لوگو! تم اب ریشمی پردے اور دیباج کے بنے ہوئے گاؤں کی استعمال کرنے لگے ہو اور اب تمہیں آذرِ بایجان کے بنے ہوئے (عمدہ) نمبر سے پرسونے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر سویا کرتے تھے۔ تمہارے یہاں ایسی طرح طاق کے کھانوں کا دور چلتا ہے۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کی روٹی بھی اتنی میسر نہ ہوتی تھی کہ شکم سیر ہو کر کھاتے۔۔۔۔۔“

مالک بن عبد اللہ الزیاد بن ابی ذر سے روایت کرتے ہیں کہ ایک بار انہوں نے عثمان بن عفان کے یہاں اذنِ باریابی چاہا۔ انہوں نے اُن کو بلایا۔ ان کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا بھی تھا۔ عثمان نے کہا: کعب! عبد الرحمن کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے (کافی) مال چھوڑا ہے۔ ان کے بارے میں ہمارا کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا: گروہ! اس میں سے اللہ کا حق ادا کرتے رہے تو اُن پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سن کر ابو ذر نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور حب کو رسید کیا۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:

صاحبِ لو ان لی ہذا الجبل ذهباً لنفقہ ویتقبل منی،

اگر خلفی مسئلہ ست ادبیات۔

”اگر میرے پاس اس پہاڑ کے برابر سونہ ہوتا جسے میں رہ خدا میں خرچ کرتا اور اللہ سے

قبول فرماتا، مگر میں اس میں سے جو ”فیہ“ بھی پیچھے چھوڑتا، پسند نہیں کرتا۔“

یہ حدیث سن کر انہوں نے تین بار عثمانؓ کو قسم دلا کر پوچھا کیا تم نے اسے سنا ہے؟ وہ بولے: ہاں! ۱

اس طرح کی دعوت کو برداشت کرنا معاویہ اور ابن بن جهم کے پس کی بات نہ تھی چنانچہ وہ اس بات پر زبردستی عثمان کو ان کے خلاف لگاتے رہے یہاں تک کہ باوجود ان کے رسول سے جنگ کا یا نہ دہنی لارض کا ارتکاب یہ بغیر جس پر کہ شریعت اسلام کی راہ سے محمد کو ملک بدر کیا جاسکتا ہے، ملک بدر ہو کر تہذہ چلے جانا پڑا۔

یہ پکارا یہ خمیر کی بیدری کا مظہر تھی جسے "امت کی بے حد فدا دانی کے باوجود خوشنات مغلوب نہ کر سکی تھیں۔" دولت کا مرکز بن کر چڑھ گیا۔ اب اس نے ساری جہت کو مختلف بنیادیں تقسیم کر دی تھیں اور ان بنیادوں کو مشاربہ تھا جنہیں یہ "چین و کرب کے درمیان تو نہ کرنے آیا تھا۔ ہمارے لیے یہ کافی ہو گا کہ دولت کی سزا دہنی کے کچھ نمونے دیکھ لیں جن کا ذکر مسعودی نے کیا ہے۔ وہ مکت ہے:

"مکان کے نام میں موصوفی نے خوب ماں و جانم دیا تھا کیا۔ چنانچہ جس "منہ" تھان کی شہادت واقع ہوئی ان کے خزانچی کے پاس ان کا ڈیڑھ۔ مدینہ اور اس کو "بہ نقد" تھا۔ وادی اقصیٰ اور حنین وغیرہ میں ان کی جائدادوں کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی اس کے علاوہ "پسے نے بدلتے گھوڑے" ۱۰۰ منٹ چھوڑے تھے۔ زبیر کی وفات کے بعد ان کے چھوڑے ہوئی دولت ایک سائیکس کی قیمت تقریباً پچاس ہزار دینار تھی اس کے علاوہ انھوں نے ہزار گھوڑے اور ہزار ہزار چھوڑے تھیں۔ خلوص کو عراق سے ایک ہزار دینار یومہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ اور ساقہ کی جانب سے اس سے بھی زیادہ ترکتی تھی۔ عبدالرحمن بن عوف نے حبشہ میں ایک ہزار گھوڑے تھے۔ اس کے پاس ایک ہزار منٹ اور اس ہزار سیکھ بکریاں بھی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ترکہ کا ایک چوتھائی چوراسی ہزار کے بقدر تھا۔ زبیر بن عوف نے اس قدر سونا پیاوند چھڑا اس کے جو کلباڑیوں سے کاٹا جاتا تھا جو مال و جائداد انھوں نے چھڑا وہ اس کے علاوہ ہے۔ زبیر نے ایک محل بصرہ میں، ایک منہ میں ایک کوفہ میں اور ایک سکندریہ میں تعمیر کرایا تھا اسی طاقطہ نے کوفہ میں ایک عمارت کا مکان تعمیر کروایا "مریضہ میں ایک محل تعمیر کیا جس میں جو "پست" اور ساگون کی لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ سعد بن ابی وقاص نے عقیق میں ایک عالی شان مکان بنوایا جس کی چھتیں بہت اونچی اور گھن بہت وسیع تھیں اور اس کے بالائی حصہ پر برجیاں تھیں۔ مقدار نے مدینہ میں

ایک محل تعمیر کرایا جس کے اندر بارہ دونوں طرف گچہ کاری کروائی۔ یعنی بن منہ منہ پیس
بزار دینے اور اس کے علاوہ تین لاکھ درہم کی قیمت کی جائدادیں اور دوسرے سامان
چھوڑے۔

یہ تھی دولت کی وہ فراوانی جس کی ابتدا بہت چھوٹے پیمانہ پر نہایت عرصہ کے زمانہ میں عطا باکی تقسیم میں بعض مسلمانوں کو بعض سے زیادہ دینے کی پالیسی کے نتیجہ میں ہوئی تھی۔ یہ وہی پالیسی ہے جسے ختم کرنے اور اس کے بُرے اثرات کا ازالہ کرنے کا حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ آپ نے ایسا کر کے دعا دیہ ہوتا اگر اس سے قبل آپ کو تنبیہ کے اس وار نے نشانہ نہ بن لیا ہوتا جو صرف غم کے ذائقہ نہیں بلکہ خود اسلام کے دل میں پیوست ہو گیا۔ پھر یہ فراوانی دن بدن فزونی برپا ہو گئی، حضرت عثمانؓ نے اس پالیسی کو باقی رکھا اور اس سے اس فراوانی میں اور اضافہ ہوا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کے علاوہ جو انعام و اکرام دیئے اور جاگیریں عطا کیں وہ علیحدہ ہیں۔ اس کے بعد کچھ ایسے اسباب پیدا ہوئے رہے کہ دولت کی بہتات بہت تیزی سے بڑھی خاص طور پر متفق اور مختلف املاک اور ریاستوں کو یکجا کرنا اور نفع آفرین کاروبار کے مختلف رائج کو اپنے قبضہ میں لے آنا۔ یونکہ حضرت عثمانؓ نے ملک مفتوحہ میں زمینیں خریدنے اور بڑی بڑی املاک حاصل کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ابوذرؓ کے دل سے جو بھی بات نکلتی تھی پکار بکن ہو جاتی تھی اس کی مخالفت بھی اس کی ایک اہم وجہ بن گئی۔ اگر یہ دعوت اپنے غصہ میں کامیاب ہو جاتی اور صدر مملکت کو ہمہ تن جوابدہ بنا سکتی تو اس میں اتنی مصالحت موجود تھی کہ صورت حال کی اصلاح کر دے اور حضرت عمرؓ نے اپنے آخری دنوں میں مال داروں کی فیصلہ دہانت کے بارے میں تقسیم کردینے کا جو فیصلہ کیا تھا اسے عملاً نافذ کر دکھائے۔ امام کے یہ اپنے انتہائی دور رس و بالکل بہتر ہونا کہ امت کو ان خصوصیات سے بچانے کے لیے ایسا کرے۔ بلکہ یہ ان خصوصیات کے تصور کے لیے اس پر ایسا کرنا فرض تھا اگر ایک طرف دولت کا تذکرہ کریں اور اس کی فراوانی نہ دوسری طرف اسی نسبت سے نقد دنیا اور خسرتِ حالی کا ظہور لازمی تھا۔ قدرتی طور پر غیظ و غضب اور استقامتی جذبات بھی پیدا ہو رہے تھے۔ یہ سارا مواد جمع ہوتا رہا اور پختہ رہا تاکہ اس نے ایک ہیجان انگیز نقشہ کو جنم دے کہ پہلے ڈرا جس سے سلام

بیت المال میں داخل کیے جاتے تھے البتہ اس میں سے ان جنگامی اخراجات کو اخذ کر دینا مذکور ہے۔
 بیت المال میں ضرورت پڑ جائے تھی۔ چنانچہ **سنہ ۷۳۵ھ** میں خلیفہ نے ان ممالک کی
 فتح پر **۱۰ لاکھ** سے زائد خرچ کیا تھا۔

۳۔ **مرد و یتیم** کے اموال۔ مثل اہل ذمہ سے وصول ہونے والے ہزیہ عموماً بیت المال میں
 داخل کرنے کی بجائے خلیفہ کے بیت المال میں داخل کیا جاتا تھا جو امیر المومنین ہونے کے سبب وصولی
 طور پر اس کا حق تھا۔

۴۔ **دھماکہ** پر ہونے والے فرائض اور امان کے مال و زر کی جائیداد کی قبضہ
 کے ذریعہ حاصل ہوتا تھا۔ اس مال جو ترکوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔
 ۵۔ **خزانہ** اور **املاک** سے حاصل ہونے والی رقمیں جو سوا۱۰ ہزار اور ستر ہزار روپیہ ملنے لگیں
 بیت المال نامہ میں ان کی تفصیل ہے۔

۶۔ **دو اموال جو خلیفہ** اپنی پابندی کے لئے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری کے دونوں آخری خلفاء
 معتز و ملکنی ۱۵ لاکھ سالانہ بچا لے لے لے۔ **تحت المظہر** کتابی پابندی تھا۔ اس طور پر پندرہ سال کی
 بچت ایک کروڑ چھپاس لگتی تھی۔ یعنی اس فرائض پر خلیفہ بہ نسبت جو خلیفہ رشید نے چھپائی تھی۔
 اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ خلیفہ معتز نے پابندیوں کے لئے ۱۵ لاکھ سالانہ کے
 اموال پر کتنی دست درازیاں کی تھیں۔ مایات کا نقشہ اسامی اموالوں سے کتنی تکلیف ہو رہا تھا۔ ایک طرف
 دولت اور عیش پرستی کتنی زیادہ تھی اور دوسری طرف محرومی اور فتنہ و فساد کتنی شدید ہو چکا تھا۔ اسامی سے
 اسامی طریق سے ہزاروں اسامی کے لئے فتنہ ہونے کے سبب کتنے غلامانہ کار ہو چکا تھا۔
چند بنیادی اصول

لیکن ان باتوں کے باوجود اسلام کی عملی تاریخ نے تین قدر کردار کیا۔ مالی پالیسی کے ضمن میں

سے خلیفہ اپنے خزانوں و فرائض کو ایک ہی نام سے منسوب کرتا تھا جو صاحب الزمان نہیں
 ہونے لگے تھے۔ یہ وہ اموال تھے جن کی طرف بہت زیادہ تھی اور اس ذریعہ سے ملنے
 کے خزانہ میں بہت سا مال آ جاتا تھا۔

بے انتہا فردنی ہمارے دوسری طرف اس سے کسے محرومی۔ وہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے صاف رہے۔
 کو اس بات کی پوری آلودہ دیتا ہے کہ موجودہ حالات کے مطابق مناسب اقدامات کرے۔ یہ ایک ایسا اصول
 ہے جو تاریخی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ نے بنی نضیہ کی فتنے کو تمام تر فتنہاء مبارک
 میں غلبہ کیا تاکہ پہلی فرصت میں اسلامی مساعی میں ایک گونہ توازن پیدا کر سکیں۔ اس سے صحت و دوغیب
 انصاری مستثنیٰ تھے (جنہیں آپ نے اس موقع پر قصہ دیا تھا)۔ یہ قرآن نے آکر اس تاریخی نظمیہ پر مہر تصدیق
 ثبت کر دی گئی۔ "لَا يَكُونُ دُورَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ وَالْمَسْكِينِ" تاکہ (ماں و دولت) صرف تمہارے
 ماں و ارادوں کے درمیان گردش نہ کرتا رہ جائے۔

یہ نظریہ بڑی معنی نیز، پختہ و راسخ ہے۔ اس کی روت سے مسکن صاحب ام جو اس کی شہادت
 کو نافذ کرتا ہے۔ ہر وقت اس بات کا احتیاط رکھنا ہے۔ نوازندہ عام میں سے بل صاحبیت کی اتنی
 مدد کرے جس سے اسلامی بنامت میں توازن بحال ہو جائے اور اسلام کی یہ خواہش پوری ہو جائے
 کہ مختلف طبقوں کے درمیان ایسا تفاوت نہ پایا جائے جو اس عام توازن کو درجہ بدرجہ کر دے۔

۳۔ استطاعت اور عدم استطاعت کی مناسبت سے عمل کی مختلف شہیں مقرر کرنے
 کا سوال۔ چنانچہ جب ذہنیوں پر تنگی ہو جائے تو ان کے مختلف گروہوں کے لیے ذیل کی شہیں مقرر
 کی گئیں:

۱۔ مال دار لوگ۔ ان سے فی س ۴۰ درجہ سہا نہ لیا جائے گا۔

ب۔ متوسط الحال لوگ۔ ان سے فی س ۶۰ درجہ سہا نہ لیا جائے گا۔

ج۔ محنت کش غبار ان سے فی س ۸۰ درجہ سہا نہ لیا جائے گا۔

ایسا غریب جسے خیرات دی جاتی ہو، وہ آدمی جو محنت سے معذور ہو، مذہبی یا باج، پاگل اور
 آفت رسیدہ معذور اذاد سے جزیہ نہیں وصول کیا جائے گا۔ عورت اور بچہ جزیہ نہیں عاید ہوا
 عام الزامہ میں جب قحط کے سبب فاقہ کشی کی ذہبت آگئی۔ تو سہا نہ لیا جائے۔ غریب نے روزیہ وصول کرنے
 کے لیے عقلیں نہیں بھیجے بلکہ لوگوں کو تشنگ سانی رفع ہونے تک معاف رہا۔ سبب تشنگی ماں کا ریا اور
 عوام نے اطمینان کا سانس لیا تو آپ نے عقلیں بھیجے اور انہوں نے سہا نہ لیا۔ رکھنے والوں سے دوسرے
 حصہ کا مطالبہ کیا۔ ایک ماں الزامہ ۵۰ درجہ سہا نہ لیا جائے۔ انہوں نے معاف رکھا۔

بالکل معصوم ہے دراپنے مجرم ماں باپ کے گناہ کو قطعاً ذمہ دار نہیں۔ اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ سنت جو مرنے والے سے پہلے نہی اور کپڑا رکھنے کی عیسائیوں کے لیے بیت المال سے تمہیں مقرر کردہ تھیں اور ان کے مابین یہ اسلامی فرائض کی عیسائیوں پر سارے مسلمانوں کے لیے۔ یہ ضرورت نہیں کہ وہ مرنے والے کے گناہ کی انتہائی تحفظ ہے۔

۸۔ یہ اصولی سوال ہے کہ کیا اس سے پہلے ہو یا کیوں کر کہ کو کوئی ایسا خصوصی تحفظ حاصل نہیں کہ جماعت کے مرنے والے کے بارے میں اس سے محاسبہ نہ کر سکے۔ تاکہ اسے معلوم ہو کہ یہ مال اسی کا مال ہے یا جماعت کا ہے۔ اسی اصول کی تعمیل اس بات کی ضمانت ہے کہ کوئی حاکم مال عام پر دست درازی سے پہلے کوئی بارہ سو چھ سو تھوڑے تھوڑے اپنے سارے عیسائیوں کے ساتھ اس اصول پر عمل کیا۔ پھر حضرت علیؓ نے بھی بعض دالوں کے ساتھ ایسا کیا۔

۹۔ اصول زکوٰۃ جو ان تارکین دین کے لیے بھی عطل نہیں ہوا جو رو بہ دین سے دور ہو گئے تھے۔ کیوں کہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد کے شروع میں بلوچوں سے جنگ کے بعد ایک شخص نے بھی نظمی یا مہلی طور پر اس کا انکار نہیں کیا۔ تاکہ ہمارے زمانہ میں مغربی تہذیب بولناہی تہذیب ہو اور اس کے نتیجہ میں اسلامی اصولوں میں سے آخری زندہ اصول بھی یا مال ہو گیا۔

۱۰۔ عام اجتماعی منافع کا اصول جو عیسائی کے ہاتھوں کو اس فرد کے بارے میں جواب دہ قرار دیتا ہے جو وہاں بھوک کی وجہ سے موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ جواب دہی نو صداری قانون کے تحت آتی ہے۔ یہ بستی دالوں پر اس طرح مہم جوئی کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ وہ اس فرد کے قاتل قرار پاتے ہیں جو ان کے درمیان رہتے ہوئے بھوک کی وجہ سے موت کا شکار ہو گیا۔

اس اصول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بھوک کے باعث اس بات کا حق حاصل ہے کہ اگر اسے بھوک یا پیاس کے سبب اپنی جان ہارنے کا شیشہ ہو تو وہ کیا پانی رکھنے والے سے ملگ کر سکتا ہے۔ اور اگر اسے قتل کر دے تو اس سے یہ ذمہ داری کی وجہ اخذ کی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ حرمت شہود اور تنگ دستی کی شکل میں دین و رکو بہت دینے کا اصول۔ شہود کی حرمت بھی بڑا قائم رہی تا آنکہ جدید تہذیب نے ہمارے مہمان کو یہ بل فرانسس قانون کے ذریعہ ہمارے سے آتی اور اس نے اسے ہماری عام اقتصادی زندگی کی اہم بنیاد بنا دیا۔ حالانکہ اس کی قطعاً ضرورت

کھارتے ہیں۔ انسانیت کو ان تجربات پر بہت کچھ قبان کرنا پڑا ہے۔ ان کی خاطر اس نے بہت کچھ کھو یا ہے۔

ربا سلام کا حال اور سس کا مستقبل تو اس پر ہم آئندہ باب میں روشنی ڈالیں گے۔

باب ہشتم

اسلام کا حال اور مستقبل

اسلام کا حال اور مستقبل

ہم اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ اسلامی زندگی رسد و شروع کی جاتی ہے۔ معاشرہ اسلامی ہو جس میں اسلامی عقیدہ رہے اور اسلامی دستور زندگی رہے جو اس خدایں سہی شریعت نافذ ہو اور اسلامی نظام قائم ہو۔

ہمیں چینی طرح معلوم ہے کہ اس زندگی اسلامی زندگی اس زمین کے ہر گوشے میں ایک عویں غرض سے مفعول ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں ہونے کی بنا پر خود اسلام کا وجود ہی غلط کر رہا ہے۔

باوجود اس کے کہ بہت سے لوگوں کو جو یہی پسند کرتے ہیں کہ مسلمان بہت بڑی اس بات سے ایک دھجہ سا لگے گا۔ اور ان ہر اس دشمنی و نفرت کی وجہ سے کہ ہم اس قدر ہی بات کا غلہ کیوں نہ کریں سمجھتے ہیں کہ اس غلہ میں دعوت و غور و غور کے ساتھ ہے کہ اسلامی زندگی کے رسد و شروع کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ معاشرہ اسلامی ہو اس میں اسلامی عقیدہ رہے جو وہ اسلامی دستور زندگی رہے جو۔ ساتھ ہی اسلامی شریعت نافذ ہو اور اسلامی نظام ہو جو ہماری اس عہدیت و اس دور کے گناہ سے دیکھتے ہیں اس کا غلہ اس سے ہر اس و نامہ میں پیدا ہوئے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس دعوت و اس کے کے سلسلے میں جد و جہد کے ساتھ سے مالوس ہونے والی جو ہے۔ اس کے برعکس ہمارے نزدیک اس لمبا حقیقت کا غلہ کہ عرصہ دراز سے کہہ رہے ہیں کہ اسلامی زندگی مولوی کو چھٹی ہے اور یہی تو ہے اسلام کا وجود بھی ختم ہو رہا ہے۔ اسلام کی دعوت و اسلام کے اس کی مذہب کا ایک نظام ہے اور اس سلسلے کی ایک، گزیر ضرورت ہے جس سے مسلمان۔

یہ اس زمین کے ہر اس میں ایک چینی حقیقت ہے کہ یہ اس وقت تک نہ ہو پھر عہدہ کے ضمیر

لَا تَحْكُمُوا بِالْعِلْمِ ۚ وَمَنْ لَا يَحْكُم بِمَا آتَاهُ اللَّهُ ذَرْبُ الْفُتَيَّةِ

(یوسف: ۴۰)

فرمانِ روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ جس نے اللہ کے بخود دیے ہوئے حکم کو نہ کر لیا۔

وَأَن آخُكُمُ نَبِيَّهُمْ بِمَا آتَى اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَهُمْ

وَإِذَا خَلَسَ لَهُمُ الْيَتِيمَٰتُ فَسَوْفَ يَنسَوْنَ ۚ وَاللَّهُ إِلَهُكُمُ إِلَٰهٌ ۚ

(احمد: ۴۹)

”پس اس کے بعد جب تم اللہ کے مازلے کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات

کا فیصلہ کرو۔ اور ان جو یتیم کی سیوا کر رہے ہو۔ پھر وہ لوگ تم کو بھول جائیں

میں ان کو اس حد تک بھول جائیں کہ وہ تم پر منحوس نہ رہیں جو اللہ سے تمہاری طرف

نازل کی ہے۔“

وَمَن لَّمْ يَجِدْ بِمَا آتَى اللَّهُ الذِّفَّ فَوَسَّكُهُمُ اَقْلَبُونَ ۝

(مائدہ: ۴۵)

”اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کر رہے ہوں وہ ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ ۚ وَكَسِبَتْ اَنْفُسُهُمْ

(نساء: ۶۵)

تمہارے رب کی قسم یہ بھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ آپ پر بھی حاکم

میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ مگر جو کچھ تم فیصلہ کرو۔ وہی حاکم ہوگا۔

جی کوئی شک نہ محسوس کریں بلکہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَٰئِكَ

مِنْكُمْ ۚ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

إِن كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ

ہو جائے گا کہ اس دین کا وجود ہی اس دم سے موقوف ہو چکا ہے جب سے مسلمانوں کے سماعت سے پتہ نہ
 مور و مسائل میں صرف اللہ کی نمریخت کو حکمران بنانا ترک کر دیا ہے۔ کیونکہ یہاں گرتے ہی وہ حالتِ اہمیت
 کو اندہ بھی نہ کے ساتھ مخصوص کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔۔۔ کیونکہ صرف اللہ کے ہی ہاتھ کا مطلب ہی بہت
 اُس کا قانون نافذ کیا جائے، یا کم از کم یہ اس کا نام ہی اور ناگزیر تقاضا ہے۔

اسلام کے یہ بد باریاں مکار دشمن سرور بسدوں کے اندیشہ و خدشہ سے ملطاف اندہ ٹھاکر
 نساؤں کی اس کثیر تعداد کو غافل و غیور بنادیا چاہتے ہیں جو وہی بات ہی ہے کہ مسلمان من مر ہے۔۔۔
 نہیں اس مغلطہ میں رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ غلط مسلمان ہی ہیں اسلام کے ساتھ اس خبر بہت دور
 انسان اپنے و پر اس دین کے قانون کو نافذ کرتے ہیں جس میں مسلمان رہ سکتا ہے بلکہ اس میں مدوری نہیں۔ وہ بغیر
 رکھیں کہ حکمت صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور جو سب سے بہت و کثرت کا دعویٰ کر رہا ہو گا وہ اللہ کا مخالف
 ہو گا۔ اور اس دم سے حیرت ہو جائے گا۔

اس مکر و فریب کی مثال ہمیں دہشت کے مسسرقی و غارتگریوں سمجھنے سے مل جاتی ہے کہ "سرم
 دور حاضر میں" بھاری طور پر یہ ثابت کرے کہ اس کی ہے۔ ترک کا وہ سیکورزم جس کا علم پر ہے۔ ترک
 سدھی ہے۔ بلکہ یہ سیکورزم دور حاضر کی تاریخ میں واحد و مناسب "سرمی" ہے۔ جو مسلمان سرم کا وجود
 برور رکھنا چاہتے ہیں اس کو اس کے نقش قدم پر چاہتے ہیں۔ اور وہ صحیح و فائدہ دہ ہے۔

فساد میں درجہ بڑھتا ہے۔ ہمیں اس کے مغیبت میں اس کی غیبت کا عدل کرنا۔ دور کی ہے جس
 سے بہت سے ایسے لوگ ڈرتے ہیں جو مسلمان ہی رہتے ہیں۔ اور اس سے۔ سرور میں اس کی غیبت
 کرنے میں۔ اس دین کا۔ جو موقوف ہو چکا ہے۔ اس کے دشمن اس دین کے سید ہوں۔ جو
 منہ اندہ دے رہے ہیں اس کا پرہیزگار ہو۔

اس عدل کے نتیجہ میں اس کی سرک کی جو ہاں ہو۔ اسوں سے نہیں گھبراتے۔ چاہے کہو کہ
 ہمیں پورے بغیر ہے کہ مستقبل میں دین کا ہے۔ اس کے وجود کا بہت فائدہ ہے کہ ہے۔ اس کا بہت
 عرصہ مانی رہے گا۔ صیہبی اور عیہبی ہونی سامراج زمین میں جتنے سے ہی جتنے رہے۔ وہ غلط ہے جتنے
 جیسا کہ سب براب کا ہے۔ خود وہ کندی ٹر و جگہ رہو۔

یہ دین جو عارضی طور پر پیدا ہوا ہے اس کی جڑیں اس زہیہ ہیں نری گہری ہیں۔ اور اس سے

دہشت کے ساتھ متوجہ ہوتے مگر اسلام کے مسدود میں خود رست بہر رست نہ کو دیتے ہیں دیکھو وہ اب بھی ان کی غلط فہمیوں میں
 غیر معمولی تعصب کی شکل میں جاری رہا۔ تاریخ نے یورپ اور اسلام کے مابین حقیقتاً حاصل کردہ فہمی وہ اب بھی باقی رہی
 اسلام کی تہذیب و مذہب کے فکر کا ایک باب بددیہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ محال تک مستشرقین میں پیش پیش وہ لوگ
 تھے جو سائنس کی مدد سے اسلام کی حقیقت کو سمجھنے میں سرگرم عمل تھے۔ وہ اسلام کی غلط فہمی کے جو مسخ کر دینے لگے۔
 اس سے قبل اس دور میں مذہب و تمدن کے مابین برائیوں کی طرف سے یورپ کے تعلق سے کوئی متاثر نہ ہو سکے۔ یہ فکر ان کی
 اس دور میں گریہ اسلام کی صورت میں Oriental Studies

اور اب یہ دور میں مسلمانوں کا اس کا کہ اسلام کے تمدن میں تعصب کے وجود نہ ہوں سے ان کا موروثی تعلق ہے
 مستشرقین کے اسلام کی موروثی تعصب و بددیہی کا سبب جو مسلمانوں اور اسے والستہ دوسرے
 عوامل کے ساتھ ترک کا نتیجہ ہے جو اب بھی یورپ کے تمدن کے ذہنوں پر مرتب کیے گئے۔

”جس کوکے ہوسو گئے ہیں۔۔۔ کیسے ممکن ہے کہ ان کی طرف جو صدیوں سے ورعیت کی کلیس
 کے روحانی تہذیب کی وجہ سے ان زمانے میں مکمل ہوئی تھی اب یورپ کے ذہن پر چھوٹی رہے، حسب کہ
 مذہب کا مسدود یورپ کے سے ذہن گری ہوئی ہے کہ وہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔“

ان تہذیبی مسائل اور تہذیبوں میں کوکے صدیوں کا مسدود مسئلہ ہے۔ انسان تمام
 اعتقادات کو بھول جاتا ہے جو اسے جن میں سکوت کے ساتھ ہیں۔ اس میں انیسویں صدیوں کا اثر کبھی نہیں ہوا
 ہوا۔ ان جیسے جیسے انسان کے ذہن میں سکوت کے ساتھ ہیں۔ انسان کی زندگی کے ہر دور میں
 تہذیب کے مغلیں دور کا یہی دور ہے۔ اب اس دور کے مسئلہ یہ یورپ و یوں کا ہے۔ اس میں کوئی شبہ
 نہیں کہ جو مذہب اس دور سے عرب کے مذہب سے مختلف ہے۔ مذہب و تہذیب کے ساتھ ہی تو
 آپ مرگیا ہیں اس لئے۔ وجود وہ فوری عرب کے بھی عرب کی رہے۔ کا ایک دور۔ جس کی کوئی ہے۔ ہر فرد کے
 دہیں ہیں اس عرب کی سنت کیسے نہیں۔ لیکن یہ فرد کے ذہن میں اس کا وجود قطعی ہے۔ جس کی جہتوں کی اسپرٹ
 اب جیسے جیسے یہ تہذیب یورپ کے ذہن پر چھوٹی رہی۔ عام اسلامی کے مسدود میں یورپ تہذیب کا وجود
 موقوف بھی اس روایتی ”جو مذہب کی یا زمانہ کر دیا ہے جو اس میں نہیں رہا جو کہ یہ مذہب ان ترک کا ہوتا ہے

معلوم ہو کہ دین ایک روحانی قوت ہے اور مادی طاقت ہم پہنچنے کے لیے ایک مددگار بھی ہے۔ دین ہر
 حد کے مضبوط ہے خود ایک چٹان ہے ورنہ کرمز بد کرنے کی تلقین بھی ہے۔ امریکی اور یورپین استعمار کے لیے اس
 کے مو کوئی چارہ نہیں کہ اس دین کا دشمن بن کر رہے۔ سو دشمنی کے لیے مختلف قوموں کے طرز متفقہ کے ساتھ
 محنت ہوتے رہتے ہیں اور حوں و معروف کے ساتھ نئی نئی سکیمیں خیر کر رہے ہیں۔ منوفز نس نے مغرب کے سارے
 عرب ممالک ہیں اس دشمنی کے غم تر قوم کی محافظت یا کسی ورہمے کے سارے اسلام کے خلاف کھد جنگ
 کا عدل کر رہا ہے۔ دشمنی میں اس کے زائد سے دن دہائے یہ عرب کرنے ہیں کہ وہ مسیحی مجاہدین کی نسل سے ہیں۔
 انکسار نہ کرو و میری کہ یہ خیر کرنا ہے اور خوشی اور خفاء کے ساتھ مصر کے جیسی دعوں میں اپنے
 غور کی۔ اس کا تعلق ناگہ ایک ہی ذہنیت پر وہ چڑھائے جو سومی زندگی بد مسرتی زندگی کی ساری قدر
 کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ جب وہ اس ذہنیت کے حق سے تڑد کی یک پوری سس کو نہ کر چکا تو اس نے ان کو
 کا خوب و دوسرے جیسی دعوں میں پھیل دیا۔ وہ تہذیبوں کے ذہن کو اس سانچے میں ڈھالیں اور
 بیت بعد و رہے کئے عمل نیا کر رہے جو اس ذہنیت کو پروان چڑھائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اس بات کا پورا
 ہمت کیا کہ وزیر تعلیم کے نصاب سے جو رہنمائی و رہنمائی وضع کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں سلامی
 تہذیب کی سچی نمائندگی کرنے سے غافل ہو کر دیکھ جائے۔ اس مضمون پر یہ تہذیب کے ہر دور کے بعد جو
 مصری عام ذہنیت کی تشکیل میں بہت زیادہ موثر ہے۔ نگر نروں کو اس کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ دینی رجحانات
 کے خلاف کھد جنگ کریں۔ تمام ملک جو بی سوڈان کا حق سے وہاں سے بچاؤ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔
 وہاں اس کا جو موقف تھا وہ ایسی متبعین و مسلمان، جروں کے سلسلہ میں اس باہمی سے سامنے آئے جسے ہم و ہر
 بابا کر چکے ہیں۔ و ہر مگر یہ بہت زیادہ کرنا ہے و ہر بہت عیب ہے۔ یہ کرنا ہے کہ جو اسلام کے
 عقیدہ، خدق و نگر بن کو باہر کر کے سے فنا کے کھاتے مار سکتا ہے۔

تمام استعماری ملک اس دین کی دشمنی و نگر بن کے سلسلے میں گرتے گرتے کئی صدیوں سے ایک ہی
 روش پر چل رہے ہیں۔ اور اہل تک وہ اس سوچی سمجھی روش پر پورے دق و نعاوت کے ساتھ چل رہے ہیں۔
 اس حیثیت کا مشاہدہ صرف یورپ اس موقع کے ہر ممالک کے جو معرئی قوم نے ہر ممالک میں ختم
 کر رکھا ہے جس کا اسلام سے دور بان نزدیک کوئی ہی تعلق ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملک ہیں یہودیوں کا اقتصادی اثر مغرب کو اس

حواشیاء اسلام کے علم و رویہ پر سرنگہ کے جا رہے ہیں۔ اسلام ایک مریضہ صلبیت کی طرح مندرجہ
 اسلام کے اندر مضبوط حیات کے یہ پتہ عام ہیں جن کو نئے نئے مریضہ صلبیت کی بات کرتے
 ہیں کہ اسلام کے بس قوت کا نفاذ سراسر موجود ہے کہ ایک صدی زندگی مریضہ صلبیت میں رہا ہے، اس کے
 ایسی زندگی جو صرف آرزو و خیال پر نیک کے مہر سے ہیں مریضہ صلبیت کی غلطیوں و بددلیوں پر
 و مریضہ صلبیت کو نکھولنے سے دھماکا ملتا ہو۔ صدی زندگی کی شکست و خوارگی کو اسے عیاں کر دیکھا
 رہے و تعمیر نو کی دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں اسے وجود و حیات و موت کے
 جس کا اسے مقابلہ کرنا پڑا ہے و جس کے سب سے بھی سے رک جاتا ہے۔ یہاں پہلے جانتے پر
 ہی مریضہ صلبیت، پتہ پتہ قوت و حیات کے مریضہ صلبیت پر مریضہ صلبیت کے یہ موسم گرما
 کے باروں میں جن میں جو انہیں اثر کر کے جائیں گے۔

ہیں اس بات میں ڈنڈہ اور غیبت و خیال رکھنا ہوں کہ عام اسلامی میں اسلامی زندگی کی جڑ
 مکان ہے و مستقبل میں اسلام صرف چند ممالک کا نہیں بلکہ دنیا کا ہی مریضہ صلبیت رکھنا
 ہے۔ یہ مریضہ صلبیت، وجود و حیات کے مریضہ صلبیت کی روح میں مریضہ صلبیت کی روح میں
 برائی سرا کا ہے۔ اس کے عین غیبت پر ہے کہ اس میں متعدد مریضہ صلبیت کا مل جاتا ہے۔ بہت سے
 ہنس رہے ہیں اس کو بنام دے کہ ہم خود اسلامی سوسائٹی میں بھی حقیقی اسلامی زندگی کی تجدید کی
 توقع میں کر رہے ہیں۔ عین غیبت کا ٹھیک جبکہ اندر رہا و مریضہ صلبیت کی مریضہ صلبیت کی مریضہ صلبیت
 کا ہے جس سے متعدد مریضہ صلبیت کا مل جاتا ہے۔ اس کی بلندی اور اس مقصد کے لئے کمر بستہ ہونے والوں پر
 جو درد و ریاں عام ہوتی ہیں اس کے غیبت و حیات کا حور و مریضہ صلبیت کا ہے۔

خوشی کے عمل کا مریضہ صلبیت و مریضہ صلبیت کے مریضہ صلبیت کے مریضہ صلبیت کے مریضہ صلبیت کے
 ہے کہ اس راہ کی مشکلات و زبردستیوں کا ایک مریضہ صلبیت کا ہے۔ مریضہ صلبیت کا ہے کہ اس راہ کی مشکلات
 ذریعہ جوش و زہا متصور ہے اس کو اس سے بد و جہد پر مریضہ صلبیت کا ہے۔ مریضہ صلبیت کا ہے
 ناگزیر ہے۔

قدرتی طور پر حصہ و مریضہ صلبیت کے مریضہ صلبیت کے مریضہ صلبیت کے مریضہ صلبیت کے
 سبب اب اسلامی طریقہ حکمرانی کو اپنانا ایک مشکل کام ہے۔ آج سیاسی اور سماجی نظام زندگی کی...

میں نے یہ سوچا کہ اگر وہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں
 تو اس کے لئے وہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 لیکن یہ وہی ہے جس نے اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 ضرور ہے کہ یہ بات مسلمانوں کے شعور و احساسات کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 مگر نہ لگیں کہ یورپ ان کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 ہے۔ اس کے لئے وہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔

یہ وہی ہے جس نے اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 کہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 مگر نہ لگیں کہ یورپ ان کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 ہے۔ اس کے لئے وہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔

یہ وہی ہے جس نے اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 کہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 مگر نہ لگیں کہ یورپ ان کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 ہے۔ اس کے لئے وہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔

یہ وہی ہے جس نے اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 کہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 مگر نہ لگیں کہ یورپ ان کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔
 ہے۔ اس کے لئے وہ اس کے لئے یہاں پہنچے ہیں۔

ہے "حیات محمدیہ" مسندِ فہرستِ بیگل نے یہ عبارت رسالہ "اسلام و تمدن" کے تحت
 کی ہے۔ مترجم۔

کے ساتھ جی ہوئی رومن ایمپائر ہستور مسیحیت کی راہوں میں حائل رہی اور یورپ کے مسیحیت قبول کرنے کے باوجود رومن سپانہ کی تعلیمات یورپ کی نئی تہذیب کی بنیاد میں بن گئیں۔ کیونکہ یورپ کی زندگی پر مسیحیت کے اثرات بہت گہری تھے اور کبھی گہرائی تک پہنچ سکے۔

یہاں ہم "اسلام دور" سے پہلے نامی کتاب سے چند اہم نقل کریں گے جو ہماری منش کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گے:

رومن ایمپائر میں فکر پر مبنی تھی وہ دوسری قوموں کو بزرگوں کی بات ماننے یا مادی زندگی کی فطرت ان کے استحقاق کی فکر تھی۔ ایک مخصوص طبقہ کے راس و آسائش کی نیل و سرور پر غور و تامل رہتی تھی۔ رومیوں کو نہ کوئی نرالی نظر آتی تھی۔ وہ اسے انسانی خطا سمجھتے تھے۔ وہ اس میں رہتے۔ جس کا انشا پر یا بے عرف رومیوں کے لیے مخصوص تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا بیان زندگی اور تہذیب کے مادی تصور کی بنیاد پر ہی چسپاں کیا جاتا ہے۔ اس مادی تصور کو اس فلسفہ نے ذوق نے کچھ شائستگی اور پختگی بخشی جس پر ان کے خیال نے مزید جھکاؤ دیا۔ لیکن یہ تصور بہت سادہ و سلیس کی روشنی میں تھا۔ وہ حقیقت رومیوں نے دین کا مادی ہی نہیں دیکھا۔ ان کے روایتی، بتائیے نالی خرافات کی بھونڈی نقاشی سے زیادہ حقیقت نہیں دیکھتے تھے۔ یہ مادی خیالی پکیر تھی جنہیں عام فہم کی حمایت کرتے ہوئے جو را کر کیا جاتا تھا۔ انہیں کسی بھی زندگی کے مسائل مسائل میں مداخلت کی اجازت نہ تھی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ جب سے کچھ دریافت کیا جائے تو نیچے بڑھوں کے واسطے سے اس کا منظم جواب دے جائیں۔ لیکن ان سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ انسانیت کو اخلاقی قوانین بھی عطا کریں۔

یہ وہ مٹی تھی جس میں جدید مغربی تہذیب کا پودا پروان چڑھا۔ بلاشبہ اپنی نشوونما کے دوران اس نے متعدد دوسرے عوامل کا اثر قبول کیا۔ چنانچہ قدرتی طور پر وہ اس تہذیبی ورثہ میں متعدد تبدیلیاں عمل میں آئی جو اسے روم سے ملتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے مادی رجحانات اور اس کے مادی رجحانات آج بھی وہی ہیں جو رومن تہذیب نے اسے متاثر کیے تھے۔ چونکہ قدیم روم کی اجتماعی اور

فکرو فقہ ہیتہ — نہ صرف بالفرض بلکہ واقعہ — نہ خداوندی تھی نہ کہ
 دینی بد بدیر مغرب کی فضا کی ایسی ہی ہے۔ نہ یہ کہ وہ کے پاس میں کے
 لغو ہونے کے لیے کہ وہ ایسا نہیں ہے۔ ہی وہ کسی ایسی دلیل و خدوہت محسوس کرتے ہیں کہ
 تب یہ درجہ رہے ہیں۔ بدیر یورپ کے ممبرانہ خلق خستہ و خدوہت، جس مسئلہ و مسئلہ
 کے کہ وہ سے سرت گھٹا ہے۔ مگر جب وہ وہیں کے ساتھ رہ رہی رہتا دیکھی جس میں بہت
 برادر یہ ہے۔ میں ایک طرف ماسک پیچ ہے۔ خطا تا بدیر نکارند میں۔ وہ
 اسپارگری ہے نہ سرت، امر میں کے۔ یہ میں کے موجود و فکری نظام میں خدا کے تصور
 کا نہ کوئی و کرد ہے نہ اس کی تپائش ہے مغرب نے وہیں انسانی کی میں مچان کو
 رہا زندگی واقعی اور کمال حاصل کرنے سے وہ ہے ایک طرف و فضیلت کا وہ دے
 دیا ہے۔ یہ چہ صدیہ چہ چہ ان خیالات کو کوئی عملی اہمیت دینا چاہتا ہے جو
 کوئی قوم کے اندر میں ہیں یا کہ کہ انسانی سماجی حقیقت کو اس حد تک
 متاثر کر سکتے ہیں یا نہ کہ جو دھڑا ستر و نوب میں سے کسی قسم میں نہیں ہیں۔
 بدیر یورپ کے نہیں دیا ان صورت ہی سے اس طرف جاتا ہے کہ کوئی عملی اہمیت
 دے ہی ہوا ہے۔

۔ وہ یہ یہ ہوا ہے کہ یہ رجحان مسیحی و کتبے میں طاعت ہوتا ہو سکتا ہے۔ کیا یہ
 حقیقت نہیں کہ مسیحیت جیسے مغربی تہذیب کے دوسری نظام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس
 ہی کی طاعت ایک مذہب ہے جو اخلاق کے مطلق تصور پر مبنی ہے۔ بدیر حقیقت یہ ہے
 مگر اس سے بڑی مطلق دعویٰ نہیں ہو سکتی کہ بدیر مغربی تہذیب کو مسیحیت کا پروردہ فر
 دیا جائے۔ بدیر مغرب کی حقیقی فکری بنیادیں یہ قدیم رو میں تصورات میں ملتی ہیں جو
 زندگی کو مطلق تصورات سے عاری خالصہ مفادات کا معاملہ قرار دیتے ہیں۔ اس نظریہ کی
 ترجمانی اتنا الفاظ کے ذریعہ کی جا سکتی ہے کہ چونکہ انسانی زندگی کے آغاز و رجحان موت
 کے بعد اس کے انجام کی بابت ہمیں کوئی قطعی علم — جو عملی تجربہ و تحقیق اور جسمانی تخمینہ پر
 مبنی ہو — حاصل نہیں ہے۔ لہذا بہتہ ہی ہے کہ ہم اپنی ساری قوتیں مادی اور ذہنی

امکانات کی تکمیل پر مرکوز کر دیں۔ ہمیں ان مطلق خلائیات اور آداب زندگی کا پابند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں جو غلط ثبوت سے عاری دعووں پر مبنی ہیں۔ اس میں ذرہ برہنہ نہیں کہ یہ رجحان اصلاً مذہبی ہے۔ جدید مغربی تہذیب کے عملی کارناموں کو یہ کسکی تعلیمات کی طرف منسوب کرنا ایک زبردست تاریخی غلطی ہے۔ مغرب کی تہذیب جس سائنٹفک مادی ترقی میں دوسری تمام تہذیبوں پر فوقیت لے جا چکی ہے، اس میں مسیحیت کا حصہ بہت کم ہے۔ یہ ترقی درحقیقت نتیجہ ہے اس ٹول کش مکش کا جو چورپ دھسپی کلیسہ سے زندگی پر اس کی حکمرانی سے سرفراز ہوئی ہے۔ آج عوام کی کتھیت کے لیے مسیحیت کی تان ایک رسمی چیز بن کر رہ گئی ہے جس میں طاعت قدیم رومان کے نزدیک اس کے دیوتا تھے جن سے عملی زندگی پر کوئی حقیقی اثر مرتب کرنے کی توقع تھی نہ نہیں اس کی مبارک دہی جا سکتی تھی۔

بلاشبہ آٹھ بھی مغرب میں کچھ فرمایا ہے۔ یہ جو مذہبیں رہ رہ کر سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اور اپنے اعتقادات اور اپنی تہذیب کی اسچٹ میں ہر آہنگی پیدا کرنے کی انتھک کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ فراموشیات میں سے ہیں۔ دسہ یورپی افراد، خواہ وہ تہذیب پسند ہوں یا فسطائی، سرمایہ دار ہوں یا بالشویک، صنعتی مزدوروں یا فلسفی، صرف ایک ایجابی مذہب رکھتے ہیں اور وہ ہے مادی ترقی کی پرستش۔ یعنی یہ عقیدہ کہ زندگی کا مقصد ایک مقصد ہے، زندگی کو زیادہ سے زیادہ سہل و خوشگوار بنانا، یا رائج جوت میں وہ قدرت کے قہر سے آزاد کرنا، اس مذہب کے مندرجہ ذیل نشان کارخانے ہیں تاکہ کہیں تجر بہ نکالیں، ناپت گھر اور بھلی گھر ہیں۔ اس کے بہت دور پہنچی، بینکر، نجیب، فلمی ستارے صنعتی لیڈر اور ریکارڈنگ گھر کرنے والے ہیں۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ طاقت اور ست کے لیے اہم مسابقت ہے۔ اس سے ایسے گروہ پیدا ہو رہے ہیں جو ستاپاٹل ہو کر ایک دوسرے کے غدوف پر سر جٹک ہیں۔ وہ یہ تہذیب کیے ہوئے ہیں کہ جب بھی ان کے منہ ٹکرائیں گے وہ ایک دوسرے کو فنا کر کے رکھ دیں گے۔ تہذیب اعتبار سے اس کا نتیجہ ایک ایسے انسان کی تخلیق ہے جس کا فلسفہ اخلاق عمل فوائد کا ناٹھ ہے اور جس کے پاس خیر و شر کا اعلیٰ ترین معیار مادی ترقی ہے۔

زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کے درمیان یا انسان اور کائنات کے مابین کسی تعارض کا قائل نہیں۔ اس کے برعکس وہ زندگی کو ایک اکائی قرار دیتا ہے جو کامل توافق و ہم آہنگی کے ساتھ ان مفہموں کی طرف بڑھتی ہے۔

پس اسلام انسانیت کو زندگی کے بارے میں ایک مکمل نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ نظریہ مختلف حالات پر منطبق ہونے یا ذہنی معاملات میں رہنمائی کے سلسلہ میں ہمیشہ ترقی اور نشوونما کی مسابقت رکھتا ہے لیکن اپنی بنیاد یا رہنما کے معاملہ میں مصالحت یا پیوند کا رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ اس جامع فکر کے بنیادی نتائج کو پوری طہ پر لے کر لانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے مکمل طور پر نافذ کیا جائے ورنہ اس کی بنیاد یا رہنما میں ذرا سی تبدیلی بھی اس میں ایسا خلل پیدا کر دے گی جس کے بعد اس زندگی کی تشکیل ناممکن ہے جس کا نقشہ اسلام پیش کرتا ہے۔

جہاں تک زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ اس کی فکر کی بنیاد پر تطبیق و ترمیم میں نشوونما کا سوال ہے یہ ایک فطری امر ہے۔ خود اسلام کا مذاہن آج اسے ضروری قرار دیتا ہے، اس کی ترمیم دیتا ہے، اس کے ذرائع و وسائل فراہم کرتا ہے اور اس کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ قیاس، اجتہاد اور وہ وسیع اختیارات جو اشر کی شریعت کے مطابق حکومت کرے والے صاحبِ امر کو دینے چاہئے ہیں، یہ سب ہمیشہ عملی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے اور اس کے نئے نئے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تطبیق و ترمیم میں نشوونما جاری رکھنے کے زندہ اور فعال ذرائع ہیں۔

یہ بات کا اہتمام ضروری ہے کہ تطبیق اور ترمیم اسلام کے بنیادی اور اصولی افکار سے بے جوڑ نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ان کے رجحان کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے رشتہ پر چل پڑیں یا رشتہ اسلام کو دغا دے کر اس کی سیدھی صداقت اور مہارت و رُبوبیت کی بجائے کسی دوسرے اسپیٹ کو اپنالیں۔

جب اسلامی معاشرہ عملاً برپا ہو جائے گا تو اس معاشرہ پر اس دین کے قوانین کو منطبق کرنے اور اس ضمن میں اجتہاد کرنے کے لیے ایک وسیع مہدیان سامنے ہو گا۔ کسی جزئی مسئلہ میں کسی بات کو رد کر دینے یا قبول کر لینے کے لیے ہمارا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ ہمارے اسلام کے بنیادی فکر و اس کے اصول پر کھیں جو چیز اسلام کے بنیادی فکر اور روح کے موافق نظر آئے اسے قبول کر لیں اور جو چیز ان کے خلاف واقع ہوئی ہو اسے رد کر دیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں یہ بات ایمان کی طہ راس اور جوش و نردش

کی پشت پناہی کر سکے جس کی بنا فہم اشارہ کر رہے ہیں، اور ایک حقیقی اسلامی زندگی کا قیام ممکن ہو جائے
اس طرح یہ زندگی قانون اور ہدایت و ترغیب کی ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکے گی جن کو سلام اپنے جملہ مقاصد
کے حصول میں ذریعہ بناتا ہے۔

مگر زندگی کی تنظیم عمل میں لانے والی اسلامی قوانین سازی کی فکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اولاً
اور گرد ہوں گے دلوں میں اسلامی عقیدہ کو اس کی ان بنیادوں پر از سر نو استوار کرنے کی کوشش کریں
جن کی وضاحت اس باب کے آغاز میں کی گئی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ایسی ثقافت، تربیت کے ایسے ذرائع اور فکر بنانے کے ایسے طریقوں سے
کام لے کر جو اسے مغربی ہیں، اور اسلامی فکر کے دشمن ہیں، اسلامی فکر کیسے پیدا کر سکتے ہیں۔ اولاً یہ نظام تعلیم
و تربیت، مادی بنیادوں پر قائم ہے جو زندگی کے بارے میں اسلام کے نظریہ کی عین ضد ہے۔ ثانیاً
اسلام دشمنی اس کی سہ مشیت میں داخل ہے خواہ یہ مقصد غلط ہو یا پوشیدہ۔

پنجی بات تو یہ ہے کہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اسلامی فکر کے احیاء کے لیے مغربی فکر کو
ذریعہ بنا کر ہم پہلے ہی قدم پر اپنی شکست کا اعلان کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے سی مغربی فکر سے
نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک خالص اسلامی طرز فکر اختیار کرنا ناگزیر ہے تاکہ یہ اطمینان
ہو سکے کہ جو چیز اس کے نتیجے میں جنم لے گی وہ دوغلی نہیں ملے گی۔

اسلامی فکر میں حاکمیت کا تصور صرف اسی تک محدود نہیں کہ احکام و قوانین قبول کر لیے
جائیں اور انہی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ اللہ کی بندگی کی صورت میں یہ نہیں کہ صرف اسی سے
شرعیات حاصل کی جائے اور اسی شریعت کو بلکہ امور میں فیصلہ کن قرار دیا جائے۔ اس صورت میں
جب کہ ہم لفظ شریعت کو سیاسی نظام کے اصولوں اور اس کے قوانین کے محدود معنی میں استعمال کریں
کیونکہ اسلامی فکر میں شریعت کے معنی نہ اتنے ہی نہیں۔

اللہ کی شریعت سے مادہ ساری باتیں ہیں جو اللہ نے انسانی زندگی کی تنظیم کے لیے دی
ہیں۔ یہ ہدایات عقاید، اصول حکمرانی، معاملات زندگی، اعمال عام کے طریقوں، نام یہ کہ عینہ و سلطانیہ
نظائیر کے مقدمات، قوانین، اخلاق اور معاملات، ایک سے متعلق ہیں۔ یہ ہدایات ان قدروں اور
معیاروں کی صورت میں ملتی ہیں جن کو معاشرہ میں حکم الہی ہونا چاہیے۔ جن پر بیوقوفوں، داعیات اور غیبتوں

کو پہنچا ہے۔ پناہ ہے۔ قدرتی اور فنی سرگرمیوں اور علم کے تمام شعبوں کو کسی بھی حیاتیات کے مطابق ڈھالنا
یہ ہے۔

قدرتی ہے۔ یہ سب امور میں اندر ہی سے رہنے کی حاصل و حاصل ہے۔ بالکل سی ٹی ٹی ٹی
جو سب سے پہلے کی صورت ہے اس سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب کامینٹ میں ہے۔ یہ سب
کائناتوں کے جو حصہ ہیں وہ ہیں کہ بسند ہے۔ اس کی یہ سب کیفیت ہے۔ یہ سب فکر کی بنیادوں
کی طرف سے ہے۔ اس سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے سبب میں یہ سب چیزیں ہیں
اس کے میں ہے۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ اس سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
ہے۔ اس سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
پناہ ہے۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
ہے۔ اس سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
اس سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
ہیں۔

اس بات کو ایک مثال کے طور پر سمجھیں۔ سب سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
ہے۔ اس سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
رہتے ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
اس سے پہلے ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب چیزیں ہیں۔ یہ سب
پہلوں سے لطف اندوز ہو سکے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے بنی ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں مادی
دباؤ اور تنگی سے آزاد ہو کر ترقی کر سکے۔ اس کی صورت کے مطابق زندگی میں بہترین کامیابی ہے۔
اِنَّ اَكْثَرَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَلْفَاكُحُۙ اَمۡرٌ مِّنۡ سَمۡعٍ مِّنۡ ذٰلِكَ مِمَّا يَتَذَكَّرُۙ اِنَّ اَكْثَرَكُمْۙ اَعۡمٰیۙ اَلۡفَاكُحُۙ
ہو، اسلام میں اخلاق و معاملات کی بنیاد تقویٰ ہے کیونکہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور انسان
کی عبودیت کا اظہار ہے، اور یہی اس کیفیت اور نیت و اخلاقیات کو جنم دیتا ہے جن پر اخلاق کی پوری
عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ ان مقدمات کو ہم دوبارہ واضح کر چکے ہیں، پھر بھی یہاں ان کا دوبارہ ذکر

کر رہے ہیں۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ اسلام اپنی مخصوص قدریں رکھتا ہے جن کا منہج دہی ہے جو عقیدہ کا منبع ہے۔ کوئی دوسری چیز ان اقدار کا، خذ نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ صرف اللہ کی اوستیت کے حضور بندگی بجا لائے کا یہی تقاضا ہے۔ اللہ کی شریعت کے اسل مفہوم کے اعتبار سے یہ قدریں بھی اسٹی غنوم کا جزو ہیں۔ شریعت کی اصطلاح آج جن محدود معنی میں استعمال کی جاتی ہے فی الحقیقت اس کے معنی اتے محدود نہیں ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ مسلمان عقیدہ و فکر، اخلاق و معاملات، اور معاشہ میں رائج قدروں اور معیاروں کو اللہ جل شانہ کے سوا کسی دوسرے سے ماخذ سے نہیں حاصل کر سکتا۔ ان چیزوں کو صرف اللہ ہی سے حاصل کرنے کا مسئلہ عقیدہ کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ انہیں اللہ کے سوا کسی دوسرے سے اخذ کرنا صرف اللہ کی اوستیت کے حضور مکمل بندگی کے اعتراف کے منافی ہے۔ ان میں رہنمائی حاصل کرنے کی نوعیت بھی وہی ہے جو حق فونی احکام کے سلسلہ میں رہنمائی حاصل کرنے کی ہے جن کے بارے میں اللہ کا حکم ہم اور پر واضح کر چکے ہیں۔

انسانی قدریں: زرعی ہوتی ہیں نہ صنعتی۔ زرعی سماج یا صنعتی سماج اپنی مخصوص علیحدہ اخلاقی قدریں نہیں رکھتا۔ بورژوا سماج اور پروتاری سماج کے لیے الگ الگ اخلاق کا تصور غلط ہے۔ ایسا نہیں کہ بورژوا سماج کے لیے کچھ قدریں ہوں اور پروتاری سماج کے لیے دوسری قدریں ہوں۔ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی اخلاق الگ الگ نہیں ہوتے۔ سرمایہ دارانہ قدریں اور اشتراکی قدریں علیحدہ وجود رکھتی ہیں۔ اخلاق یا تو اسلامی ہو یا جاہلی۔ قدریں اسلامی ہوتی ہیں یا جاہلی، ان کی کوئی تیسری قسم نہیں ہوتی۔ اخلاق و اقدار کی ایک قسم وہ ہے جو اس تصور سے پیدا ہوتی ہے کہ ایک ہی آقائی ہے اور جہیز اور جہیز روت بندگی کے ایک ہی رشتہ میں منسلک ہے۔ اخلاق و اقدار کی دوسری قسم وہ ہے جو بہت سے آقاؤں کے تصور سے جنم لیتی ہے۔ اگرچہ آقائیت کی شطیں مختلف ہیں۔ جس کی بنیاد مختلف آقاؤں کے درمیان انسانی ضمیر کی پر گندگی اور انسانی زندگی کے بٹ جانے پر ہے اخلاق، اقدار کا ایک نئی سہہ ہے جو اس وجود، اپنے خالق سے اس کے رشتہ، اس کائنات میں انسان کے مقام، وجود انسانی کے مقصد اور اس کے منصب و کردار، نیز مادی کائنات، ذی روح مخلوقات اور بنائے جنس سے انسان کے تعلقات و روابط اور ہم ان سب کے اللہ سے تعلقی نوعیت کے اسلامی تصور سے ابھرتا ہے۔ اخلاق و اقدار کے دوسرے نظام وہ ہیں جو مختلف جاہلی تصورات سے ابھرتے ہیں۔ اسلامی

تصور کے، سوا تصور جہاں تصور ہے۔ یہ وہ مختلف، منتشر رہیں ہیں جو کبھی بھی خدا کے واحد کی راہ سے نہیں ملتیں، وہ راہ جس کی وضاحت خدا نے اپنی کتاب میں خود کر دی ہے۔ نہ کہ اس راہ کا وہ فہم جو کچھ بگ اینی خواہشات کے مطابق کہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ من گھڑت رہیں کبھی خدا تک نہیں پہنچتیں۔
اجتماعی حاکم سب سے اہم سے اور اقتصادیں ڈھانچے تمام تر اعتقادی تصور کی شاخیں ہیں۔
اسی تصور سے جو نئے دلی قدروں کی تسلسل تطبیق کا نتیجہ ہیں اس وجہ سے لازم ہے کہ ان کا، خدا کی تصور کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اور انھیں شریعتِ اسلامی ہی سے خدایا جائے۔ شریعت ان محدود معنی میں نہیں جس میں یہ محدثات آتے ہیں۔ تنسور کی ساری بات ہے اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے۔ یہ نہ تو خدا ہی کو اسے تسلیم کر کے ہی کی بندگی میں تسلیم کر دینے کا تقاضا ہے کہ جہاں موری بات رہنمائی ہو رہی ہے۔
ابن سے حاصل کریں۔ ان کا درجہ بھی وہی ہے جو شریعت کے موجودہ محدود معنی یعنی قانون احکام کا ہے۔ ان حاکمیت کے مفہوم کو کسی قانونی احکام صادر کرنے تک محدود کر دیا گیا ہے، حاکم شریعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہے، حاکمیت کا حلقہ بھی موجودہ محدود مفہوم سے وسیع تر ہے۔

اگرچہ اس جیسی باتیں پڑھنے والوں کے لیے یہ باتیں نئی ہوں گی۔ نوکھی گراں پر زور دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ تصور کے مسائل میں شامل ہیں، کیونکہ ان کا تعلق بدو وسط و ہر دور خدا سے و خدا کی ممکن بندگی کے قرینہ مدد قرار ہے۔

حوالہ کسی دور نامی ہو کی، وہ اب آرٹ، سائنس و ہر دور کے علم و افکار سے متعلق مرکزیموں میں مدد سے تصور سے بنی ہوئی مسائل ہیں، ہر بات ایسی کی صورت میں طور پر جوٹ کرنا ہے کہ یہ بھی عقیدہ سے خالی نہ کہنے۔ یہ مور ہیں، یہ سب کچھ بھی مدد، خدا ہی کو اسے تسلیم کر کے اس کی ممکن بندگی اختیار کرنے کا لازمی تقاضا ہے۔

آرٹ اور سائنس کے خیموں میں اس موقع کی وضاحت میں ایک پوری کتاب لکھی جا چکی ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آرٹ سے متعلق مسئلہ انسانی سرگرمیوں، انسان کے صورت، آواز، رنگ و روغن اور حیوانات کے انسانی نہیں، اسے عبارت ہیں۔ یہ سب کچھ ایک مسلمان کے قلب و دماغ میں رائج اصول تصور ہی کے تحت ہرگز سے پیدا ہونے والی چیز ہیں کہوں کہ کائنات، ذہن انسانی و حیات انسانی کے مختلف سیلو اور کائنات و حیات اور نفس انسانی کے بنانے والے سے ان کا تعلق سب اس تحت رکھے۔
نہ محمد قطب، آیت اللہ اسلامی۔

دائرہ میں شامل ہے۔ یہ چیزیں مسلمان کے اس مخصوص تصور کا عکس ہیں جو وہ انسان کی حقیقت
 کائنات میں اس کے مقام، وجود انسانی کے مقصد، اس کے منصب و کردار اور اس کی اقدار حیات
 کے بارے میں رکھتا ہے۔ اسلامی تصور بعض نظریاتی تصور نہیں بلکہ ان تمام امور سے متعلق حقائق کا
 حامل ہے۔ کیونکہ وہ ایک رہنما اعتدالی تصور ہے جس کی فعال تاثیر انسان کے ہر اظہار و تاثر پر چھا
 جاتی ہے۔ آئندہ صفحہ ت میں ہم اختصار کے ساتھ اس مسئلہ پر مزید گفتگو کریں گے۔

یہ بات کہ سائنس و دوسرے علوم و افکار سے متعلق جملہ کوششوں میں اسلامی تصور
 اور الہی ماخذ سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ اللہ واحد ہی کو اللہ تسلیم کر کے اسی کی بندگی کرنے کا
 تقاضا پورا ہو اور عقیدہ کی جہت سے مسلمان کا اسلام مقبہ قرار پائے، ایسی بات ہے جس پر ہمارے
 لیے قدرے تفصیلی اظہار و خیال ضروری ہے۔ کیونکہ یہ اس دور کے قارئین یہاں تک کہ ان مسلمانوں کو
 بھی انوکھی یا انہی معلوم ہوگی جو تسلیم کرتے ہیں کہ ایمان و اسلام اس وقت تک معتبر نہیں جب
 تک حاکمیت اور قانون سازی صرف اللہ کے لیے مخصوص نہ ہو جائے۔

مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ کسی ایسے معاملہ میں ہدیت الہی کے سوا کسی دوسرے ماخذ سے
 رہنمائی حاصل کرے جو عقیدہ، نظریہ کائنات، عبادت، اخلاق، سماجی قدروں، یا سماجی، سیاسی اور
 اقتصادی نظام کے اصولوں اور بنیادوں سے متعلق ہو، یا جس سے موضوعات یہ ہو کہ انسانی تارخ میں کار و نما
 قوتیں اور انسانی سرگرمیوں کے محرکات کیا ہیں۔ یہ باتیں ایک مسلمان کسی ایسے مسلمان ہی سے سیکھ
 سکتا ہے جس کی دین داری و تقویٰ پر اور اس بات پر پورا اعتقاد ہو کہ وہ عمل زندگی میں بھی اپنے عقیدہ
 پر پوری طرہ قائم ہے۔

البتہ مسلمان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ مجتہد و سائنس، شہر کی مشین، ذرا کس، بیالوجی، آسٹرونومی
 علم صنعت اور عظیم زراعت، ایڈمنسٹریشن کے فنی و انتظامی محکمہ، و مختلف کاموں کے کرنے کے
 عمل و نتیجہ نیز فنی پہلو کی حد تک طریق جنگ و رسی جیسے دوسرے علوم و فنون میں جس سے چاہے تعلیم و
 تربیت حاصل کرے۔ تاہم وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، جب مسئلہ معاشرہ و قوم پر ہو تو اس میں نتیجہ و نتیجہ ہے
 کہ ان تمام امور کو اجتماعی ذہن سمجھتے ہوئے، سیرت میں زیادہ سے زیادہ تیاری کی جائے اور کچھ
 افراد پر میدان میں ایسی مہارت پیدا کر لیں کہ باقی افراد کے سامنے ان ذہن کفایت کی انہی مہارت کی ضرورت

[illegible]

جو علوم ذرا جماعت کے مسائل و حوالہ کی جامع تعبیر کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ یعنی جس کا موضوع انسان و نفس۔ بدن و ریح و ملل و کائنات و حیات و انسان کے تبار کا وہی ہے جس کا تعلق باہر و طبیعیات سے ہے۔ جو علم مجتہد سائنس متاثریڈی فزکس، سٹریٹری بیا لوجی، طب و غیرہ ہیں بحث کرتے، اس کی حقیقت بھی وہی ہے جو قانونی حکام و منظر و روی کے اصولی ڈھانچہ اور بنیادوں کی ہے۔ یہ علوم بھی عقیدہ سے وابستہ ہیں۔ ایک مسلمان ان علوم میں صرف اس مسلمان سے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے جس کی دین و دنیا و رقیبی و غیبی کی ساری معلومات ہو کہ وہ ان علوم میں بھی ہدایت الہی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ ہم بات یہ ہے کہ مسلمان کو اس میں ہونا چاہیے کہ یہ مسائل اس کے عقیدہ سے مربوط ہیں و اس کے صرف خدا کا بندہ ہونے کا، یعنی اس کے اسلام کا تقاضا ہے کہ ان میں ہدایت الہی کی طرف رجوع کیا جائے۔

ن علوم کا ایک مسلمان طالب علم باہلیت کے پیدا کیے ہوئے پورے لڑیکہ کا ہا ہر گز
اس لیے نہیں کہ اس ہا ہر سے ان ہور کی باہت اپنا فکر بنائے بلکہ وہ اس لیے کہ یہ بیان ہے
کہ باہلیت کس طائفہ ہوی اور ان علوم کو اسلامی فکر کی بنیادوں پر متب کر کے انسانیت کی

اس گمراہی کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔

قدیمہ جدید غیر اسلامی جاہلی فکر کے پروردہ ان علوم کے مجموعی رجحانات پر جاہلیت کے تصورات کا نگہ اثر پڑا ہے، اور یہ انہی تصورات پر مبنی ہیں۔ یہ بات فلسفہ، فلسفہ تاریخ، نفسیات (باستثناء مشاہدات و تجربات کے، نہ کہ تجربات سے مستنبط نظریات کے)، اخلاقیات، مذاہب کے تقابلی مطالعہ اور اعداد و شمار اور واقعاتی معلومات کو مستثناء کرتے ہوئے، ان سے اخذ کیے جانے والے عام نتائج کے لحاظ سے) سمجھت سب کے بارے میں درست ہے۔ ان تمام علوم یا کم از کم ان میں سے اکثر کے اصول تحقیق میں دینی فکر بالخصوص اسلامی تصور کی دشمنی کیلئے طور پر یا مخفی طور پر موجود ہے۔ اس قسم کی علمی اور فکری کوششوں کا معاملہ سمیٹنی، فزکس، آسٹرونومی اور طب جیسے علوم سے ایسے مختلف ہے۔۔۔۔۔ اس وقت تک جب تک یہ مؤخر الذکر علوم علمی تجربات کے دائرہ میں رہیں اور واقعی نتائج ریکارڈ کرنے پر قناعت کریں، ان سے آگے بڑھ کر کسی نوع کی فلسفیانہ تعبیر نہ پیش کریں۔ اس طرز کے تجاوز کی ایک مثال ڈارونزم ہے جو بیالوجی میں مشاہدات اور ان کی ترتیب و تجزیہ سے آگے بڑھ کر بغیر کسی علمی ضرورت اور دلیل کے مفروضات کے تحت یہ رائے بھی ظاہر کرتا ہے کہ زندگی کے آغاز اور ارتقاء کی توجیہ کے لیے عام طبیعی سے ماوراء کسی نہ ارجی وجود کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک مسلمان کے لیے ایسے تمام امور کی بابت اس کے بچے آقا و پروردگار کا بیان کافی ہے اور اس بیان کے مقابلہ میں ان موضوعات پر ساری انسانی کوششیں بیپا اور بے فکرانہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس پرستار دیکھ کر یہ مسئلہ عقیدہ سے بڑھ کر راست تعلق رکھتا ہے۔۔۔۔۔ اس عقیدہ سے کہ انوہیت صرف اللہ کی ہے اور اسی کی مکمل بندگی کی جانی چاہیے۔ یہی عقیدہ اسلامی تصور کی بنیاد اور اس کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ثقافت پوری انسانیت کی میراث ہے۔ اس کی نہ کوئی قومیت ہے نہ وطن نہ مذہب۔ یہ بات مجھے دسائیس اور اس کے عملی استعمال کی حد تک درست ہے۔ لیکن یہ علوم اپنے دائرہ سے تجاوز کر کے اپنے نتائج تحقیق کی فلسفیانہ تعبیر میں نہ پیش کرنے لگیں اور نفس انسانی، انسانی اعمال و حرکات، تاریخ، آرٹ، ادب اور اظہارِ مذہب کی مختلف ہیئتوں کی فلسفیانہ تشریح کا ذمہ

نہ لے لیں۔ لیکن اس دائرہ سے باہر امور و مسائل کی بات یہ بننا دراصل اس عالمی یہودیت کا ایک ذریعہ ہے جو یہ رکاوٹ کو، بالخصوص مذہب عقیدے کے روبرو اپنی راہ سے ہٹا کر پوری دنیا میں یہودیوں کے نفوذ کے لیے رد میوار کرنا چاہتی ہے۔ یہودیت انسانیت کو یہ مغالطہ دے کر اپنے شیطانی منصوبوں کو عمل کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ اس کی تائید سائنس کی شہ گریہاں میں ہیں جن کے تجربے پوری انسانیت کی جذباتیہ کے تحت یہودیوں کے قتل و کرب و غم پر مبنی مادی اور روح کی طرف کھینچنے والے تجربے اسلام کا وقت یہ ہے کہ مجتہد تجربی علوم و فنون کی عملی تطبیقات کے علاوہ ثقافت کی روشنی میں اسلامی ثقافت جو اسلامی تصور پر مبنی ہے، اور انسانیت طریقیوں پر مبنی حلی ثقافت جس کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ کی رہنمائی کو نظر انداز کرتے ہوئے انسانی فکر کو الگ و جدا کر دے دیا جائے۔ اسلامی ثقافت انسان کی تمام فکری اور عملی سرگرمیوں کے لیے ایک وسیع میدان فراہم کرتی ہے اور ایسی بنیادیں، طریقے اور خصوصیات رکھتی ہے جو ان سرگرمیوں کی ترقی اور ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی ضمانت میں ہیں۔

یہ جان لینا کافی ہے کہ تجربی طریق تحقیق نے جس پر جدید یورپ کا صنعتی تمدن قائم ہے ابتداء اسلامی دس کا ہوس میں تنہا یہ تھا، وہ اب اس طریقے کے حامل اسلامی تصور زندگی اور کائنات، انسان کی اصل وراثت وراثت و ذہنی ترک کی جانب اس تصور کے پیر کردہ رویے سے اخذ کیے گئے تھے۔ بعد اسی طریقہ پر یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی جس نے سسٹل پیڑوں پر چڑھایا اور مزید ترقی دی جب کہ اسلامی دنیا میں اس طریقے کے استعمال میں پہلے تو ٹھہر و پھیر ہوا، پھر اسے بالکل ترک کر دیا گیا۔ اس ترک کا سبب یہ تھا کہ بعض داخلی اسباب و عوامل کی بنا پر تین تجارت سے صحیحہ بنیت اور صلیبیت کے حملوں اور سازشوں کے نتیجہ میں اسلامی ملک رفتہ رفتہ اپنے عقیدہ و تصور اور بنیادی طریق کار سے دور ہوتے چلے گئے۔ اودھ یورپ نے ان سے سیکھے ہوئے اس طریق تحقیق اور اس کی اعتقادی اسلامی بنیادوں کا رشتہ منقطع کر دیا۔ یورپ نے کلیسا سے بغاوت کی، کیوں کہ کلیسا خدا کا نام لے کر انسانوں پر ظالمانہ دست درازی کر رہا تھا۔ مگر اس نے کلیسا سے دوری اختیار کرنے کے ساتھ ہی اس طریقہ تحقیق کو بھی اللہ سے اس کا رشتہ کاٹ کر بہت دور کر دیا۔

چنانچہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے جاہلی فکر کے نتائج کی طرح یورپین فکر کے نتائج بھی مجموعی طور پر اسلامی تصور کی بنیادوں سے بالکل مختلف اور جداگانہ مزاج کے حامل ہو گئے۔ اب یہ ضروری ہے کہ مسلمان

صرف اپنے تصور کی بنیادوں کی طرف رجوع کرے، اور اگر وہ ایسا کر سکتا ہو تو خود براہ راست ہدیت الہی سے رہنمائی حاصل کرے، ورنہ کسی متقی مسلمان سے سیکھے جس کی دین داری اور تقویٰ پر اسے اتنا اعتماد ہو کہ وہ اطمینان کے ساتھ اس سے تعلیم حاصل کر سکتا ہو۔

جہاں تک تصور زندگی کی بنیادوں سے تعلق رکھنے والے علوم کا تعلق ہے۔ اسلام علم کو صاحب علم سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔ ان بنیادوں کا اثر اس نقطہ نظر پر پڑتا ہے جس سے انسان کائنات، حیات، انسانی سرگرمیوں، اداروں، قدروں، معیاروں اور عادات و اطوار اور ان امور سے متعلق انسانی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھتا ہے۔ اسلام اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ ایک مسلمان کسی غیر مسلم یا کسی غیر متقی مسلمان سے کیمسٹری، فزکس، آسٹرونومی، طب، اصولی صنعت و زراعت، یا ایڈمنسٹریشن اور حساب و کتاب کی تعلیم حاصل کرے۔ ایسا کرنا بھی اسی حال میں مناسب ہے جب ان کی تعلیم دینے کے لیے تقویٰ شعار مسلمان نہ مل سکیں جیسا کہ آج کل ہے۔ یہ موجودہ صورت حال اس وجہ سے رونما ہوئی ہے کہ ہم اپنے دین اور طبعی کاروبار میں زمین میں اللہ کے اذن سے اس کی نیابت کے منصب اور اس کے تقاضوں سے دور ہو گئے ہیں اور ان ذمہ داریوں کو بھول گئے ہیں جو اس نیابت کی وجہ سے ان علوم و فنون کے سلسلہ میں ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اسلام کبھی اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ہم غیر اسلامی لٹریچر سے، یا دین دار اور تقویٰ شعار مسلمانوں کے علاوہ کسی اور فرد سے اسلامی عقیدہ کے اصول، اسکے تصور زندگی کی بنیادیں، اس کے قرآن کی تفسیر، اس کے نبی کی احادیث اور اس کی سیرت یا اسلام کی تاریخ، اس کے معاشرہ کا طرز زندگی، اس کا نظام حکومت اور طرز سیاست یا آرٹ اور ادب کے سلسلہ میں اس کے اشارات کی تعلیم حاصل کریں۔

جو شخص یہ باتیں لکھ رہا ہے اس نے پورے چالیس سال پڑھنے میں گزارے ہیں۔ اس پورے عرصہ میں اس کا اصل کام یہ رہا ہے کہ انسانی علوم کے اکثر شعبوں کا مطالعہ کرے اور جانے کہ ان میں کیا باتیں مخصوص علم کا درجہ رکھتی ہیں اور کیا باتیں تہذیبی میلانات کی آئینہ دار ہیں۔ پھر اس نے خود اپنے عقیدہ و تصور حیات کے ماتخذ کا مطالعہ کیا تو اس زبردست خزانہ کے سامنے آئے جو کچھ اس نے اب تک پڑھا تھا میچ اور معمولی نظر آیا۔ ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ مگر اس نے اپنی عمر کے چالیس سال جس کام میں صرف کیے اس پر اسے چنداں پشیمانی نہیں کیوں کہ اس نے جاہلیت کو اچھی طرح سمجھ لیا،

اس کی حقیقت جان لی اور جو یہ یار میں یہ کتنے بڑے کتنے شریک تھے، کتنی پسلی ہے۔ اختلاف، امتنا اور پراگندہ خیالی کس حد تک ہی ہوئی ہے۔ نہ سیرت، نہ بارے میں کتنا مغالطہ ہے اور اس کے بندرانگ دعوے کتنے بے بنیاد ہیں۔ یہ ان کی معادوں باریہ میں یقین ہو گیا کہ یہ مسلمان کے لیے علم و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے۔ دونوں مانتے۔ رسول و رخیہ سنتیں۔ ایک ساتھ اختیار کرنا ناممکن ہے۔

یہ بات یہ ہے کہ یہ حقیقت سے نہیں جہل ہے۔ جو کہ مسلمان ہر جہر میں اس کی کو فیصلہ کن بنا کر ہے۔ ان کے شمار بھی۔ بعد از قتل و درسی ہے کہ مسلمان میں اس کی ذرا سے زیادہ بدنام نہیں ہو سکتا۔ اسے اس سے ستم میں نہ بیعتا نہ کے فوج اور اس کے ہی میں نہ ملے بلکہ اس کے رسالہ و بصیرت میں اس ہے۔ ان بیان کا طغیہ یہ ہے کہ وہ خود کو پرچہ رکھنے ہوں وہیں مسئلہ یہ کہ اس میں اختلاف رائے ہو اس میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بنائے ہوئے میں اس میں تہذیب و رہنمائی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

مذہبوں کے مسلمانوں کے مسائل میں جو انصاری کے متبادیے مقصود کے بائیں یہ عمومی اندر میں داتا ہے :

وَقَدْ كُفِرْتُمْ أَهْلُ كُفْرٍ مَّا كُنْتُمْ قَوْمًا بَعْدَ أَنْ بَيْنَا بَيْنَكُمْ
كُفْرًا ۚ خُذُوا مِنْ بَيْنِ أَنْفُسِكُمْ قَوْمًا تَنْتَهِى لَكُمْ
أَخْرَاجَ عَنْكُمْ وَأَصْحَابُكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِأَعْيُنِهِ لَإِنَّ اللَّهَ عَلَى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (المفردہ ۵۱)

”بنا سب میں سے۔ جو یہ پتے ہیں کسی طاعت میں یہ ان سے چھوڑ کر کفر کی طرف
لے آئے ہیں۔ جو یہ میں ان پر ہی ہے۔ ہمارے نفس کے حسرت بنا پر نہایت سے
لیے ان کو ہمیشہ ہے۔ اس کے جواب میں تم خود درگزر سے کام لے یہاں تک کہ اللہ خود ہی
اپنا فیصلہ۔ مذکورہ سے مطمئن رہو کہ اللہ جو چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَذُلَّ النَّصْرَى حَتَّى تَسْتَبِيعَ بِلْتَهُمْ قُلُوبُ إِنَّ
هَدَى اللَّهُ هَوَا الْهُدَى طَائِلِبِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي

جاءَكَ مِنَ الْمُجْرِمِينَ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ ذِي قُرْبَىٰ وَلَا نُصِيبُكَ بِهِ (البقرہ ۱۴)

”یہودی اور عیسائی تم سے ہر گز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلے گے۔
کہہ دو کہ رستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس
چکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، تو اللہ کی کڑی سزا چلنے والوں کی دست و
مردگار تمہارے لیے نہیں ہے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ
يُزِدْكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرًا ه (آل عمران ۱۰۰)

”اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانتی تو
یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔“

جب مسلمانوں کے سلسلہ میں یہ دو نصائح کا آخری مقصود اتنی قطعیت کے ساتھ متعین

ہو گیا تو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کہ ناحق وقت ہوگی کہ وہ اسلامی عقیدہ یا سلامتی پر بہت کتنے
وقت یا مسلم معاشرہ اور اس کی سیاست، معیشت کا جائزہ اپنے وقت کوئی مفید اور حتمی بات
کہہ سکیں گے یا کوئی موزوں رہنمائی کر سکیں گے۔ اللہ سبحانہ کے اس واضح بیان کے بعد بھی جو لوگ
ان کے ارادوں اور گریہوں کے بارے میں کسی خوش گمانی میں مبتلا ہیں وہ صحیح معنی میں غافل لوگ ہیں
ہر خطا سے پاک خدا کے ارشاد ”قُلْ إِن هَدَىٰ اللَّهُ هُوَ الْهُدَىٰ“ سے وہ

واحد ماخذ متعین جو ہوتا ہے جس کی طرف یک مسلمان کو ان تمام مسائل میں رجوع کرنا چاہیے کیونکہ اللہ
کی رہنمائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اور کوئی ہدایت کسی دوسرے ماخذ سے نہیں مل سکتی۔ جیسے
آیت ”قُلْ إِن هَدَىٰ اللَّهُ هُوَ الْهُدَىٰ“ میں اللہ کے ہدایت کا استعمال واضح کرتا ہے۔ اس
نفس کا منشاء، مطلب و انتہی اور کسی دوسری تاویل سے ہلکا ہے۔

اسی طرح قطعی حکم دیا گیا ہے کہ جو آدمی اللہ کی بات سے رازگاری کرے وہ جس کی بات سے
ذہبی زندگی کے معاملات و مسائل تک محدود رہے گا۔ کنارہ کشی لازم ہے۔ یہ بات محسوس ہے
کہ ایسا آدمی ظن کے سوا کچھ بھی نہیں بیان کر سکتا اور مسلمان کہ ظن و گمان کی چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔ یہ کسی
بتا دیا گیا ہے کہ ایسا آدمی صرف دنیوی زندگی کی کشتی یا تہما جانتا ہے اور علم صحیح سے محروم ہے۔

عقیدہ اور دینی فرائض سے۔ لیکن تو آن میں جو علم مادی ہے اور جس کے جاننے والوں کی تعریف کی گئی ہے وہ ایسا علم نہیں جو اپنی ایمانی بنیادوں سے کٹ چکا ہو۔ سائنس و ٹیکنالوجی، فزکس، کیمسٹری، طب اور نوا میں قدرت اور اصولِ صحت سے متعلق علوم اور ایمانی بنیاد کے درمیان بھی ایک رشتہ ہے یہ سارے علوم اللہ کی طرف سے جاتے ہیں بشرطیکہ اہل ایمان انہیں شہادت دے کر کرنے کے لیے استعمال کریں۔ انیسویں صدی یورپ نے اپنی علمی ترقی میں یہی رشتہ اختیار کیا جس کا سبب وہ مخموش کشش ہے جو ہمیں خاص طور پر یورپ کی تاریخ میں ملتی ہے۔ اس کش مکش نے یورپ کے طرز فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اسے ایک مخصوص مزاج کا حامل بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دینی تصور کی بنیاد پر —————
 صرف کلیسیا یا کلیسا کی تصور کی بنیاد پر —————۔ یہ پانچویں صدی یورپ کے پیدائشی ماحول میں علم میں عام ہو گئے خواہ مابعد الطبیعی فلسفہ پر یا نہ بھی۔ مابعد الحقیقات ہوں جن کا بظاہر دینی ماحول بنا ہے کوئی تعلق نہ ہو۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ مغربی فکر کا لازمی علم و معرفت کے تمام پیدائشوں میں اس فکر کے نتائج دینی تصور کی بنیاد پر ہیں۔ یہ حملوں پر نہیں۔ یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ۔ طرز فکر میں اس کے نتائج اسلامی تصور کے خاص طور پر دشمن ہیں کہہ کر یہ بات کا سمجھنا درست رہا ہے۔ نہ وہ اس بات کی دانستہ اور بوجہ پر کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی عقیدہ درست اور اسلامی مفہومات معانی کو فنا کے ساتھ اٹار دیں اور ان بنیادوں کو مٹا دیں جن پر مسلمان معاشرہ کا اقیانوس قائم ہے۔ اس وجہ سے اسلامی مطالعہ و تحقیق میں مغربی طرز تحقیق اور مغرب کے نتائج کو غور سے دیکھنا اور ان کے نتائج کو جاننا ضروری ہے۔ اسی طرح مجتہد سائنس کے مطالعہ میں بھی اس میں ہماری بات موجودہ مغربی ماحول سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اس کی پوری احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ان کے فلسفیانہ پہلو سے پرہیز لازم ہے کیونکہ یہ فلسفیانہ تاثرات بنیادی طور پر دینی تصور، بالخصوص اسلام کے تصور کے دشمن ہیں اور ان کا نتائج بھی خالص اسلام کے چشمہ صافی کو مسومہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔

ذیل میں ہم خاص طور پر ادب اور تاریخ سے بارے میں تفصیلی کتابیں دیں گے اور یہ بات کہ ان کے مطالعہ کا وہ محفوظ طریقہ کیا ہے جو مسلمان بنانے اور مسلمان کے خیمہ کو اس باطنیت کے ثبات سے پاک کرنے کا کام کر سکتا ہے جو آج پوری دنیا میں چھانی ہوئی ہے۔

اسلامی ادب

”ادب زندگی کی وہ تفسیر ہے جو ہمارا جذبہ واداک کرتا ہے۔ یہ اس منبع سے نکلتا ہے جس
ہر کسی مخصوص ہاتھ میں، سارے فلسفے، مذاہب، توحید، اور دوسرے عوامل کے حصار سے گزرتے
مل جاتے ہیں۔“

زندگی سے دور ہے میں یہاں وحدانی تصور کی تسبیح و ترنات کے ساتھ جو یہ مخصوص سائنس
میں اس نے کے سلسلہ میں ادب و تہذیب میں حاصل، افع ہوا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے پاس
یہ ادب ہو جو صدیقی فاضل سے کچھ ہو۔ من سب ہوگا کہ جہاں ہم اسلامی ادب کے مبنیات پر فکرت
تعمیلی کی جاسکتی ہے۔

”وہ سارے فنون، تعلیم و تربیت، ادب بھی ان زندہ قدروں کی ہیں جسے فنکار کا غیر متاثر
ہونا چاہیے۔ انسانی ہونا ہے۔ ہر قدر مختلف اور مختلف حالات اور مختلف زمانہ سے یہ مختلف
ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ بات ہے۔ تصویرت زندگی سے وہ محسوس تصور کی روشنی میں اس دور ہونے والے وہ
رہتے ہیں۔ اس لیے اس قدر کثرت و کثرت اور سائنس کے درمیان بانے جاتے ہیں۔“

ادب، انسانی ہونے کے لیے اس سے کچھ کر کے دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے ہے جن کی
اور ہر وقت برکتی کرے دیا ہے۔ اس سے بہت زیادہ شہس رہتا ہے جو انسان کا احساس
نہ سے کہیں لگتا ہے۔ انہیں اس کا احساس میں دینا ہی چاہیے کہ یہ ان قدر سے کچھ کر کے دیکھ سکیں تو
انہیں وہ محسوس ہوتا ہے۔ انہیں وہ محسوس ہوتا ہے۔ انہیں وہ محسوس ہوتا ہے۔ انہیں وہ محسوس ہوتا ہے۔
اور زندگی کا۔“

اسی لیے اس قدر زندگی کے بارے میں غلط فہمی اور سائنس کی روشنی میں اس دور ہونے والے ان
رشتوں سے جو انسان و کائنات کے درمیان ہیں انسان و کائنات کے درمیان بانے جاتے
ہیں۔ اس لیے کہ ان کے دیکھنے کی کوشش بھی ہے سو رہے۔ یہ بات کہ انسان کو اس کا شعوری احساس ہے کہ نہیں
ہو رہی کہ کوئی محسوس ستارہ درمیان ہے۔ انہیں یہ نہیں۔ لیوننگ پستور یہ حال اس کے داخل میں
ہو رہا ہے۔ انہیں اس کی نظائیں قدروں کی محسوس ہوتا ہے اور وہ تاثرات بھی اس کے رنگ میں رکے

ہوئے ہوتے ہیں جو انسان ان قدروں سے قبول کرتا ہے۔

اسلام زندگی کا ایک مخصوص تصور ہے اور اس تصور سے چند مخصوص قدریں ابھرتی ہیں فطرتی طور پر ان اقدار کی ترجمانی یا فن کار کے داخل پر ان کے اثر کی ترجمانی ایک مخصوص مزاج کی حاسن ہوگی۔ اسلام کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک نظریہ، عقیدہ، فہم، فعال و تخلیقی قوت رکھنے والا عقیدہ ہے جو فرد کے داخل اور اس کی عملی زندگی پر پوری طرح چھا جاتا ہے اور انسان کی تمام عملی و جذباتی قوتوں کو اپنالیتا ہے۔ اس کے بعد کوئی اہسا، غلا، باقی نہیں رہتا جس میں انضباط اور حیرت کو کوئی جگہ مل سکے یا جہاں وہ ناکارہ غور و فکر جاگزیں ہو سکے جس کا نتیجہ بحیرہ تفکیر اور نیکی کی شکلوں کے اوجھڑپیں ہوتا۔ اسلام میں سب سے نمایاں چیز اس کی ہمہ گیر عملی مثبت پسندی ہے جو غور و فکر اور میلانات پر بھی حاوی رہتی ہے۔ اسلام میں ہر غور و فکر انسانی اور کائناتی رشتوں کا ایک ادراک یا اس ادراک کی ایک کوشش ہوتا ہے۔ وہ خالق اور مخلوق یا کائنات کی مختلف اکائیوں کے درمیان پائے جانے والے رشتوں کی تقویت اور استحکام کا باعث بنتا ہے۔ اس کا ہر میلان ایک ہدف کی تہید یا کسی ہدف کے حصول کی کوشش ہوتا ہے خواہ وہ ہدف کتنا ہی بلند ہو۔

اسلام زندگی کو نشوونما اور ترقی دینے کے لیے آیا ہے نہ کہ کسی خاص زمانہ اور خاص مقام پر زندگی عملاً جیسی کچھ ہو اس پر قانع کر دینے کے لیے۔ اسلام کا منشء صرف اتنا ہی نہیں کہ انسانی زندگی میں عملاً جو محسوسات یا موانع یا رجحانات و قیود کسی مخصوص عہد یا مدت طویل میں پائے جاتے ہوں ان کی ایک روئید و پیش کردہ جائے۔

اسلام ہمیشہ زندگی کو ترقی، نشوونما اور نئے انداز خیر کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ انسانی قوتوں کو آزادی بخشتا ہے، اُبھارتا ہے اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی تصور حیات سے ابھرنے والا ادب، یا آرٹ انسانی کمزوریوں کی عکاسی کا، بہت زیادہ اہتمام نہیں کرتا۔ اس کے پیش کرنے میں زیادہ تفصیل سے کام لیتا ہے وہ ان کمزوریوں کو سنبھال جواز عطا کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیا کہ انہیں اس دلیل کی بنا پر پسندیدہ بنا کر پیش کرتے کہ وہ کمزوریاں عوام وجود ہیں لہذا ان کو مہیا کرنے یا ان کے وجود سے انکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسلام اس حقیقت کا منکر نہیں کہ انسانیت میں کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اُسے اس

کے نگار کی۔

اسلامی فکر سے ابھرنے والا ادب یا فن مقصدی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام زندگی کو مسلسل آگے بڑھاتے رہنے کی ایک تحریک ہے۔ وہ کسی مخصوص دور یا کسی خاص لمحہ میں عملاً جو صورت حال ہو اس پر فائدہ ہو جانا نہیں جانتا، نہ وہ صرف اس لیے اس صورت حال کو مستعد بنانا چاہتا ہے یا پسندیدہ بنانا چاہتا ہے کہ وہ عملاً موجود ہے۔ اس کا اصل کام ہی اس عملاً موجود کو بدلتا اور بہتر بنانا ہے۔ اس کا مستقل پیغام یہ ہے کہ زندگی کی تعمیر نو اور تشکیل جدید کا کام ہم آج جاری رہے۔

اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے وہ اس مقصدی ادب اور آرٹ کی طرف جوتاریں دیتا ہے، وہی تعبیر سے بہتر ہے۔ مگر یہ مماثلت عارضی ہے، پھر دونوں کی راہیں بالکل جدا ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ اس فن میں زندگی کو آگے بڑھانے والی قوت کا مدار طبقاتی کشمکش ہے۔ اسلام طبعی کشمکش کو اتنی اہمیت نہیں دیتا کیونکہ انسانی مفاد کے بارے میں اس کا دستور اس سے بہت زیادہ بلند اور وسیع ہے۔ وہ سماجی ظلم کو نہ گوارا کرتا ہے نہ جائز قرار دیتا ہے، اور نہ انسانوں کو اس پر راضی رہنے اور اس سے "لطف اندوز" ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس ظلم کا مفاد بلکہ کرنا اور اس کے ازالہ کی جدوجہد بھی اس کی بلند مساعی میں شامل ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ اپنی انقلابی تحریک کو طبقاتی حسد کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسان کو اوپر اٹھانے اور فوریات کی غلامی سے نجات دلا کر شفقت و عنایت کا مالک بنانے کی خواہش پر اٹھاتا ہے، اس خواہش پر کہ انسان کی بے نظیر انسانیت کو کھانے پینے اور جسمانی ضروریات کی تکمیل میں انہماک کے پھندے سے آزاد کیا جائے۔

اسلامی تصور میں زندگی کو آگے بڑھانے کی تحریک کا مدار ساری انسانیت کو آگے بڑھانے اور اٹھانے، آزاد کرنے اور نئی تخلیقی سرگرمیوں میں لگادینے کے عزم پر ہے۔ اس رہ میں یہ نگاہ مختلف طبقات کے آلام و مصائب اور مشکلات و موانع کے خلاف بھی توجہ کرتا ہے تاکہ ان مشکلات کو رفع کرے اور ان مصیبتوں کا ازالہ کرے۔ وہ انسان کی مصیبتوں کو بھولی چیز نہیں سمجھتا۔ لیکن وہ ان کے ازالہ کے لیے حسد و کینہ کے ذرائع استعمال نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حسد خود ایک زہر ہے جو اکثر انسان کو بلند یوں کی طرف پرواز سے روک دیتی ہے۔

ربا یہ سوال کہ وہ نظریاتی بحثوں اور چند نصائح کے میدان میں نہیں بلکہ عملی زندگی میں

معاذ اللہ! مگر وہ قصہ کس طرح اور کیا بنا ہے تو ہم نے اس موضوع پر دوسری جگہوں پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہاں ہم صرف اس بات پر درج کر رہے ہیں کہ اسلامی ادب یا اسلامی آرٹ مقصدی ادب اور مقصدی آرٹ کے لیے بات ورنہ انسانی تعلقات کی بات اسلامی صدر کے مذاق کا تقاضا ہے۔ وہ مقصدی ہو۔ اس لیے ایک تحفظ میں اس بات پر جو شخصیں تعبیر کی طرف سے ہیں، یہاں "بندہ پروردگار کی طرف سے" ہے۔ مقصدیت سے میری مراد یہ نہیں کہ تاریخ کی مادی تعبیر پر تحقیق رکھنے، جن کی طرف سے مقصد کا براہ راست یا غیر براہ راست اثر ہوگا۔ اس کا یہ نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی تصور یا تہ انسان کے اس لیے ایک نامی کیفیت مطابقت میں ہے کہ انسانی اس سے آرٹ کے لیے ساری چیزیں ہوں گے جو ان کی معنویت یا کسی دوسرے سے ہوتی ہیں ان کے لیے اگر وہ آرٹ سے بالکل مختلف ہوں گے

اسلام فی نفسہ فنون لطیفہ کا دشمن نہیں۔ البتہ وہ ان قدروں اور تصورات میں سے بعض کا مخالف ہے جن کی تہذیبی مومن طعنہ زد کر رہے ہیں۔ وہ ان کی جگہ و خصل کی بنیادیں رکھتے ہیں۔ اس سے تعصبات اور رائے کی قدروں کو ہٹا دیتے ہیں جو اس بات کی بدولت سد حقیقت رکھتے ہیں کہ یہاں یہی تعصبات کا نوکار نہ اظہار کریں، مگر زیادہ تر ان اور بہت سے دوسروں کے ساتھ آرٹ کے لیے مظاہرہ کرتے ہیں جو اسلامی تصور کے ساتھ اس سے جوڑتے ہیں اور اس کی انیسازی خصوصیات کے حامل ہوں۔

اس سے یہ مطلب نہ اٹھایا جائے کہ یہ یوں کہہ لیں کہ یہ بوریپ کا لٹریچر۔ امر ہے۔ ہر طرف منی انتخاب اور حذف ماصدود سے مکمل درود دعوت دے رہے ہیں۔ کیوں کہ اس لٹریچر میں ایسی چیزیں بھی ملیں گی جو اسلامی اسپیٹ سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے ہمیں کہ ان میں فضائل اخلاق کی تعلیم اور رذائل کی مذمت کی گئی ہے، چونکہ اب منہ و خط و ارشاد نہیں، بلکہ اس لیے کہ وہ زندگی کو مادیت سے بلند ہو کر روحانی زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور زندگی کی معنوی قدروں کو تسلیم کرتا ہے۔ اس قسم کا اس اپنی روح کے اعتبار سے اسلامی تصور حیات سے ہم آہنگ ہے، اور سلیقہ کے ساتھ انتخاب سے کام لیتے ہوئے اس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ

تاریخ بھی درحقیقت ادب کی ایک شاخ ہے۔ مگر یہ ایک مخصوص مذاق کی حامل اور خاص

اہمیت کی مالک ہے۔ تاریخ واقعات حیات کی تشریح و تعبیر کا نام ہے۔ اس کا فلسفہ اور زندگی کے بارے میں عمومی تصور سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ ان بنیادوں پر کی ہوئی تعبیر زندگی کے بارے میں ایک ایسا تصور مٹا کرتی ہے جو زندگی اور تاریخ کے رجحان کی بابت اسلامی تصور سے بالکل مختلف ہے۔

مزید برآں چونکہ یہ مؤرخین زیادہ تر یورپین رہے ہیں لہذا انھوں نے عالمی تاریخ کا محور یورپ کو قرار دے رکھا ہے۔ اگر ہم مغرب کے غرور نفس اور خود پسندی سے چشم پوشی کرتیں تو انسان کی فطری کمزوری کے پیش نظر انھیں ایسا کرنے میں معذور سمجھیں گے۔ اس روح کی حامل اور ایسا طریق اختیار کرنے والی تاریخ کے مطالعہ کے نتیجہ میں ہماری نوخیز نسلیں دو غلط نظریات لے کر آگے بڑھتی ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ رفتار زمانہ اور تاریخ پر روحانی عوامل کا ذرا بھی اثر نہیں پڑتا، یا اگر پڑتا ہے تو بہت کم اور نحیف۔

دوسرا یہ کہ زمانہ کو آگے بڑھانا اور اس کا رخ متعین کرنا صرف یورپ کا کام ہے جو اسلام کو اس میں بہت حقیر اور معمولی سا دخل ہے۔

ان دونوں تصورات کا اثر انتہائی خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔ حیات، کائنات اور طرز زندگی کے بارے میں ایک ہمہ گیر تصور کی تخلیق پر بھی یورپ کے بارحانہ اقدام کے با متقابل اسلامی عزت و رتبہ کے شعور پر بھی۔

اپنی نوخیز نسلوں کے ذہن کو اس خطرہ سے بچانے کے لیے ذیل کے دو اقدامات ناگزیر ہیں۔ پہلا کام یہ ہے کہ ہم سارے عالم کی تاریخ، واقعات و حوادث کی تعبیر کو اسلامی نقطہ نظر سے مرتب کرنا شروع کر دیں۔ تاکہ یہ عظیم کام صرف یورپین طرز فکر و نظر کا اجارہ ہو کر نہ رہ جائے۔ اس تاریخ میں ہمیں یورپ کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا ہوگا اور اسے مبالغہ آمیز اہمیت نہ دیتے ہوئے تاریخ کی حرکت میں عام طور پر ماری انسانیت نے اور نہ اس طور پر اسلام نے جو حصہ لیا ہے اسے نمایاں کر کے سامنے لانا ہوگا۔

اسلامی تاریخ کی تدوین جدید

تاریخ و افعال کا نہیں بیان، افعال کی تعبیر نہ ہے۔ اس کا کام سنّ نبوی یا طاب رستوں کی دریافت ہے جو ان محنت و قیامت کا بہرہ ہو چکا ہے کہ ایک ہی سلسلہ کی ٹریوں میں تبدیلیاں کرائی گئی ہیں۔ اس سلسلہ کے مختلف جزاء ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں اور ان پر ردائے ہیں، اور یہ کہ۔ اور حال کی تبدیلی کے ساتھ تو ساری عینیت و درجہ جتنے ہیں ان سے اس زمانہ و مکان میں کوئی جسم نامی ستونہ نہ لے سکتا ہے۔

کسی، نفع کو سمجھنے، اس کی تعبیر کرنے اور اس سے اس کے، قبل اور بعد ہونے والے افعال سے بہرہ کر کے دیکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی بہت حد تک رکھتا ہو کہ انسان کے عقل کی تمام روحانی، فکری اور حیاتیاتی اقدار در تشکیل قوتوں کا حصہ کر سکے اور انسانی زندگی میں کارفرما معنوی اور مادی تشکیل قوتوں کا سمجھ سکے۔ اس میں یہ مصدقیت ہونی چاہیے کہ انسانی زندگی میں حصول اور اساسات کے دروازے دھندلے کے قریب کے لیے کھول دے۔ اس کا شعور اس دھندلے سے جو انسانی حواس کو بنا رہا ان میں سے کس کو روک کرنے سے پہلے اسے کافی چہان ہیں اور حقیقت سے کام لینا چاہیے۔

اسلامی تاریخ کو بالکل نئے انداز سے دیکھنا اور انسانی زندگی پر دوبارہ متب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی زندگی کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے در بالکل نئی روشنی میں دیکھنا چاہیے تاکہ اس کے تمام راز کھل سکیں۔ اس کے جملہ نوازل و حقائق کو سمجھیں اور وہ اپنی تمام تر اور تشکیل قوتوں سمیت واضح ہو سکے۔

اس انداز و منظر میں تو انہیں ہمیت ساری آئندہ دینی چاہیے کہ تمام کی تفصیلات میں حاصل ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ محقق اپنی عقل و ذہن اور احساسات کو اس فضا سے پوری طور پر مانوس کرے اور اسی میں سانس لینے لگے جو سلام ایک عقیدہ، ایک ذہن، ایک نظریہ اور نظام زندگی کی حیثیت سے رکھتا ہے، اور جو فضا اس اسلامی زندگی کی ہے جو عالم واقعہ میں انسانی زندگی کا ایک باب ہے۔ محقق کا اس فضا میں جا بسنا اس کے فہم و ادراک کے تمام دریچے کھول دینے کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اس زندگی کو نہ صرف سمجھ سکے بلکہ اس کی زندگی بستی کا درک کر سکے اور مختلف حوادث و واقعات کو اس ہستی میں جو مقام حاصل ہے اسے پوری طور پر سمجھ سکے۔

کسی محقق کے لیے انسانی زندگی کے کسی دور کا گہرا اور حقیقی فہم حاصل کرنے کے لیے گزیرہ ہے کہ وہ اپنی پوری شخصیت کو اس کے سپرد کر دے، اس کی فضا میں جا بیسے، اس کے اشارہ کو سمجھے اور ہر اثر کو قبول کرے۔ یہ شرط اسلامی زندگی کے مطالعہ کے ساتھ مخصوص نہیں لیکن اسلامی زندگی کے سلسلہ میں یہ ضرورت زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ اس زندگی کی تشکیلی قوتیں اپنی نوعیت اور باہتیت کے اعتبار سے دورِ جدید کی تشکیلی قوتوں سے بالکل مختلف واقع ہوئی ہیں۔

ہمارے نزدیک اسلامی زندگی کا مکمل مطالعہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ اسلامی عقیدہ اور الوہیت، حیات، کائنات اور انسان کی بابت اسلامی تصور کے مزاج کا صحیح شعور نہ حاصل ہو جائے۔ جب تک یہ بات نہ سمجھ لی جائے کہ اس عقیدہ کا ردِ عمل قلبِ مومن پر کیا ہوتا ہے اور اس کے زیرِ اثر ایک مسلمان زندگی کے مختلف عوامل کے جواب میں کیا روشیں اختیار کرتا ہے۔ یہ خصوصیات نہ صرف کسی ایسے مسلمان محقق کے اندر پائی جاسکتی ہیں جو اسلامی تحریک کا علمبردار بھی ہو۔ اسلامی تاریخ کی تدوینِ جدید میں یہ خصوصیات پوری طرح موجود ہونی چاہئیں۔

اس بات کا پتہ لگانا چاہیے کہ تاریخِ حیات کے اس اسلامی دور میں لوگوں کی سرگرمیوں کے اصل محرکات کیا تھے۔ اور ان محرکات کا ان واقعات، انقلابات اور تغیرات سے کیا رشتہ تھا جو اس دور میں رونما ہوئے۔ یہ چیزیں لازماً اسلامی تصور کے مزاج سے مربوط نظر آئیں گی۔ اسلام میں جو انقلابی روح اُس کی خارجی اور عملی زندگی ہی میں نہیں بلکہ انفرادی، اجتماعی اور کائناتی تعلق کے اندر بھی پائی جاتی ہے، اُن سے بھی ان کا ربط ہوگا۔ اسلام نے نظامِ حکومت، طرزِ معیشت، قانون سازی کے طریقوں اور قانون کو نافذ کرنے کے ذرائع وغیرہ کے باب میں جو نقشے پیش کیے ہیں اُن سے بھی یہ واقعات و تغیرات مربوط ہوں گے۔ یہ ساری چیزیں زندگی کی لہذا اس مخصوص زندگی کی تاریخ بنانے میں حصہ لیتی ہیں۔

جنگیں، سیاسی معاہدے، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ جن کو تاریخِ دوسرے امور

سے زیادہ اہمیت دینی ہے۔ اس سے پہلے اس کے تاریخ میں جو تاریخ مرتب کرتے وقت نمایاں کرنا ضروری ہے، فلسفے کے، میناں، متکلفات، انہیں، اس کے درک، اس کے ترقی کا مرحلہ ملنے میں ہوتا ہے۔ اس میں فلسفہ کی میناں سے، یہ ثابت ہے جو اس کے طرز فکر یعنی زندگی کے بارے میں اس کے زمانہ کی نظر پر غالب ہوتا ہے۔ اس کے محقق کو اسلامی زندگی کے مطالعہ میں ایک تیز ذہنی استعداد سے ملتا ہے۔ یہ نیک زندگی کے بارے میں اس کا زیادہ بڑا بڑا تاریخ کے مطالعہ پر اثر مرتب ہوتا ہے۔ اس میں اس کی ایک گونا گونا نسبت رہتا ہے۔ اس کی گونا گوں میں اترنے، اس کے اندر نمایاں ہے۔ اس کا صحیح تاثر قبول کرنے کی صورت وہ اس سے زیادہ رکھتا ہے۔

عقیدہ سدری کے مابین اور اس تاثر کے فہم کی نشانی میں جو مسلمان اس سے قبول کرتے ہیں، محقق تاریخ کے اس مخصوص دور میں اسلامی زندگی کے محکات، اس میں مضمر نسبی قدروں اور مختلف مراحل پر اس کی فتنہ و شست کے سبب کا صحیح اندازہ لگا سکے گا اور تصور کر سکے گا کہ سدری کے اولین کہوارہ میں اور ان ملکوں میں ہیں وہ بعد کو جیلان، انسانی گرد و جوس کی نظامی اور باطنی زندگی کیسے رہی ہوگی، پھر وہ نظامی پہلوؤں پر اس کے حدودہ کے مغربی مؤرخین کو کچھ نظر نہیں آتا۔ ان دو ممالک پہلوؤں کا اضافہ کر کے کاتبین اسلام حقیقت، نفع کا ایک جزو شمار کرتا ہے۔ وہ یہ دریافت کر سکے گا کہ اس پہلوئے زمانہ کی رفتار متعین کرنے اور مختلف زمان و مکان میں زندگی کی تشکیل میں کیا حصہ لیا ہے۔

اسلامی تاریخ کو انسانی تاریخ سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ کیونکہ اسلامی زندگی انسانی زندگی کے ایک مخصوص دور کا نام ہے۔ مسلمان مخصوص زمان و مکان میں رہنے والے انسان تھے اور اسلام زمان و مکان کی قیود سے آزاد ایک آفاقی اور انسانی پیغام ہے۔ اس دور کی تاریخ پر بلاشبہ اس بات کا اثر پڑا ہے کہ اسلام کو جاہلیت کا مقابلہ کرنا پڑا اور اس وقت جو عوامل کار فرما تھے ان سے عہدہ برآ ہونا پڑا۔ پھر اسلام نے خود بھی انسانی تجربات میں حصہ لے کر ان کو متاثر کیا خاص کر ان علاقوں میں جہاں اس کے قدم پہنچے یا جن کے قریب جا پہنچا تھا۔ ہذا ضروری ہے کہ اسلامی تاریخ مرتب کرتے وقت یہ بھی بتایا جائے کہ ظہور اسلام سے قبل انسانی تجربات کہاں تک پہنچے تھے۔

دنیا کے مختلف انسانی معاشروں کی حالت کیا تھی؟ خاص طور پر دینی عقیدوں سے وابستہ افکار و نظریات کیا تھے۔ مختلف معاشروں کے نظام حکومت، 'نقدِ دینیت'، جماعتی رشتے اور خدق و عادت سامنے آنے چاہئیں۔ ان امور کی روشنی میں یہ واضح ہو سکے گا کہ اسلام سے تاریخ میں جو عمل کام دیا اس کی نوعیت اور اصلیت کیا تھی۔ دنیا پر اس نئے نظام کے قبول کرنے یا ٹھکرانے کا رد عمل کیوں مرتب ہوا۔ کش مکش کے اسباب کیا تھے۔ اور فتح و شکست کن عوامل کی بنا پر ہوئی۔ ان چیزوں کے پس منظر میں یہ واضح ہو سکے گا کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ عمل و ردِ عمل، تائید و ردِ تائید اور تعاون اور کش مکش کا سلسلہ کس طرح جاری رہا۔

اگر اس دور کے عامی حوالہ کا بیان ضروری ہے تو جزیرہ عرب کے احوال سامنے لانا، عرب کے تصورِ حیات کے ہر پہلو کی وضاحت اس سے زیادہ ضروری ہے۔ عرب اسلام کا وہ گہوارہ تھا۔ پھر وہ اس کی فوٹو کا مرکز رہا۔ اور اس مرکز سے اسلام دوسرے ملکوں میں پھیلا۔

کیا یہ ایک اتفاقی و غلطیہ رسواں دین کوئے کر زمین کے اس مخصوص علاقہ میں ایک خاص زمانہ میں حادثہ ہوا یا ایسا شروع ہی سے ایک منصوبے کے تحت ایک خاص ارادے کے ساتھ اور ایک باقی سادہ سکیم کے مطابق ہوا؟ تاکہ یہ سارے عوامل جس طرح یکجا ہوئے اس طرح کی جو کڑی تاریخ ساز میں ایک خاص حصہ اور کریں جس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کا نئے صفحہ قریباً اس پر بھی اور انسانی ذہنوں میں بھی اس طرح مرتب ہوا جیسا کہ بعد میں بتائیے جائے گا۔

یہ بات ہمیں تاریخ کے اس زوے سے بھی خود محمد رسول اللہ کی شخصیت کے مطالعہ کی طرف سے جاتی ہے۔ اصلی اللہ علیہ وسلم، غالباً آپ کی شخصیت حسب نسب و ماحول اور اس معاشرے کی روایات میں ورنہ عوام میں جو بحیثیت یک فرد کے آپ کے گرد کام کر رہے تھے جیسے ہی ایک مقصد کے تحت سارا گامی پیدا ہو جاتا۔ یہ محض اتفاق نہ ہو کہ سارے انسانوں کے درمیان آپ کو شہادۂ باپ ورتا پے نے ہو کر ایک غصیدہ آفاقی موقف اختیار کیا۔ اس کی بنیاد ماضی میں ملتی ہے۔ مستقبل میں مل سکے گی۔ قبل اس کے کہ اس غصیدہ و فتنے کی شہادت سے اسے غلط بات و خود کا صحاح کیا جائے یہیں خود اس واقعہ کی خوبت کا دور میں کھلی آستور کا منہ نہ مارا ہوگا جس کا یہ

زور دے پوری تصویر سامنے رکھتے ہیں۔ مذکورہ بار غیر تحقیق اختیار کرنے کے بعد تاریخی حقائق
 ہیں۔ تاریخی اسلامی کے اس پہلے مرحلہ کو ”اسلام عہد رسالت میں“ کا نام دینا زیادہ مؤثر ہے۔
 اس مرحلے کے بعد دوسرا دور آتا ہے جسے ”اسلام کے پھیلاؤ کا مرحلہ کہنا چاہیے۔ وہ دور
 ہے جس میں اسلام مشرق و مغرب ہر طرف پھیل گیا۔ وہ انوکھا فیض ہر طرف عام ہو گیا۔ جس کی قوت
 و شہرت فیضان کی دنیا میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ یہ بات صرف فوجی فتوحات پر صدق نہیں
 آتی۔ بلکہ روحانی، فکری اور سماجی اثرات کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ ساری انسانیت نے یہ دیکھ
 لیا کہ اس نئے دین کے ظہور و راسخ کے حیرت انگیز پھیلاؤ کے نتیجے میں تاریخ کا رخ بالکل بدلا گیا۔
 ہمارے تجویز کردہ سبق مطالعہ کی اصل قدر و قیمت اسی سیاق میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس
 ذریعہ پر ممکن ہو جاتا ہے کہ ہم ان تعمیری اور ترقیاتی کاموں کا مطالعہ کر سکیں جو اسلام نے اپنے رشتہ
 آخانے و سب سے وسیع خطہ زمین میں انجام دیئے۔ ہم یہ دریافت کر سکیں گے کہ زمین کے ان زریعہ ترین
 عذروں اور مسلمانوں کے سب سے زیادہ ممتاز ملکوں میں جو افکار و عقائد چھائے ہوئے تھے۔
 جو اجتماعی نظام قائم تھے، جو معاشی حالات پائے جاتے تھے، ماضی کی تاریخ نے ان کو جو ورثے
 دیئے تھے۔ وہ جن انسانی رشتوں میں مربوط تھے ان کے اور اسلام کے درمیان تاثر و تاثر کا کس
 عمل انجام پایا۔

اسلام کا پھیلاؤ ان ہی حدود تک محدود نہیں رہا۔ جہاں تک اس کی فوجی فتوحات پہنچ سکیں
 بلکہ اس کی بنائی ہوئی تہذیب اور فکری تحریک اسلامی دنیا کے باہر بھی پہنچی۔ اسلامی مملکت کے باہر اسلام
 کے پھیلاؤ کے اثرات کی تحقیق بہت اہم ہے۔ ہمیں یہ دریافت کرنا ہو گا کہ ان اثرات نے جو ابا خود
 عالم اسلامی کی زندگی کو کس طرح متاثر کیا۔ دنیائے اسلام سے اخذ بھی کیا ہے اور اسے کچھ دیا بھی ہے۔
 اس سے متاثر بھی ہوئی ہے اور اس پر اثر انداز بھی ہوئی ہے۔ ہمارے تجویز کردہ طریقہ پر اس تاثر و تاثر
 کا مطالعہ ایک ایسی تاریخ کی ترتیب عمل میں لائے گا جو اب تک مرتب نہیں کی جاسکی ہے۔ اس تاریخ میں
 ایک خاص جان ہوگی۔ اس کا ایک مخصوص مزاج ہو گا۔ اس کے ذریعہ انسانی دہانوں اور اس کی زندگی
 کے مراحل کی ایک نئی تصویر سامنے آئے گی جو اس تصویر سے مختلف ہوگی جسے اہل تاریخ پیش کرتے
 رہتے ہیں اور جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

ابنم

دور ہے پر

دور ہے پر

اب سوال یہ ہے کہ ہم کدھر جائیں؟

ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر ہمیں خود سے اس سوال کا جواب حاصل کر لینا چاہیے اور اپنی زندگی کو اس بہت میں لے جانا چاہیے جدھر ہم چاہتے ہوں۔

بلکہ بعد دیگرے دو جنگوں کے بعد آج دنیا دو مستقل بلاکوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ مشرق میں اشتراکیت کی بلاک اور مغرب میں سرمایہ دارانہ بلاک۔ ہر صورت حال یہی ہے۔ یہ نہایت بڑی بات ہے اور یہ ذہن پر بھی نقش مرتب ہو چکا ہے۔ مگر میں رے نزدیک یہ تقسیم بالکل ظاہری اور سطحی ہے حقیقی نہیں۔ یہ تقسیم مفادات پر مبنی ہے نہ کہ اصولوں پر۔ یہ سامان تجارت اور بانڈوں کے بیٹے جنگ سے نہ کہ عقائد و مفادات کی۔ یہ جنگ کے اعتبار سے امریکہ اور یورپ کا حصہ نہ کہ روس کا حصہ ہے۔ روس بھی تقسیم نہیں۔ دونوں زندگی کے مادی نقطہ نظر پر ایمان رکھتے ہیں۔ روس اشتراکیت ہو چکا ہے۔ مگر یورپ اور امریکہ بھی اس راہ پر جا رہے ہیں۔ یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اگر کوئی خاص بڑا بڑا مہم جو وہ بھی اس مہم پر پہنچیں گے۔

آج مغرب پر جو مادی و مادی فکر چھایا ہوا ہے وہ احمق کی بنا منفعیت کو قرار دے رہا ہے اور مفادات اور تجارتی باروں کے بیٹے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا سکھنا ہے۔ یہ فکر زندگی سے روحانی فائدہ کو بے دخل کر دیتا ہے۔ اور تجربہ کاروں میں نہ دریافت کیے جا سکتے وائے ایمان کا منکر ہے۔ یہ مجتہد اعلیٰ و خاتمہ کا قائل

نہیں اور فلسفہ عملیت کی طرح اشیاء کی حقیقت کا وجود نہیں تسلیم کرتا۔ صرف ان کے عملی و فائدہ

رکھ کر محض یہ انداز فکر ہی مائری مادیت کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔

روس اور امریکہ کے فکری بونی مزاجی فرق میں ذوق صرف ان کے معاشی اور سماجی حالات ہیں۔ آج جو یہ ملک عدم ملکی کا نسہ کی ہونے سے باز رکھتی ہے۔ وہ کوئی بس نظریہ حدت نہیں جو حیات کا نشانہ اور سماج کی مادی حسیہ و حسیہ قدر و دنیا ہو۔ بلکہ یہ بات ہے کہ اس کے سامنے مادہ رشتہ کی موقیع نہیں ہو سکتا۔ اور دور کی انسانیت کا شعاع بھی اوپنی ہے۔

اس مسئلہ اور امریکہ کے درمیان اس کمشن کی نسبت سے ہمیں دیکھنے میں مدد ہو جائے گی۔ روس کی مادی نظریات کے حامل ہیں۔ اور یکساں فکری مزاج رکھتے ہیں۔ ان کی اس کمشن میں انہوں نے نظریہ پر میں بلکہ اصل جنگ دنیا میں غور و بار کے سامنے کے پٹے ہے۔ اور وہ مادہ خودم ہیں۔

حقیقی اور گہری اس کمشن صرف اسلام اور ان دونوں بلاکوں کے درمیان ہے۔ یورپ امریکہ میں اور روس جس مادی فکر پر ایمان رکھتے ہیں اس کے مقابلے پر تے دن واحد حقیقی قوت اسلام ہے۔ اسلام ہی کائنات حیات اور انسان کے سامنے میں ایک ہم گیر اور ہم رنگ فکر کا حامل ہے۔ وہ انسانی معاشرے میں کش مکش و نزاع کی جگہ تکافل کی فضا پیدا کرتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک روحانی تصور رکھتا ہے جو سے آسمان پر فروکش فائن سے جا ملتا ہے اور ساتھ ہی زمین پر اس کے رجحانات کی تعبیر کرتا ہے۔ یہ تصور زندگی کو صرف مادی و ماضی کی تکمیل کی مشین بنا کر نہیں رکھ دیتا۔ اگرچہ پیداواری سرگرمیاں اسلام کی علامت میں سے ایک علامت تسلیم کی گئی ہیں۔

در حقیقت نہ روحانی مذہب جس میں مسیحیت پیش چلتی ہے۔ امریکہ اور یورپ کی مادیت کو بھی اس طرح مائل سمجھتے ہیں جس طرح روس کی مشرقی مادیت کو کیونکہ دونوں کا مزاج یک ہے اور زندگی کے روحانی تصور کے منافی ہے۔ لیکن یہ حیا ہے کہ مسیحیت کو یہی نسبت قوت شمار نہیں کیا جاتا جو جدید مادی افکار کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ مسیحیت ایک انفرادی گوشہ گیر اور سلبی مذہب بن چکی ہے۔ اس کے زیر سایہ زندگی کو دائمی اور فعال نشوونما نہیں نصیب ہو سکتا۔ پشتاپشت سے وہ عملی زندگی کا ساتھ دینے اور اس پر حکمرانی کرنے سے فائدہ رہی ہے۔ کیونکہ کلیسا و مقدس کانفرنسوں نے اسے جو شکل دے دی ہے اس شکل میں وہ زندگی کے عملی تناظروں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

لہٰذا کسی حبیب کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مسیحیت اپنی اس شکل میں حواس باآخروں سے دی گئی ہے۔

سہر آن متغیر معاشی اور سماجی نظاموں کے قدم بہ قدم نہیں چل سکتی۔ کیونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ عمل زندگی کے بارے میں کوئی جامع نظریہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایک کامل آفاقی نظام ہے جس میں عقیدہ بھی ہے۔ اور قانون بھی۔ وہ سماجی و معاشی زندگی کی تنظیم ضمیمہ اور قانون دونوں کے ذریعہ عمل میں لاتا ہے۔ اس کا یہ نظام جزئیات و رسموں کی تطبیق میں نشوونما کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ — وہ انسانیت کو کائنات و حیات کے بارے میں ایک جامع ہمہ گیر اور مکمل فکر عطا کرتا ہے۔ اور معاشرہ کو ایک عملی اور حقیقت پسند نظام اور ایک ایسی تعمیلی شریعت دیتا ہے جو معاشرہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق نئے فروعی احکام پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

اسلام اپنے نظام کی بنیاد ایک ایسے جامع تصور زندگی پر رکھتا ہے جو مادی طرز فکر کی یکسر نفی کر دیتا ہے۔ وہ عمل کی بنیاد روحانی اور اخلاقی عنصر پر رکھتا ہے اور فوری منفعت کے نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس طرح وہ بیک وقت مشرقی اور مغربی دونوں بلاکوں میں چھائی ہوئی مادی عقلیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ وہ زندگی کو ان پست مقامات کی غلامی سے نکال کر آج جن کو یورپ، امریکہ اور روس سب یکساں طور پر اپنا آئیڈیل بناتے ہیں۔ بلند مقامات کی طرف لے جاتا ہے۔

اس سرسری جائزہ سے واضح ہے کہ مستقبل میں حقیقی نکر او سرمایہ داری اور اشتراکیت یا مشرقی اور مغربی بلاکوں کے درمیان نہیں بلکہ دنیا برہمیائی ہوئی، غربت اور اسلام کے درمیان ہوگا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ معنی خیز اور درست ہوگا کہ یہ کشمکش بندگی کو صرف اللہ کا حق قرار دے کر انسانوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف اللہ کا بندہ بنانے والے نظام اور ان سارے انسانی نظاموں کے درمیان ہوگی جو بندوں کی بندگی کس نے پر مبنی ہیں۔ مشرقی اور مغربی دونوں بلاک اس حقیقت سے آگاہ ہیں اور اپنے باہمی اختلافات اور آویزشوں کے باوجود دونوں مل کر ہر جگہ احیاء اسلام کی تحریکوں کو کچلنے اور اسلام پر ہر طرف سے حملے کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ بات اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کو خوب اپنی طرف سے سمجھ لینی چاہیئے۔ تاکہ وہ مختلف بلاکوں اور نظامائے زندگی کے درمیان ظاہری کشمکش سے دھوکہ نہ کھائیں۔ اسلام ہی وہ حقیقی قوت ہے جسے دونوں بلاک اہمیت دیتے ہیں، اہل اسلام کو اس حقیقت کے شعور کے ساتھ اپنا طریق کار سٹے کرنے کی ضرورت ہے۔

آج احیاء اسلام کی تحریکیں ایک دور اسے پرکھ رہی ہیں۔ صحیح راستہ پر صحیح قدم اٹھنے کا انحصار

اس بات پر ہے کہ یہ بنیادی شرط واضح ہو جائے کہ اسلام موجود ہے یا نہیں موجود ہے۔ ان تحریکوں کو یہ مان لینا چاہیے کہ آج اسلام کا وجود موقوف ہو چکا ہے اور اس حقیقت سے آنا غافل نہ ہونا چاہیے کہ اسے دیکھنے اور تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ ان تحریکوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا مقصد اسلام کو از سر نو وجود میں لانا ہے۔ یہاں کہنا زیادہ درست ہو گا کہ اسلام کا وجود عارضی طور پر موقوف ہو گیا ہے اور اُسے دوبارہ وجود میں لانا مقصود ہے۔

ایک راہ یہ ہے اور دوسری راہ یہ ہے کہ — ایک لمحہ کے لیے بھی — یہ تحریکیں یہ سمجھ بیٹھیں کہ اسلام قائم ہے اور وہ لوگ جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اور مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں مثلاً بھی مسلمان ہیں۔ نیز یہ کہ ساری دنیا میں جو سیکولر طریقے رائج ہیں، مثلاً انا ترک کھانا کھا کر وہ نظام یا اسی طرح کے دوسرے نظام، وہی اسلامی طور طریقے بھی ہیں۔ جیسا کہ ولفرڈ کینٹوبل اسمتہ اور اُن جیسے دوسرے لوگ اور اُن سے فریب کھانے والے اور ان کی طرح فریب دینے والے افراد عوام کو باؤ کرانا چاہتے ہیں۔

ایک راستہ یہ ہے اور ایک راستہ وہ ہے اور احباب اسلام کی تحریکیں آج اسی دورِ اچھے پر کھڑی ہیں۔ اگر وہ پہلے راستہ پر قدم بڑھاتی ہیں، تو اللہ کی اور ہدایت الہی کی راہ پر آگے بڑھیں گی۔ اور یہ سمجھ کر آگے بڑھیں گی کہ آج خود اسلام کا وجود موقوف ہے۔ اور انہیں بعینہ آج وہی کام کرنا ہے جو محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم اور پہلی مسلمان جماعت کے پیش نظر تھا۔ انہیں جان لینا ہو گا کہ انہیں بھی اسی طرح کا ظلم و ستم سہنا پڑے گا۔ جس طرح اللہ کے رسولؐ اور ان کے صحابہؓ پر کیا گیا تھا۔ ان ہی کی طرح صبر و استقلال سے کام لینا ہو گا۔ پھر اسی طرح اللہ کی نصرت و تائید حاصل ہوگی اور بالآخر زمین پر غلبہ نصیب ہوگا۔

اگر وہ اس دوسری راہ پر چلتے ہیں جو مشرولفرڈ کینٹوبل اسمتہ، ان سے فریب کھانے والے اور ان کی طرح فریب دینے والے دکھلا رہے ہیں تو وہ ایک سرابِ محض کے پیچھے دوڑیں گے۔ اس سراب میں دُور سے چند عمامے ضرور نظر آئیں گے جو بانوں کو ان کے اصل منشاء سے پھیرنے اور آیات الہی کو ٹھوڑے دلوں سے پیچھے ہوں گے۔ یہ لوگ مسجدِ نزار جیسے مراکز قائم کر کے اُن پر اسلام کا جھنڈا بلند کریں گے اور فسق و فجور کے اڈوں پر اسلامی پرچم لہرائیں گے۔

آج اسلام کی سر بلندی چاہنے والی تحریکیں زمین کے کونے کونے میں پھیل چکی ہیں۔ صلیبیت اور صیہونیت

نے ان تحریکوں کو مٹانے کے لیے جو حالات پیدا کر رکھے ہیں اور جو ادارے قائم کر سکے ہیں ان کے علی الرغم یہ تحریکیں آج یورپ اور امریکہ میں صلیبیت کو اس کے مراکز میں چیلنج کر رہی ہیں، اور ایشیا اور افریقہ میں قبول عام حاصل کر رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تحریکیں پُر فریب سراب کے پیچھے جا پڑیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صحیح راہ اختیار کریں۔ اللہ عزوجل سے امید ہے اور ہم اس کے لیے دست بدعا ہیں کہ آنکھوں کو حقیقت واقعہ کے دیکھنے اور دلوں کو حق بات سمجھنے کی توفیق دے۔ اللہ ہی راہ دکھانے والا اور توفیق دینے والا ہے اور وہی ہمارا مددگار ہے۔

محمد زبیر حسن البنا

مؤلفہ: بی بی
سلام نعیم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ انقلابی نقطہ نظر سے، جس میں حضور کی اعلیٰ درجہ کی قائدانہ صلاحیت ○ خداداد سیاسی بصیرت ○ حکیمانہ تشریع و اصلاحات اعلیٰ ترین روایات، عدل و انصاف کا دلاویز اور پاکیزہ عکس پیش کیا گیا ہے ○ سیرت محمدیؐ کے مستند واقعات ایک نئے انداز میں۔ اردو میں ایک منفرد کتاب۔ حصہ اول و دوم یکجا جلد میں۔

قیمت: ۲۳/۵۰ روپے

مرکزی کتب خانہ اسلامیہ
دہلی

LIBRARY
JAMIA HAMDARD



U43467



دین میں امت صالح کس طرح قائم کی جاسکتی ہے • معاملات دنیا میں زمام کار کی اہمیت • اسلامی اخلاق کی خصوصیات اور اس کے اثرات ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی مفصل تشریح • دین کا حقیقی اور گہرا شعور بخشنے کے لیے بے مثال کتاب۔

عبادات کے جاہلی اور اسلامی تصورات کا فرق • اسلام میں عبادت کا حقیقی مقام • اسلام کا فلسفہ عبادت نماز کی حقیقت اور اس کے زندگی پر اثرات • روزہ کی اہمیت اور اسلامی زندگی میں مقام • دین سے آگہی اور اس کا شعور حاصل کرنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب۔

معروف و منکر

امت مسلمہ کا مقصد زندگی کیا ہے؟ • امت مسلمہ کا حقیقی مقام کیا ہے؟ فریضہ بالمعروف نہی عن المنکر کی اہمیت • اس فریضہ کو ادا کرنے کے نقصانات • ایک انقلا ب آزیں مالائہ پیش کش۔

تحرک اسلامی کی بنیادیں